2313. N/A

Title - MUKAMMAL SHIREH DEEWAN GHALIB.

Author - Mirza Asad ullah Khan Ghalib; Murattibe Abdul Baari Aasi.

Pub - Manager Scdoliy Book Dipo (Lucknow).

Date - N.A.

Pgs - 470.

Subjects - Urdu Adab - Shayari - Majmua Kalaam - Shireh Shireh Deewan Ghalib.

مکتبۂ معین الادب لاہور

[illegible]

آرسی عبدالباری

[illegible]

[illegible]

مکمل شرح دیوانِ غالب از عبد الباری آسی

نہیں ہے۔ جیسا کہ آتش تمہارے کہتے ہیں کہ

دریا سے حباب کی نفی ہے پیدا تو اور نہیں میں اور نہیں

بلجاؤں گا تجھ میں بعد فنا تو آ در نہیں میں اور نہیں

حباب و دریا کا ایک ہی طرہ ہوتا ہے ہوا ایک نیا تماشہ دکھا دیتی ہے اور بادی النظر میں اُس کی یہ واسطہ ہوجاتی ہے۔

مولوی علی حیدر صاحب نظم نے اس شعر پر بہت کچھ لکھکر المعنی فی بطن الشاعر کا الزام لگایا ہے جو صحیح نہیں ہے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں ہے نہ یہ واقعہ پایۂ ثبوت کو پہونچتا ہے کہ غالب کے منہ پر کسی نے اس شعر کو بے معنی کہا تھا۔ اور اگر ایسا ہوا تو بھی غلط خیال ہے فریادی کے کاغذی کپڑے ایک رسم ضرور تھی اگرچہ آج نہیں جیسا کہ اُستاد کہتا ہے۔

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگہ آمد
زادۂ خاطرِ من تا بدہی داد مرا

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

کاوکاو۔ زخم کو نوچنا۔ اور کھودنا۔ یہاں مراد ہے تکلیف اور محنت سے یعنی محنت اور تکالیف شب ہائے تنہائی کو کچھ نہ پوچھو کہ شام کی صبح کرنا اتنا دشوار ہے جیسے فرہاد کے لیے جوئے شیر کا نکالنا تھا ... تشبیہ دی ہے اور بلحاظ تشبیہ لفظ کاوکاو اس جگہ نہایت ہی عمدہ ہے۔

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یعنی میرے شوقِ قتل کے جذبۂ بے اختیار کو دیکھئے کہ تلوار کے دم کو تلوار کے سینہ سے باہر کیا ہے اس شعر میں بے اختیار کا لفظ خصوصیت سے قابل داد ہے کیونکہ دم شمشیر کا سینۂ شمشیر سے باہر ہونا ظاہری نہیں ہے دم سے مراد تلوار کی دھار ہے

اسی قسم کا ایک شعر میر زا قوتی صاحب لکھنوی کا اسی زمین میں ہے جو کہ اگرچہ اسی مضمون سے ماخوذ ہے لیکن اس سے جدا ہے فرماتے ہیں ع

دل جگر دونوں نکل آئے ہیں پہلو توڑ کر
اللہ اللہ اشتیاق اک آنیوالے تیر کا

اگرچہ ایک فعل غیر معتاد کا ہے جو تذکرہ کیا گیا ہے مگر خوب شعر کہا ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے

آگہی خواہ کسیقدر دامِ شنیدن بچھائے مگر میری تقریر کے مطلب کو
سمجھ کوئی وجہ نہیں ہم کو شکار نہیں کر سکتی یعنی میری تقریر کا مطلب نہیں سمجھ سکتی
شنیدن بچھانے کی خواہش آگہی ہے اسی مضمون کو آسان الفاظ میں مرزا
طرح ادا کیا ہے ؎

تک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا موئے آتش دیدہ

آتش زیر پا یعنی بے قرار یعنی چونکہ میں اسیری کی حالت میں بھی بے
قرار ہوں حلقۂ زنجیر مثل موئے آتش دیدہ بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آگ بال کو جب
پیچ و تاب کھاتا جاتا ہے اور یہ نہایت عمدہ تمثیل ہے اس میں آتش زیر پا ایسا
جس کے نکل جانے پر شعر کا طلسم درہم برہم ہو جائے گا اور یہ کمال شاعری ہے کہ
رکھا جائے جسکے بغیر شعر بیکار ہو جائے۔

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ مبارکباد اسد غمخوار جان دردمند آیا

اے اسد تو غمخوار جان دردمند یعنی حضرت ناصح آپ پہنچے اور یہ چیزیں جو انسان کے لیے
باعث تکلیف ہیں ہمارے لئے تحفہ لائے ہیں یعنی انکی گفتگو میرے لیے رنج وہ ثابت ہوگی۔ یہ
مبارکباد از راہ تشنیع ہے اور ناصح کو اسلئے ہجو ملیح ہے۔ الماس کے کھانے
[سے دل و جگر زخمی ہو جاتے]
ہیں جیسے حضرت داغ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

آنسو نہ پیئے جائیں گے اے ناصح نادان ہیرے کی کنی جان [کہ کھائی نہیں جاتی]

مولانا نظم اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ ایسا شخص جو زخم جگر کا شائق [الماس کھانے سے]
ہے مگر میرے نزدیک یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بہ تنگی [چشم حسود تھا]

[illegible] لے قیس کے اور اس نے کسی کو ظاہر نہ کیا۔ اور کسی کو پسند نہ کیا۔ صحرا مثل چشم حا
[illegible] اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ سوائے قیس کے اور کوئی اس میں نہیں ظاہر ہوا
سد کے تنگ تھا کہ اور کسی کے لئے بجز مجنون کے یہ کافی نہیں ہوا اس میں
[illegible] مجنون کی ہے اور یہ بات کی ہے میرا ایک اسی مضمون کا شعر ہے

وحشت دل دامن صحرا نہ ہوا　　　بجھ گئی قیس کی آتش کا گذارا نہ ہوا

[illegible] لی نے نقش سویدا کیا درست　　　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

[illegible] ہے داغ سویدائے دل سے ہمیشہ آہ کا دھواں اٹھتا ہے اس سے میں
[illegible] ہوں کہ اس داغ کی پیدایش بھی آشفتگی سے ہوئی ہے کیونکہ
[illegible] معنی پریشانی کے ہیں یا یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ میری پریشان خاطری نے میرے
[illegible] داغ قائم کر دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ داغ سویدا محض پریشانی ہے جو دود سے
پیدا ہوتا ہے یاد رکھئے ایسے اشعار جن میں اس قدر بلند پروازی کی جائے کہ
[illegible] ہیں اور انہیں کوئی معنی مستقل پیدا نہوں قابل تحسین نہیں ہوتے۔

[illegible]　　　جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

[illegible] وہی خواب میں بھی نظر آتی ہیں
قاعدہ ہے [illegible] سے کچھ معاملہ کر رہا تھا جس میں
مصنف کہتا ہے کہ میرا خیال خواب [illegible]
میرا فائدہ تھا یا نقصان تھا مگر آنکھ کھلتے ہی وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ نہ نقصان باقی رہا نہ فائدہ رہا
وہی میں تھا اور کنج تنہائی۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز　　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

اس شعر میں تین چار لفظ ایسے جمع کیے گئے ہیں کہ جن سے شعر بہت بلند ہو گیا ہے جس میں
اول لفظ ہنوز ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کہنے والا مکتب غم دل میں مدت سے سبق
پڑھتا ہے۔ دوسرے رفت گیا اور بود تھا یہ دو لفظ بہت جامع ہیں جن سے بہت سے
معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی عیش کا زمانہ کبھی تھا اب گیا یا معشوق یا میرا دل کبھی تھا اور اب گیا

وغیرہ اس مین خاص نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے انہین دو الفاظ کو ہمیشہ پڑھنے سے ایک ابتر جنون
کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔ جو مکتب غم دل کے سبق کا خاص فائدہ ہے اور اس سے ایک خاص
حالت کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ عرفی شیرازی نے بھی اپنے ایک شعر مین قریب قریب ایسا ہی
مضمون ادا کیا ہو مگر محاکات عرفی کے شعر مین زیادہ ہین اور اسی وجہ سے غالب سے زیادہ
وہ شعر اچھا ہے ؎

عشق میخوانم و می گریم زار | طفل نادانم و اول سبق است

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی | مین ورنہ ہر لباس مین ننگ وجود تھا

میری برہنگی کے داغ عیوب کو کفن نے ڈھانپ لیا ورنہ زندگی مین اگر کوئی لباس بھی پہنتا
تب بھی مین ننگ ہستی ثابت ہوتا۔ ننگ وجود کو لفظ برہنگی سے ایک تشابہ ہو ورنہ ننگ وجود
اس محل پر کچھ اچھا نہین معلوم ہوتا ایک میر کا شعر ہے ؎

دامن زخم نے کی اُس سے مروت ورنہ | بسمل تیغ ستم دفن بھی عریان ہوتا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد | سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

یعنی کوہکن نے رسم کی پابندی کی اور تیشہ کے بغیر مر نہ سکا ورنہ عاشق کامل ہوتا تو یونہی مرجاتا
چونکہ تشنیع کی راہ سے یہ شعر کہا گیا ہے اسلئے ایسے ہی الفاظ بھی لائے گئے ہین سرگشتہ
خمار رسوم و قیود یعنی رسوم دنیوی کی شراب کے خمار نے اُسکا سر پھیر دیا تھا اور خمار ایک
نہایت تکلیف دینے والی چیز ہے۔ مومن مرحوم بھی ایک جگہ ایسا ہی کچھ فرماتے ہین۔

جوش وحشت سے ہے بیتاب صحیح نہ پہنا نا زنجیر | دیکھ دیوانہ تو ہو مین نہین پابند رسوم

خود مرزا فرماتے ہین ؎

ترا بشکر چہ حاجت نہ آن بود غالبا | کہ جان بہ لذت آویزش و روان نہ دہد

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا | دل کہان کہ گم کیجے ہمنے مدعا پایا

تم جو ہم سے یہ کہتے ہو کہ اگر تیرا دل کہین ہم کو پڑا مل گیا تو پھر ہم نہ دینگے ہمارے پاس
دل کہاں ہے کہ اب گم ہوگا۔ بس آپکا مطلب ہم سمجھ گئے کہ ہمارا دل آپ کے پاس ہے اور
آپ اس کو دینا نہین چاہتے۔ پڑا پایا۔ دلی کی زبان ہے لکھنؤ مین پڑا ملا۔ بولتے ہین۔
اور اس کو زیادہ فصیح سمجھتے ہین۔ ایکبار یہان کے ایک شاعر کے سامنے مین نے اپنا یہ شعر پڑھا

مین تو یون رویا کہ دل میرا گیا
تم جو ہنستے ہو تمھین کیا پا گیا

انھون نے فرمایا کہ پا گیا بجائے مل گیا کے ہمارے یہان نہین بولتے - واللہ اعلم

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

میری زندگی بغیر عشق کے بے مزہ تھی اُس سے مجھے زندگی کا مزہ ملا - یہ میرے درد کی دوا ہے مگر یہ دوا یعنی عشق خود درد بے دوا ہے - عوام بجائے بے دوا کے لادوا کہتے ہین جو صحیح نہین ہے - اسی مضمون کو مولانا ظہوری ترشیزی نہایت اعلیٰ الفاظ مین ادا فرماتے ہین -

شد طبیب ما محبت منتش بر جان ما
محنت ما - راحت ما - درد ما درمان ما

اور مولانا روم نے بھی اسی مضمون کو اپنے واعظانہ لہجہ مین یون ادا فرمایا ہے -

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما

دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

کہا گیا ہے کہ دنیا مین تین طرح کے دوست اور تین طرح کے دشمن ہوتے ہین اپنا دوست - دوست کا دوست - دشمن کا دشمن - یہ سب دوست ہین - اپنا دشمن دوست کا دشمن - دشمن کا دوست یہ سب دشمن ہین مصنف اسی کو کہتا ہے - کہ دل میرے دشمن کو دوست رکھتا ہے یعنی معشوق کو پھر اس کا اعتبار کیسا - کیونکہ یہ خود ایک دشمن ہے اور اسی وجہ سے اس کا نالہ و آہ سب بے اثر ہے یہ مضمون عام ہے ہر دیوان مین ایسے بہت سے شعر ملین گے مگر مصنف نے پہلے مصرع مین توجیہ کر کے کچھ جدت سے کام لیا ہے -

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

یہ ایک نہایت باریک مضمون ہے مگر جناب نظم نے اپنی شرح پر کچھ توجہ نہین فرمائی اور صرف اتنا لکھدیا ہے کہ ایک عاشق جیسے دل غنچہ پر یہ گمان ظاہر کرتا ہے کہ یہی میرا دل ہے جو مدت سے کھویا ہوا تھا اور جناب حسرت صاحب موہانی نے بھی یہی لکھا ہے لیکن اتنا ایزاد فرمایا ہے کہ آمد بہار سے جوش جنون تازہ ہوا ہے حالانکہ الفاظ بتاتے ہین کہ مصنف کا منشا کچھ اور ہے کہ اگلی بہار مین خزان آنے پہ ہمارا دل خون ہوگیا تھا اور گم ہوگیا تھا - اب غنچہ پھر کھلنے لگا تو آج

اپنا وہی خون شدہ دل ہم کو نظر آیا اور اسی مضمون کو تھوڑے تھوڑے تغیر کے ساتھ مصنف نے کئی جگہ ادا کیا ہے منجملہ اُنکے ایک یہ ہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

حال دل نہیں معلوم لیکن اسقدر یعنی	ہمنے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

ہم کو اپنے دل کا اور کچھ حال معلوم نہیں صرف اسقدر معلوم ہے کہ ہم نے اس کو بار بار ڈھونڈھنے پر نہیں پایا۔ اور تمنے اسکو بارہا پایا مگر کچھ پروا نہ کی۔

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا	آپ سے کوئی پوچھے تمنے کیا مزا پایا

ناصح کے شور پند نے میرے دل کے زخموں پر خوب نمک چھڑکا کوئی حضرت ناصح سے پوچھے کہ آپکو اس نمک چھڑکنے سے کیا مزا آیا۔ شور پند سے نمک چھڑکنا۔ قابل داد ہے۔ نمک شور مزا وغیرہ میں تناسب الفاظ بھی ہے لطف یہ ہے کہ میرے زخمہائے دل کا اس میں بھی اک لطف آتا ہے۔

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا	آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

سوز نہاں۔ اور آتش خاموش نہایت مناسب الفاظ ہیں یعنی میرا دل سوز نہاں سے ایسا چپکے چپکے جل گیا کہ کسیکو خبر بھی نہوئی جیسے کہ آتش خاموش آہستہ آہستہ جل جایا کرتی ہے یہی دل کی کیفیت ہوئی ہے۔

آتش الفت بھی کیا ہی آتش خاموش ہے	اُڑ گئے دل کے دھوئیں لیکن دھوان کوئی نہیں

غالب کے اس مطلع میں مصرع ثانی کا قافیہ اور ردیف بیکار ہے۔

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں	آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

عشق سے میرے دل میں ایک ایسا سوز و گداز پیدا ہوا کہ اس سے ایک آگ بھڑکی اور اس سے تمام دل و جگر جل کے خاک سیاہ ہوگیا نہ یاد یار باقی رہی۔ نہ ذوق وصل رہا۔ مولانا نظم نے آگ بھڑکنے کا سبب رشک کو ٹھہرایا ہے مگر میں نہیں سمجھا کہ معنی رشک کن الفاظ سے مترشح

ہوتے ہیں اسی مضمون کو میر تقی میر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں　　لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

یہاں خصوصیت کے ساتھ یہ بات غور کے قابل ہے کہ یہ مضمون میر کے شعر سے لیا گیا مگر غالب کے یہاں بہت چست الفاظ میں نظم کیا گیا ہے اور میر کے یہاں معمولی طریقہ سے اور اسی وجہ سے یہ شعر محض سرقہ کے الزام سے جدا ہے بلکہ اردو زبان کی ترقی کہی جا سکتی ہے اسی مضمون سے لگ بھگ مضمون جناب آرزو صاحب لکھنوی کے یہاں بھی پایا جاتا ہے اور یہی زمین ہے مگر ہم بلا رعایت کے یہ کہہ دینے کے لیے تیار ہیں کہ اگر نقش اول اور نقش ثانی کے خیال اور [illegible] کی تمیز کو اٹھا دیا جاتا ہو تو میر کے یہاں سے غالب کے یہاں اور غالب کے یہاں سے جناب آرزو کے یہاں بہت اچھے طریقہ سے یہ مضمون نظم کیا گیا ہے اس پر وہ حضرات خصوصیت سے [illegible] جو دیکھنا چاہیں کہ ترقی خیال کیونکر ہو سکتی ہے۔ شعر یہ ہے ؎

پہلے تھی فکر آگ حسرت خانۂ دل کی سنبھلے　　اب یہ اسکی جستجو کیا رہ گیا کیا جل گیا

جناب آرزو کے کئی شعر اس غزل میں چست ہیں۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا　　میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

پرے دلی کا محاورہ ہے اور تھا۔ لیکن لکھنؤ کا محاورہ نہیں ہے بلکہ یہاں کے لوگ اس کو نگاہ نفرت دیکھتے ہیں غالب خود ایک جگہ اور کہتے ہیں کہ ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود　　کعبہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غرض وہاں یہ لفظ بے تکلف لکھا جاتا ہو اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی نقصان بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اسے ترک کیا جائے اس سے سوائے اس کے کہ اردو کے ذخیرہ کو تنگ کیا جائے اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔

مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ میں اب عدم سے بھی آگے ہوں یعنی میری نیستی عدم کے درجہ سے بھی بڑھ گئی ہے ورنہ جب میں عدم کے درجہ میں تھا تو عنقا سے ملاقات ہوتی تھی جو خود درجہ نیستی میں ہے اور اس وقت اس کے بال میری آہ آتشیں سے پھک جاتے تھے مگر اب وہ وقت نکل گیا میں عدم سے بھی آگے بڑھ گیا اسی مضمون کو مرزا عبدالقادر صاحب بیدل عظیم آبادی فرماتے ہیں ؎

ہیچ عنقا بے نیاز عرض ایجادیم ما　　یعنی آں سوئے عدم یک عالم آبادیم ما

یعنی مثل عنقا ہم عالم دنیا مین ظاہر ہونے سے بے نیاز ہین عدم سے اُس طرف (یعنی عدم سے پرے) ہم اور وہ ایک عالم مین آباد ہین مگر غالب نے شعر مین یہ ترقی کی ہو کہ عنقا کو محض عدم مین رکھا اور اپنے آپکو اُس سے ممتاز درجہ مین ظاہر کیا اسیوجہ سے یہ مضمون میرزا غالب مرحوم کا مضمون کہا جاسکتا ہے ورنہ ترجمہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتا۔

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہان — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اسمین اپنی جوہر اندیشہ کی گرمی کو عجب طریقہ سے ظاہر کیا ہے اور یہ طرز بیان ہی اس شعر مین زیادہ تر پسندیدہ ہی یعنی کہتا ہو کہ مین اپنے جوہر اندیشہ کی گرمی کا کیا اظہار کرون ذرا وحشت اور صحرا نوردی کا خیال کیا تھا کہ صحرا مین آگ لگ گئی اس سے مراد یہ ہے کہ میرے جوہر اندیشہ مین اتنی سوزش اور گرمی موجود ہے۔عرض جوہر کے مناسبات سے بفتح راے مہملہ صحیح بسکون غلط ہی۔جوہر وہ جسم بالذات قائم ہو۔عرض وہ جو بذات دیگر قائم ہو۔مگر یہان عرض یعنی ظاہر کرنا اور جوہر استعارہ ہو اندیشہ سے یعنی ذات۔اصل وغیرہ۔ایسا ہی ایک مضمون ہے جس کو جناب آرزو صاحب اسی زمین کے ایک شعر مین یون ادا فرماتے ہین اور وہ اس سے صاف ضرور کہا جاسکتا ہے زیادہ کچھ نہین۔

آرزو سبز بختی کے اثر کی پیشقدمی دیکھئے — جبکی شادابی پسند آئی وہ صحرا جل گیا
آہ یہ ہو بیادفی اسامری سوختہ بختی کا اثر — جس گلستان پہ نظر کی وہ گلستان نہ رہا

دل نہین ہو ورنہ دکھاتا تجکو داغون کی بہار — اس چراغان کا کرون کیا کارفرما جل گیا

دل مین اتنے داغ تھے کہ اب دل مٹ گیا اور بجاے دل چند داغ رہ گئے ہین اسی لئے افسوس کے لہجہ مین مصنف کہتا ہو کہ افسوس داغون کی بدولت جو یہ چراغان ہو اسکی اب کوئی بہار نہین ہو کیونکہ یہ چراغان جس کی بدولت تہا اور جو اس کا کارفرما یعنی مہتمم تہا وہ اسی چراغان سے جل گیا چراغان ایک قسم کا تماشہ ہے جسمین جابجا چراغ جلاے جاتے ہین اور ایک قسم کا عذاب بھی ہو نہایت اعلیٰ شعر ہے اسی مضمون کو ایک جگہ مین نے بھی کہا ہے مگر اس مین مضمون کو کچھ بدل دیا گیا ہو جس سے صرف سرقہ کی حد سے جدا ہے ؎

ہوتا جو دل تو تم کو دکھاتا مین داغ دل — اب کیا کرون کہ اب تو نہ دل ہو نہ داغ ہو

بیخود دہلوی اس مضمون کو کہ دل مٹ گیا داغ رہ گیا یوں فرماتے ہیں ۔

خدا بخشے دل مرحوم کی اب قدر جانی ہے — یہ داغ آرزو اُس مرنے والے کی نشانی ہے

خود مصنف نے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اس مضمون کو دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے ۔

دکھاؤنگا تماشہ دی اگر فرصت زمانہ نے — مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

یعنی اگر یہ دل رہ گیا اور اس کے داغ یونہی دن رات ترقی کرتے رہے تو تجھ کو تماشہ دکھاؤں گا کہ کبھی یہ سرو چراغاں ہو جائے گا اور اسمیں اک بہار آ جائے گی ۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھکر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

اس شعر میں نکتہ یہ ہے کہ جب دل جل گیا ہے تو اب افسردگی کی آرزو ہے جلنے کے بعد ہی افسردگی پیدا ہوتی ہے اہل دنیا اور احبا اور اعزا وغیرہ کی شکایت غالب کا حصہ ہے اور اس قسم کے شعر اُن کے یہاں بہت ہیں اور دُکھے ہوئے دل سے جو شعر اس بارہ میں اُن کے قلم سے نکلا ہے بے مثل ہے جیسے کہ فرماتے ہیں ؎

گر دہم شرح ستمہائے عزیزان غالب — رسم امید ہمانا ز جہان برخیزد

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

ہر رنگ یعنی ہر طرح رقیب کے اصل معنی نگہبان کے ہیں اور مجازاً بمعنی دشمن مستعمل ہے شوق سے مراد یہاں عشق ہے یعنی شوق ہر حال میں سر و ساماں کا دشمن رہا قیس کی تصویر بھی ننگی ہی کھینچی رنگ اور پردہ وغیرہ تصویر کے مناسبات سے ہیں ۔ اس میں مقابلہ محاورہ کے تناسب الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے جو غیر مناسب ہے کیونکہ تناسب الفاظ کا قدرتاً بے تکلفی کے ساتھ نظم ہو جانا حسن شعر ہے اور اس کے واسطے آورد کی تکلیف اٹھا کر شعر کو گنجلک بنا دینا بدترین عیوب میں سے ہے ۔ اسمیں شاعر کو دھوکہ ہوتا ہے اور کچھ کا کچھ کہہ جایا کرتا ہے جیسے کہ آپ غالب ہی کے گزشتہ شعر میں پڑھ چکے ہیں جو اس مضمون سے کچھ مشابہ بھی ہے

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی — میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

ننگ وجود محض تناسب الفاظ کے لیے ہے باقی خیریت ہے ۔

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یا رب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

تنگدل رنجیدہ دل کو کہتے ہیں اس جگہ لفظ سے معنی کا فائدہ اُٹھایا ہے یعنی میرا دل تنگ تھا اور ہمیں زخم فراخ تھا تو اس زخم نے میری تنگدلی کی داو نہ دی کہ میں نے اس تنگدلی کے باوجود اتنا بڑا زخم کھایا اور یہی سلوک میرے ساتھ تیر نے کیا کہ وہ پرافشان میرے دل سے نکلا یعنی تیر کو پرافشانی ایسے موقعہ پر نہ کرنی چاہئے تھی بلکہ میری تنگدلی پر نگاہ رکھنی چاہئے تھی اگر بقول دیگر شارحین پرافشانی کے معنی پھڑ پھڑانے کے لے لئے جائیں جس سے غم و افسوس کی صورت پیدا ہوتی ہے تب بھی مصنف کی غرض اصلی فوت نہیں ہوتی کہ اس کا پھڑ پھڑانا دل زخمی کے لیے ویسا ہی باعث تکلیف ہے جیسا کہ تنگی دل کی داو نہ دینا تنگی دل کے مضمون کو مصنف مرحوم نے کئی جگہ مختلف طریقوں سے لکھا ہے منجملہ اُسکے۔

کیا تنگ ہم ستمزدگان کا جہان ہے — جسمیں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے۔ یا

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ — اسقدر تنگ ہوا دل کہ میں زندان سمجھا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

تیری بزم سے جو کوئی نکلتا ہے وہ پریشان ہو کر نکلتا ہے۔ وہ بوئے گل ہو یا نالۂ دل۔ یا چراغ محفل کا دھوان ہو۔ مولوی علی حیدر صاحب نظم نے نکلنے کو محض باعث پریشانی ٹھہرایا ہے اگرچہ یہ بھی ایک اچھا پہلو ہے۔ مگر یہاں جو چیزیں جمع کی گئی ہیں اُنمیں بالذات پریشانی کا مادہ موجود ہے۔

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد — کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

یعنی میرا دل لذت درد کا ایک دسترخوان تھا جسپر انواع و اقسام کے درد موجود تھے مگر دوستوں نے بہت کم غم کھایا۔ یعنی میرا غم جسقدر کھانا چاہئے تھا اتنا غم کسی نے نہ کھایا لب و دندان۔ کم کے معنی میں آتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ حسرتیں میرے غم میں ہونٹ ہی کاٹتے رہے انکو اس سے زیادہ کچھ کرنا چاہئے تھا۔

اے نوآموزِ فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا

ہمت دشوار پسند موصوف ہے اور نوآموز فنا اُسکی صفت ہے یعنی اے ہمت دشوار پسند

باوجودیکہ درس فنا بہت مشکل تھا مگر تو نے بہت آسانی سے اس سبق کو حاصل کر لیا - گویا تیرا پہلا سبق درس فنا ہو گیا - فنا کا درس سبق آخری ہوتا ہے مگر تو نے اول ہی میں اسے ختم کر دیا اب میرے لیے کونسا دشوار کام تجویز کیا جائے - میں نے اس غزل پر قافیہ بہ قافیہ غزل لکھی تھی اور اس میں اس خیال کو محض اسی لیے بہت آسان الفاظ میں ادا کیا تھا - اس کو اسی شعر کی شرح سمجھ لیجئے یا جو جی چاہے - مگر یہ ضرور کہونگا کہ سرقہ کی حد سے باہر ہے ؎

تنگ ہو عشق کی دشوار پسندی مجھ سے
مجھکو مرنا ہی شب ہجر میں آسان نکلا

دلمیں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

رونے میں جو میں نے کچھ ضبط سے کام لیا تھا اور کوئی قطرہ میری آنکھ میں رہ گیا تھا اس قطرے نے دل میں پھر اک شور اٹھا رکھا ہے - گویا نہ نکلنے والا قطرہ طوفان تھا -

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

باب نبرد یعنی لائق نبرد - جو لائق نبرد نہ تھا وہ عشق کی دھمکی میں مر گیا - اور عشق نبرد پیشہ مرد نبرد پیشہ چاہتا تھا - یہ ایسا ہی شعر ہے جیسے مرزا غالب مرحوم خود ایک اور جگہ لکھتے ہیں

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

یعنی جب میں زندہ تھا تو موت کا ڈر لگا ہوا تھا میرا رنگ کچھ صرف موت ہی کے وقت زرد نہیں پڑ گیا بلکہ اس سے پہلے بھی زرد تھا یعنی میری موت اور زندگی کی حالت یکساں ہے اس قسم کے اگرچہ شعرا کے یہاں بہت سے مضمون پائے جاتے ہیں کہ زندگی میں موت کا فکر رہا اور مر کر قبر میں حشر کا غم - مگر غالب نے دوسرا مصرع نئی ترکیب سے کہا ہے اور اس لیے یہ مضمون غالب کا حصہ ہو گیا اور یہ شعر اردو کا بہترین شعر ہے -

تالیف نسخہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

میں فن عشق میں کامل ہونے وفا کا نسخہ تصنیف کر رہا تھا اور ابھی پورے طریقہ سے میرا

خیال جمع نہ ہوا تھا۔ یعنی ہنوز عاشقی میں بڑا تجربہ کار اور صاحب مرتبہ نہیں ہوا تھا۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

دل سے جگر تک اب ایک دریائے خون ہے اور پہلے یہی رہگذر تھی جسمیں بڑی بہار تھی کہ جلوۂ گل بھی اسکے سامنے حقیقت نہ رکھتا تھا رہگذر کے لیئے۔ گرد کا محاورہ نہایت برجستہ صرف ہوا ہے۔ اس شعر میں موجودہ اور گزشتہ زندگی کا تقابل کیا گیا ہے ایسے مضامین میں جگر کاوی بیکار ہے اب آپ ایک شعر اسی مضمون کا مرزا داغ کا سنیئے انہوں نے کوہ کندن وکاہ بر آوردن سے کام نہیں لیا ہے بہ سیدھی سیدھی بات سادگی کے ساتھ کہتے ہیں مگر غور فرمایئے گا تو آمد و آورد کے معائب و محاسن پیش نظر ضرور ہو جائینگے ؎

کبھی یہ دل تماشا گاہِ صد عیش و مسرت تھا — اب اس میں حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہیں

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی — دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

اندوہ غم عشق کی کشمکش سے کسیطرح رہائی نہیں ہوسکتی اگرچہ اب دل نہیں رہا مگر دل کا درد موجود ہے۔ دل کے درد سے مراد دل کے چلے جانے کا درد ہے ورنہ اگر دل کا درد یعنی دل میں درد کہینگے جیسے کہ دوسری شرحوں میں یہ معنی بیان کئے ہیں تو یقینی شعر مہمل ہو جائے گا دل نہیں ہے اور دل میں درد ہے یعنی چہ ؎

افراط رنج ہجر ستمگار الاماں — پہلو میں درد رہ گیا اور دل نہیں رہا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے — زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

احباب نے میری وحشت کا یہ علاج کیا کہ مجھے قید رکھا مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی میرا خیال اسی طرح جنگل جنگل مارا مارا پھرتا رہا۔ خود مرزا نے اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے۔

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے — حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آزاد مرد سے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ لاش کو بے کفن ثابت کیا ہے اور یہ محاورہ نہایت برمحل

صرف ہوا ہے اور اس صورت سے یہ شعر تمثیل ہو گیا ہے ذوق مرحوم کے یہاں بھی ایک شعر اسی
مضمون کا ہے مضمون دونوں کا دقیق نہیں ہے عام ہے سرقہ وغیرہ کا گمان ایسے مضامین پر نہیں کیا
جاسکتا البتہ یہ ضرور غور کیجیے کہ جب دو استاد ایک ہی مضمون کو لکھتے ہیں تو کس کس طرح سے
ادا کر جاتے ہیں کہ سننے والوں کو دونوں میں ایک نیا لطف پیدا ہوتا ہے ؎

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہان سے گذر گیا ۔۔۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مگر غالب کے شعر کو یہاں اس لیے ترجیح دی جاسکتی ہے کہ اسمیں ایک محاورہ اسقدر برمحل صرف
ہوا ہے کہ جس کا جواب نہیں ہے میرے مکرم استاد مولانا سید ابو الحسن صاحب ناطق گلاوٹھوی
اپنی خاص زبان میں محاورات کے پردہ میں اس مضمون کو یوں ادا فرماتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ناطق بیٹھا بیٹھا چل بسا ۔۔۔ ہائے کیا کمبخت کو رکھی ہوئی سی آگئی

حق استادی سے قطع نظر کر کے میرے نزدیک یہ اس مضمون کا بہترین شعر ہے۔ رکھی ہوئی سی آگئی
ممکن ہے کہ لکھنؤ کا محاورہ نہو۔ مگر دلی کا ایک محاورہ ہے جو اسی موقع کے لیے وضع ہوا ہے ایک
میر اشعر اسی مضمون کا ہے ؎

خدا اسکو بخشے اسکی باتیں یاد آتی ہیں ۔۔۔ بڑا سیدھا مسلمان تھا بڑا اچھا مسلمان تھا

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا ۔۔۔ تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

یعنی تسبیح گننا بت مشکل پسند کو پسند آیا اور یہ اسلئے کہ ایک دم سو دل (جو سو دانوں سے
مراد ہے) اڑا لیے۔ اس شعر میں تعقید ہے اور ظاہرا ایسے مضمون کو کوہ کندن و کاہ برآوردن
سے زیادہ وقعت نہیں دیجا سکتی بت کی صفت مشکل پسند اس واسطے رکھی ہے کہ تسبیح بت
کے لیے ایک مشکل اور فعل غیر معتاد ہے اس شعر کے معانی کی اور بھی تاویل کی گئی ہے جس سے
ممکن ہے کہ غالب واقف بھی نہوں لہذا لکھنا فضول ہے نظم صاحب کی شرح میں لکھے ہیں تسبیح کے
سو دانوں پر ایک شعر یاد آگیا جس کا لکھنا میں لطف سے خالی نہیں سمجھتا اور اس سے یہ سمجھ میں
آتا ہے کہ مضمون کیسا ہی باریک ہو کتنا ہی عمدہ ہو اگر بے تکلف ادا ہو جائے تو سبحان اللہ ورنہ
کچھ نہیں ایک عام مضمون جو آمد سے بھرا ہو وہ اس سے اچھا خواہ کتنا ہی مبتذل ہو ؎

کشت لاحاصل صد سالہ ہو نرا ہے تسبیح ۔۔۔ کوئی سرسبز ہوا بھی ہے سو دانوں میں

یہ مضمون کوئی نیا مضمون نہیں ہے غالب کے یہاں مضمون نیا ہے مگر بندش چست نہیں۔

بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

امید اور ناامیدی سب دل کے ساتھ ہے جب دل نہین رہا تو کوئی امید باقی نہین رہی اور اس صورت مین ہمیشہ کے لئے ناامیدی ہوگئی۔ اور نومیدی کو آسان اس لیے کہا ہے کہ دل کے موجود ہونے کی حالت مین ناامیدی ہو جانا باعث تکلیف ہے اور نہونے کی حالت مین آسان ہے فکر کشایش نے ہمارے دل کو جو بصورت عقدہ ہے پسند کیا اور اس کو لے لیا اور ہم سے ہمیشہ کے واسطے جدا کر دیا یہ کہ کشایش کو ہمارا دل بصورت عقدہ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے پھر کیا کشایش ہوگی۔ بیدل اپنے تخلص سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسے ہی مضمون کو ادا فرماتے ہین ؎

بروی یاس بیدل پشت دستے میگزم
غنچۂ این عقدہ کا تش از سعی ندان نشگفد

اسی بیدلی کے مضمون کو مین نے لکھا ہے ؎

کلفتِ بیدلی خو گر اید است پوچھ
اب جو ممکن ہی نہین درد کا پیدا ہونا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخون غلتیدنِ بسمل پسند آیا

خواہش سیر گل سے قاتل کی بے مہری ثابت ہوتی ہے کہ اس کو بسمل خون غلتیدہ کا نظارہ پسند ہے یعنی پھول۔ یہ تمثیل نہایت عمدہ ہے رنگ گل سے خون اور پھولون کا ہوا سے ہلنا بسمل کا خون مین لوٹنا ہی نہایت عمدہ شعر ہے اور الفاظ مناسب اس مین جمع کیے گئے ہین اسی مضمون کو مرزا غالب مرحوم خود دوسری جگہ یون ادا فرماتے ہین ؎

نہین منظور اپنے زخمیون کو دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنے شوخی بہانے کی

دہر مین نقشِ وفا وجہِ تسلی نہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہوا

گرچہ نقش وفا زمانہ مین موجود ہے مگر اس سے کچھ تسلی نہین ہوسکتی یہ گویا ایک لفظ ہے جس کے کچھ معنی نہین ہین۔ وفا کے مضمون ہر شاعر کے یہان بھرے پڑے ہین اور ایک سے ایک اچھا ہے سعدی ایک جگہ فرماتے ہین کہ ؎

یا وفا خود نبود در عالم
یا مگر کس درین زمانہ نکرد

مین نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹون — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہوا

مین نے چاہا تھا کہ مین مرکر اس غم و غصہ سے چھوٹ جاؤن مگر وہ ظالم میرے مرنے پر راضی نہوا یہ شعر بہت صاف اور نہایت اعلیٰ جذبات عاشقی کا نمونہ ہے یعنی اگرچہ وہ ظالم ہے مگر مجھ مین پھر بھی یہانتک اسکی مرضی کی پابندی ہے۔ اسمین اپنی محرومی اور معشوق کے ظلم کو ثابت کیا ہے نعمت خان عالی ایک جگہ فرماتے ہین ؎

خواستم آتش دلرا بہ نشانم بسرشک — آنقدر ہم جگر سوختہ ام آب نداشت

میرا ایک شعر ہے ؎

کہین کے ہم نرہے ہائے تیرا استغنا[۱] — یہ حکم ہے کہ کوئی جان بھی فدا نہ کرے

دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی — گر نفس جادۂ سرمنزل تقویٰ نہوا

تقویٰ اور تقوی تجلا۔ اور تجلی وغیرہ قافیۂ الف اور یے دونون کیساتھ نظم ہوتے ہین یعنی اگر میرے دل پر خیالات تصوف اور تقوی نہین گذرتے تو نہ سہی خیالات ساغر و شراب ہی کا گذرگاہ بنا رہے جیسے کہ عالمگیر اپنے ایک رقعہ مین لکھتے ہین کہ انسان اگر بکار ہائے عقبیٰ نتواند پرداخت ساختگی کار ہائے دنیا چہ بد است ۔ نفس یعنی جان۔

ہون ترے وعدہ نکرنے مین بھی راضی کبھی — گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

یعنی مین تجھ سے ہر حالت مین خوش ہون اگر تو وعدہ کرتا ہے تو فہو المراد اور نہین کرتا تو بھی خوش ہون کہ میرے کان پر آواز تسلی کا احسان نہوا۔ ایسے مضامین غالب کے یہان اکثر پائے جاتے ہین ایک جگہ فرماتے ہین۔

دردِ منت کش دوا نہ ہوا — مین نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

حکیم مومن خان ایک جگہ کسیکا احسان بُرا ہوتا اس نگاہ سے دیکھتے ہین۔

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائینگے کبھی — زندگی کے لئے شرمندۂ احسان ہونگے

خود غالب ایک اور جگہ احسان کی برائی اس طرح کرتے ہین۔

دیوار بارِ منت مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احسان اٹھایئے

[۱] استغنا بتانیث بھی لکھا گیا ہے اور وہ بھی صحیح ہے۔

نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہی جینا ایں سہارے کے

شیخ حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپای مردی ہمسایہ در بہشت

میں نے بھی احسان کے برا ہونے میں یہ شعر کہا ہے۔

بلائے جان ہوتی سائل کو منت تاثیر
جسے کوئی نہ سنے اس صلہ کا کیا کہنا

غرضکہ یہ مضمون عام ہے - یہ جذبات عام ہیں - انمیں صرف بندش کی چستی اور تبدیل الفاظ کافی ہیں اور باوجود عام ہونے کے بھی یہ مضمون بوجہ خاص جذبات ہونے کے خاص ہیں۔

مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

ہم عیسیٰ کے لب ہلاتے ہی چل بسے آواز تم سننے کی نوبت ہی نہ آئی چاہیے کہ اس شعر میں یہ نزاکت پیدا ہوتی ہے کہ عیسیٰ کی آواز کی نوبت نہ پہونچی بلکہ لب ہلانے سے ہی مر گئے ایسے ہی زیادہ غور کیا جاسے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنا لب ہلایا تھا کہ کچھ دعا کریں یعنی میں چل بسے عیسیٰ کی نوبت ہی نہ پہونچی یا عیسیٰ کے بلانے کے لیے جو لب ہلائے اسی میں خاتمہ بخیر ہو گیا غرض تاویل کو بڑی گنجائش ہے اپنی دعا سے آپ مر جانے کے مضمون کو مومن مرحوم فرماتے ہیں ؎

دعا بلا تھی شب ہجر میری جان کے لیے
سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

شعرا سبزۂ خط کو زمرد سے تشبیہ دیتے ہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں سبز ہیں اگرچہ ہیئت میں مختلف ہیں مگر تشبیہ ادنیٰ علاقہ سے بھی جایز ہے زمرد کا یہ خاصہ مشہور ہے کہ اس کو دیکھ کر سانپ اندھا ہو جاتا ہے جو زلف سے مشابہ ہے مطلب یہ ہے کہ تیری زلف کا سانپ اب تک اسی طرح لوگوں کو ڈستا ہے یا وجودیکہ زمرد خط نکل آیا جس پر اس کا اثر پڑنا چاہیے تھا مگر کچھ اثر نہ پڑا شعرا سبزۂ خط کو باعث دلکشی قرار دیتے ہیں مگر سعدی نے سب کے خلاف ہو کر ایک جگہ فرماتے ہیں

سبزه در باغ گفته اند خوش است
داند آنکس که این سخن گوید

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

زاہد جس باغ خلد کی اس قدر تعریف کرتا ہے وہ ہمارے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا بلکہ نسیان کے طاق پر اُسے گلدستہ بنا کے رکھدیا ہے اور ہم بیخودوں نے طاق نسیان کی اُس سے زینت دے رکھی ہے۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بہشت کی تحقیر اسی کے مناسب لفظ گلدستہ سے کی گئی ہے اور پھر بھی اُس کو باعث زینت قرار دیا گیا ہے چونکہ خود کو بیخود کیا ہے اسلئے اسکو طاق نسیان میں رکھا ہے۔ کوئی معمولی شاعر ہوتا تو نہیں معلوم کیونکر تحقیر کرتا ایسے الفاظ کا جمع کرنا محاسن شعر میں سے ہے۔

اس زمین میں اکثر شعرا کی غزلیں ہیں۔ ناسخ مرحوم کا ایک مطلع قابل تحسین قرار دیا گیا ہے

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا　　طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

سوائے شوکت الفاظ کے کوئی معنوی خوبی اس میں معلوم نہیں ہوتی۔ طلسم الفاظ توڑ کر معنی پر نگاہ ڈالیے تو غالباً اس کے سوائے کچھ معنی نہ ملینگے کہ میرے سینہ میں ہجر کا داغ ہے اور میرا چاک گریبان صبح محشر سے مشابہ ہے۔ انہیں آفتاب داغ ہجران کا مشرق اپنے سینہ کو کہا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ روز داغ ہجران کا آفتاب یہاں طلوع کرتا ہے لیکن یہ فعل غیر عادی ہے یعنی آفتاب سے داغ کو تشبیہ کیا جا سکتا ہے مگر آفتاب داغ روزانہ بطریق معتاد طلوع ہو نہیں سکتا ہے پھر یہاں بلا وجہ مشرق داغ ہجر سینہ کو قرار دیا گیا ہے۔ صبح محشر میرے چاک گریبان سے نکلتی ہے بلکہ مشرق آفتاب داغ ہجر معشوق کے دل یا اُس کے فعل کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہاں سے وہ آفتاب طلوع کرتا ہے تب وہ آسمان سینہ عاشق پہ پہونچتا اور اپنی ضیا پھیلاتا ہے بخلاف غالب کے کہ اُس نے نہایت مناسب الفاظ جمع کرکے معنوی خوبیاں بھی پیدا کردیں ہمارے نزدیک غالب اور ناسخ مرحوم کے مطلع میں آفتاب و ماہتاب کا فرق ضرور ہے۔

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوشہائے مژگاں کا　　کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

تیرے مژگان کے ظلم کی روداد کا کیا بیان کروں اُسکی کاوشوں سے میرا ہر قطرۂ خون شگفتہ ملکر مونگے کی تسبیح کا دانہ بن گیا ہے۔

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو　　لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

رعب قاتل بھی میرے نالون کو روک نہ سکا بلکہ حسب قاعدہ پناہ مانگنے کے لئے از راہ عجز مین نے دانتون مین جو تنکا دبایا وہ نیستان کا تنہ بنگیا یعنی اُس نے سیکڑون نے پیدا کردین جس سے نالہ کشی اور بھی بڑھ گئی۔ تنکے کو ریشۂ نیستان کہا ہے۔ اسی قسم کا ایک شعر اور ہے ؎

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغان ہے　　خموشی ریشۂ صد نیستان سے خس بدندان ہے

دکھاؤنگا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے　　مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغان کا

اس سے پہلے ایک شعر ایسے ہی مضمون کا لکھا جا چکا ہے ؎

دل نہین ورنہ دکھاتا تجکو داغون کی بہار　　اس چراغان کا کرون کیا کارفرما جل گیا

مگر کمال شاعری یہ ہے کہ مصنف نے اسی مضمون کو کچھ بدل کر ایک نیا خیال بنا دیا ہے کہتا ہے کہ اول تو امید نہین ہے مگر زمانہ نے فرصت دی تو تماشہ دکھا دونگا کیونکہ میرا ہر ایک داغ دل داغ دل نہین ہے بلکہ سرو چراغان کا ایک تخم ہے یعنی ہر داغ دل مین ایک سرو چراغان کی بہار پیدا ہو جائے گی یعنی ہر داغ مین سیکڑون داغ ہو جاینگے نہایت اچھا شعر ہے نکتہ باریکی اس مین یہ ہے کہ میرا عشق روز افزون ہے اور ہمیشہ ترقی کرتا رہے گا۔ دی اگر فرصت زمانہ نے سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے　　کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

آئینہ خانہ کا تیرے جلوے نے وہ نقشہ بنا دیا ہے جو دھوپ شبنم کا بنا دیتی ہے بعض حکما کا قول ہے کہ شبنم آفتاب سے پیدا ہوتی ہے اور آفتاب ہی اُس کو جذب کر لیتا ہے یعنی آئینہ خانہ تیرے جلوے کی تاب نہین لا سکتا۔

مری تعمیر مین مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

خون گرم محنت۔ ہیولیٰ۔ اصل اور مادہ ہر شے کا۔ تعمیر یعنی تعمیر جسم مصنف نے ایک مسئلہ طب نظم کیا ہے کہ میرے جسم کے اندر خود ایک ایسا مادہ موجود ہے جو مجھے فنا کر رہا ہے گویا میرے خرمن جسم پر گرنے والی برق میری ہی سرگرمی ہے حرارت عزیزیہ ہی اری سے انسان کو زندہ بھی

کر رکھا ہے اور وہی باعث فنا ہے۔ نعمت خان عالی اس مسئلہ کو یون بیان کرتا ہے

دارد نفسم آمد و رفت از پے کشتن
ہر لحظہ بمن مے کشد این تیغ دو دم را

اگا ہے گھر مین سبزہ میری ویرانی تماشہ کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے دربان کا

ذرا میری ویرانی کو ملاحظہ فرمائیے کہ تمام گھر مین گھاس اگی ہوئی ہے اور اب میرا دربان بس گھاس کھودنے کا کام کرتا ہے۔ تماشہ کردن فارسی کا محاورہ ہے اردو مین کچھ اچھا نہین معلوم ہوتا اس کے بجائے دیکھنا فصیح ہے۔ ایک جگہ یون کہہ گئے ہین ؎

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیابان مین ہین اور گھر مین بہار آئی ہے

خموشی مین نہان خون گشتہ لاکھون آرزوئین ہین
چراغ مردہ ہون مین بے زبان گور غریبان کا

چراغ کی لو کو چراغ کی زبان کہا ہے اور جب وہ مردہ ہو گیا تو اس کی لو جاتی رہی۔ یعنی بے زبان ہو گیا۔ یعنی میری بے زبانی مین میری خاموشی مین بہت سی ایسی آرزوئین ہین جو خون ہو گئی ہین اور اب مین انکا اظہار نہین کر سکتا۔ گویا مین گور غریبان کا بجھا ہوا چراغ ہون۔ گور غریبان اور خون گشتہ آرزوئین مشابہ ہین۔ یہ مضمون نہایت حسرتناک الفاظ مین ادا ہوا ہے۔

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زندان کا

انہین لفظ ہین جن مین مصنف نے اپنی مشق دکھائی ہے اور ان سے گذشتہ واقعات کا پتہ چلتا ہے ایک ہنوز۔ دوسرے افسردہ۔ ہنوز سے معلوم ہوتا ہے کہ خیال معشوق اس سے رخصت ہو گیا ہے اور افسردہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نے خود خیال معشوق کو رخصت نہین کیا۔ بلکہ اس نے اس قدر ستم اٹھائے کہ وہ افسردہ ہو گیا۔ اور اس مین خیال معشوق کے رکھنے کی سکت باقی نہین رہی۔ لفظی خوبی یہ ہے کہ افسردن ٹھٹھر جانے اور سکڑنے کو کہتے ہین اور حجرہ تنگ و تاریک کوٹھری کو کہتے ہین افسردہ ہونے سے حجرہ کی مشابہت نہایت عمدہ تشبیہ ہے۔

یعنی باآنکہ اب میرا دل افسردہ ہو گیا اور اس مین خیال یار کے رہنے کی گنجائش

نہین رہی۔ مگر پھر بھی نقش خیال یار کی پرچھائین اس مین موجود ہے اور اسی سے یہ دل افسردہ حجرۂ زندان یوسف بنا ہوا ہے۔ یہ خیال بھی نہایت عمدگی سے ادا کیا گیا ہے اور تمام معنوی اور لفظی خوبیان۔ درو چستی بندش۔ صفائی اس مین موجود ہین نیز اس مین قصہ زلیخا و یوسف علیہ السلام کی تلمیح بھی ہے وہ بھی اس خیال سے بہت ہی مناسب ہے کیونکہ زلیخا کا دل جب افسردہ و آزردہ ہو گیا تھا تب اُس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید مین بھیجا تھا۔

بغل مین غیر کی آج آپ سوتے ہین کہین ورنہ　　سبب کیا خواب مین آکر تبسمہاے پنہان کا

آپ جو خواب مین بار بار ہنستے ہین تو شاید آپ خواب مین غیر کے پاس سوتے اور اس سے خوش ہو ہو کر ہنس رہے ہین۔ ممکن ہے کہ آکر کے بجاے اکثر ہو۔ اور کاتبون کی اصلاح نے شارحین کو نئے نئے معانی پہنانے کی زحمت دی ہو معشوق کے سونے سے شاعر دل پسا ہے اکثر شبہ ہو جایا کرتا ہے کہ معشوق غیر کے پاس نہ پہونچ جاے۔ خود مرزا کے یہان ہر ایک داغ جگہ ایسا خیال اور بھی پایا جاتا ہے ایک شعر اور اسی خیال کا ہے ؎ نا ایک سر دحراہن

وہ خواب مین عدو کے گھر آیا گیا نہو　　منہدی لگی ہو پاؤن نہایت اچھا شعر ہے۔ ن

نظر مین ہے ہمارے جادۂ راہ فنا غالب　　کہ یہ شیرازہ ہے رہتا ہے گا۔ دی اگر فرہ

اس مین جادۂ راہ فنا کو شیرازہ کہا گیا ہے کیونکہ تمام اجزا اسی مین منسلک ہوتے ہین یعنی مین فنا کو بھولا نہین ہون اور یہ رستہ میرے پیش نظر ہے کیونکہ عالم شنیمت ہے کہ مجکو بھی آخر کار اسی شیرازہ مین منسلک ہونا ہے کیونکہ مین بھی اجزاے عالم کا ہون۔

نہو گا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا　　حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

میرا شوق صحرا نوردی ایک جنگل کے پھرنے اور تھکنے سے کم نہین ہو سکتا۔ میرا نقش قدم موج رفتار کا حباب ہے۔ جیسے حباب کا ذوق رفتار کبھی کم نہین ہوتا اور وہ موج کے ساتھ رہتا ہے اور گر گر اور مٹ کر پیدا ہوتا ہے اسی صورت سے میرا ذوق آوارہ گردی تھکنے سے نہین جا سکتا۔ ذوق مرحوم اسی زمین مین اسی مضمون کو یون ادا فرماتے ہین ؎

وہ ہون مین رہ نورد شوق میرے ساتھ جاتا ہے　　برنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

جس طرح مرزا غالب نے نقش قدم کو حباب موج رفتار بنایا ہے اسی طرح ذوق مرحوم نے نقش قدم کو سایہ مرغ ہوا بنایا ہے اور دونوں تمثیلیں نہایت عمدہ ہیں۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ایک وقت تھا کہ سیر باغ کا ہم کو شوق تھا مگر اب وہ دماغ ہی نہیں رہا اب موج بوئے گل سے میرا دم ناک میں آتا ہے یعنی نفرت ہوتی ہے۔ بوئے گل سے ناک میں دم آنا اس جگہ نہایت اچھا ہے اور یہ محاورہ بہت ہی برمحل صرف ہوا ہے۔ دم ناک میں آنا۔ سانس لینا۔ مگر اس میں صنعت ایہام دکھائی گئی ہے صنعت ایہام وہ صنعت ہے کہ کسی شعر میں ذو معنی محاورہ یا لفظ لائیں اور اس کے معنی بعید سے کام لیں ایسے ہی مضمون کا ایک شعر خود غالب مرحوم نے ... جگہ لکھا ہے الفاظ اور ہیں ۔

... اق ہیں تکلیف سیر باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

میرا عجب رنگ ہے پاؤں تک عشق میں ڈوبا ہوا ہوں اور جان کی محبت بھی ہے ہر ایک شخص ... برق کی عبادت کرتا ہوں اور خرمن کے جل جانے پر افسوس ... اس پر ... مرحوم کا ایک شعر یاد آیا غالباً ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے

... ہو جس کے سبب اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

... تاب ... بنے کی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

شرابیوں کو جب شراب کی طلب یا خمار ہوتا ہے تو جمائیاں آتی ہیں اسی صورت سے یہاں ساحل کو خمیازہ کش قرار دیا گیا ہے اور خود کو ساحل سے مشابہ کیا ہے کہتا ہے کہ ساقی بقدر ظرف ہر شخص کو تشنہ کامی ہوتی ہے تو اگر دریائے مے ہے اور افراط کے ساتھ شراب پلا سکتا ہے تو میں بھی ساحل ہوں جس کو تو سیر نہیں کر سکتا ظاہر ہے کہ ساحل ہمیشہ خشک رہتا ہے یہ مضمون عام ہے سب جانتے ہیں کہ شعرا شراب سے کبھی سیر نہیں ہوتے اگرچہ

عمر بھر شراب پینے کا اتفاق نہوا ہو۔ مرزا غالب نے صہبائی مرحوم پر ایک پھبتی کہی تھی کہ واہ
مولانا نے کیا تخلص لکھا ہے (صہبائی) چاہے عمر بھر ایک چلو بھر نہ پی ہو۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں
کہ ساقی کو منادیٰ قرار دیا جائے یعنی اے ساقی۔ اور ظرف کو ظرف ساقی سمجھا جائے یعنی تیرا
جتنا ظرف اتنا ہی میری تشنہ کامی کا خمار ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

راز کی باتیں تو سمجھ ہی نہیں سکتا ورنہ درحقیقت اس درمیان میں جس کو تو حجاب سمجھا ہوا
ہے وہ حجاب یعنی پردہ پردۂ ساز ہے جس سے برابر راز کی آوازیں آرہی ہیں یعنی یہ تیرا ہی
قصور ہے حجاب کو پردۂ ساز قرار دیکر مضمون آفرینی کا کمال دکھایا ہے یہی مضمون ہے جسے
عرفی شیرازی بیان کرتا ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز ست وگرنہ　　　اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام ست
مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموشند　　　کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوشند

مرزا یاس صاحب عظیم آبادی نے اس تمام غزل پر اعتراض بھی کیے تھے اور آتش کی ایک معمولی
غزل سے ۱۹۱۵ء میں رسالہ خیال ہاپوڑ میں تقابل بھی کیا تھا جس کے اکثر جوابات شائع
ہوئے چنانچہ محمد ابراہیم منور دہلوی کے فرضی نام سے اڈیٹر صاحب تمدن نے اس کا جواب
دیا تھا وہ مضمون میں نے بھی دیکھا تھا یاس صاحب نے غالب کے اس مطلع کو آتش کے
شعر کے مقابلہ میں پیش کیا تھا جو نہایت بےمحل اور بےجوڑ ہے ؎

آتش　پامال سمجھئے انہیں رفتار ناز کا　　　طاؤس و کبک رکھتے ہیں جو ادعا ناز کا

اس شعر میں یاس صاحب کو تصوف بھرا ہوا دکھائی دیا جسکا یہی جواب ہے کہ انکا
خیال ہے وہ جو چاہیں سمجھ لیں مگر ہم تو یہی کہیں گے کہ واہمہ خلاق ہے پرانے رنگ کا ایک
معمولی شعر ہے بخلاف غالب کے شعر کے جس کا غالب کے قلم سے نکلنا ہی مشکل تھا۔

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے　　　یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

اس میں مرزا غالب نے وہ نازک خیالی دکھائی ہے کہ جو ان کے حریفوں کو رشک وحسد
کی آگ میں جلائے دیتی ہے اسمیں ایک محاورہ کا مفہوم ادا کیا گیا ہے جو نہایت ہی لطیف

اور سمجھنے والے اس کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہین یعنی نظارہ معشوق نے میرا رنگ اڑا دیا اور وہ رنگ پریدہ مثل صبح بہار کے ہے۔ رنگ پریدہ اگرچہ صرف صبح سے مشابہ ہوسکتا ہی مگر صبح بہار اسلیے اسواسطے کہا ہے کہ اُس کی وجہ سے گلہاے ناز شگفتہ ہون گے صبح بہار مین پھولون کا کھلنا اور پھولون کے کھلنے سے صبح بہار کا پیدا ہونا لازم و ملزوم ہین - وہ پھول ناز معشوق کے پھول ہین یعنی معشوق جب اپنے نظارہ کی تاثیر سے میرا رنگ اڑتا ہوا دیکھے گا تو اُس کو اپنے حسن وغیرہ پر ناز ہوگا اس مین استعارات نہایت بدیع لائے گئے ہین -

معترض نے ان سب خوبیون اور معنوی نزاکتون سے چشم پوشی کر کے یہ لکھا ہے کہ یہ شعر ایک وہبی شاعر کا نہین ہوسکتا - اس مین اور زیادہ بدمذاقی کی یہ مثال پیش کی گئی ہو کہ آتش کا اسی قافیہ کا شعر جو بالکل اس کے سامنے ذلیل معلوم ہوتا ہے لکھا یا ہے ؎

کیونکر وہ نازنین نہ کرے سب بے نیازیان
انداز سے بھی حوصلہ عالی ہو ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
مین اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

یعنی تیری یہ کیفیت ہے اور میری یہ حالت ہو تو غیرون کو تیز نگاہ سے دیکھتا ہے اور تیری مژہ ہاے دراز کو جب مین اس حالت مین دیکھتا ہون تو میرے اوپر برچھیان چلتی ہین یا ہر وقت مین تیری پلکون کے عشق کا دُکھ اٹھاتا ہون اور تو غیرون کو دیکھتا ہے ہمین تقابل کی حالت قابل تحسین ہے - نظم صاحب نے اپنی شرح مین مژہ ہائے کی ہائے کو علامت جمع اور ہائے کلمہ تاسف دونون طرح سے صحیح بتایا ہے مگر میرے نزدیک یہان صرف ہائے جمع کے لیے ہے اور ہائے کلمہ تاسف بالکل غلط ہے - مرزا یاس اس کے مقابلہ پر آتش کے اس شعر کو پیش کرتے ہین اہل نظر غور کرین اور سمجھ لین کہ کتنا فرق ہے اور آتش مرحوم کے سر تصوف کی تہمت رکھنے مین وہ کہان تک کامیاب ہین ؎

عمر خضر سے انکی زیادہ ہو زندگی
دہووَن پیئے جو یار کی زلف دراز کا

یہ انداز بیان غالب مرحوم کا خاص حصہ ہے ایک اور جگہ اسی انداز بیان کو مد نظر رکھتے ہوے فرماتے ہین کہ ؎

مین اور صد ہزار نواہاے جان خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہون

صرفہ ہے ضبط آہ مین میرا وگرنہ مین　　طعمہ ہون ایک ہی نفس جانگداز کا

صرفہ یعنی فائدہ یعنی آہون کے ضبط کرنے مین میرا فائدہ ہے ورنہ ایک ہی آہ کرنے مین مین جل کر خاک ہو جاؤن - اس سے اپنی آہ کی سوزش دکھائی ہے کسی ہندی شاعر نے ایک خیال قریب قریب ایسا ہی ادا کیا ہے ؎

آہ کرون تو جگ جلے اور جنگل بھی جل جائے　　پاپی جیورا نا جلے جس مین آہ سمائے

اگر غور سے دیکھئے تو ہندی مین یہ خیال غالب کے یہان سے زیادہ اچھی طرح ادا ہوا ہے یعنی میری آہ سے ایک زمانہ جل جائے مگر مین ایسا کم نصیب اور سخت جان ہون کہ میرا دل جسمین اس آہ کا مقام ہے وہ نہ جلے گا - بخلاف غالب کے کہ وہ کہتے ہین مین ضبط آہ سے فائدہ اٹھا رہا ہون ورنہ ایک آہ کرون تو جل جاؤن - ایک اور بہت مشہور شعر ہے اگرچہ وہ جدا ہے مگر ایسے موقع پر لکھ دینا بیکار نہ ہوگا ؎

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد　　دگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

معترض نے ایک شعر اسی قافیہ کا آتش مرحوم کا لکھا ہے جو اگرچہ برا نہین ہے مگر غور فرمایئے تو اس شعر کے مقابل مین لانے کے قابل ہرگز نہین ٹھہر سکتا ہے -

ظاہر ہے گرمجوشی پروانہ کا اثر　　روشن ہے حال شمع کے سوز و گداز کا

ہین بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے　　ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شیشہ بازی ایک فن ہے جو ابتک بھی رائج ہے عموماً ہندوستان کے نٹ وغیرہ بھی ایک اسی قسم کا تماشہ کرتے ہین کتھک بھی اسی طرح کا رقص کرتے ہین نٹ بھی برتن مین پانی بھر کر سر پہ رکھ کے ایسا ہی کھیل کرتے ہین - اسی صورت سے مثال دی گئی ہے گوشہ فرش پہ جو شیشہ رکھے ہین اس سے گوشۂ بساط شیشہ باز کا سر معلوم ہوتا ہے -

کاوش کا دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنوز　　ناخن پہ قرض اس گرہ نیمباز کا

میرا دل جو گرفتگی غم و الم سے گرہ نیمباز ہو کر رہ گیا ہے تو اسی وجہ سے وہ کاوش کا بار بار تقاضہ کرتا ہے اور اس طرح سے تقاضہ کرتا ہے کہ میرے ناخن پہ جیسے اُس کا

کچھ فرض ہے اس مین لطیف مضمون یہ ہے کہ گرفتگی سے دل اگرچہ گرہ ہو کر رہ گیا ہے مگر پھر بھی کاوش سے باز نہین آتا ہے اور مین برابر اس کو ناخن سے کھودے جاتا ہون یہ استعارات نہایت لطیف ہین اور غالب کے سوا دوسرے ہندی شعرا کے یہان ایسی تمثیلین نہین ملتی ہین۔ غرض یہ ہے کہ دل مین جو ابھی تھوڑا سا زخم ہے اس کو وہ اور بھی بڑھانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سراپا زخم ہو جاے مرزا نے مختلف پیرایون مین اسی مضمون کو ادا کیا ہے۔ جن پر اندازہ کرنے والون کی نظرین پہونچ ہی جاتی ہین منجملہ انکے ایک یہ ہے ؎

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق
تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

یا

نہین ذریعہ راحت جراحت پیکان
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

غرض ہم اکثر جگہ مرزا کے مترادف المعنی اشعار لکھے ہین اور آیندہ بھی لکھین گے مگر اہل نظر اسکو مرزا کے عجز طبع پر محمول نہ فرمایئن بلکہ اس سے یہ اندازہ فرمایئن کہ ایک قادر الکلام شاعر ادنی تغیر سے ایک مضمون کو کتنی صورتون کے ساتھ ادا کر سکتا ہے یہ کمال شاعری ہے۔

تاراج کاوش غم ہجران ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

اے اسد افسوس کہ میرے راز کے موتیون کے خزانے کو غم جدائی نے لوٹ لیا اور برباد کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مین رسوا ہو گیا۔

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

نظم صاحب کی شرح سے ہم کو بھی اتفاق ہے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر کسی قصیدہ کا ہے جو کسی صورت سے غزل مین شامل کر دیا ہے اس مین رات کا سمان دکھایا ہے یہ شعر دوسرا مطلع ہے مگر چونکہ غزل سے جدا ہے اس واسطے مین نے اسکو پہلے لکھا ہے

بزم شاہنشاہ مین اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ در گنجینہ گوہر کھلا

ہمارے نزدیک دربار مین کوئی مشاعرہ ماہوار یا ہفتہ وار یا روزانہ مقرر ہوا ہے اور اس مین یہ غزل کہی ہے جس کی تقریب تہنیت کے طور پر یہ شعر کہا گیا ہے نظم صاحب لکھتے

اس کی تاویل کچھ اور کی ہے۔ فرماتے ہین کہ بزم شاہنشاہی جو گنجینۂ گوہر ہے وہ اسی سبب سے ہے کہ میرے اشعار کا وہان دفتر کھلا ہوا ہے۔ مگر مجھے اس مین اس لیے تامل ہے کہ غالب کے یہان ایک جگہ اور ایسا ہی شعر ملتا ہے ؎

حضور شاہ مین اہل سخن کی آزمایش ہے
چمن مین خوشنوایان چمن کی آزمایش ہے

دیکھنے والون کو جو تاویل پسند آئے ہم نے اپنا خیال ظاہر کر دیا یہ صرف قیاس ہے اور قیاس اکثر غلط بھی ہوتا ہے۔

اگرچہ ہون دیوانہ پر کیون دوست کا کھاؤن فریب
آستین مین دشنہ پنہان ہاتھ مین نشتر کھلا

یعنی اگرچہ دیوانہ ہون مگر دوست کا فریب کیون کھاؤن ہاتھ مین تو نشتر لیے ہوئے آتا ہے کہ فصد کرے اور میری غمخواری اور علاج کرے مگر آستین مین چھری پوشیدہ ہے کہ مجھے قتل کر دے۔ اسی مضمون کو دوسرا لباس یون پہنایا ہے ؎

وعدۂ سیر گلستان ہے خوشا طالع شوق
مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہین

یا یہ کہ مین دیکھتا ہون کہ ہاتھ مین نشتر ہے اور آستین مین خنجر پھر دوست کا فریب کھانا چہ معنی دارد۔

گو نہ سمجھون اس کی باتین گو نہ پاؤن اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

اگرچہ مین اس کی باتون کو نہ سمجھون اور اس کے بھید کو نہ پا سکون کہ کھلکر یعنی بے تکلف ہو کر وہ مجھ پر کیا ستم ڈھائے گا اور وہ کیون بے تکلف ہوا ہے مگر یہ فخر میرے لیے کیا کم ہے کہ وہ مجھ سے بے تکلف ہوا۔ یون سمجھئے کہ ؎

ہم نہین نازش ہمنامی چشم خوبان
تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

ہے خیال حسن مین حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

میری قبر مین جو مجھکو حسن معشوق کا خیال ہے اس خیال حسن سے مجھے حسن عمل یعنی طاعت و عبادت کا سا مزا آ رہا ہے گویا اس خیال سے میری قبر مین ایک بہشت کا دروازہ کھلا ہوا ہے معشوق کے چہرۂ زیبا کو بہشت کہا گیا ہے خیال حسن سے حسن عمل کا سا خیال ایک نئی بات ہے

ورنہ شعرا اکثر ایسے مضمون باندھتے ہین مثلاً ؎

پس مردن بھی رہتا ہون خیال روے روشن مین چراغ طور جلتا ہو ہمیشہ میرے مدفن مین

دیکھنا یہ ہے کہ ایک پامال اور مبتذل مضمون کو انداز بیان کی صفائی نے سب سے علیحدہ کر دیا ہو دوسرے معنی اس شعر کے یہ بھی ہو سکتے ہین کہ حسن کا خیال رکھنے سے مجھے یہ بدل ملتا ہے یعنی چونکہ مین نے ہمیشہ ظلم و ستم سہے۔ ہمیشہ دنیا کے تمام جھگڑون سے مجھے عشق نے علیحدہ رکھا ہمیشہ رضاے یار پر شاکر اور صابر رہا۔ زندگی مین عشق پر ثابت قدم رہا اور مرنے کے بعد بھی وہی خیال ہے تو انھی وجوہات سے یہ خیال حسن عمل بن گیا اور اسی کا یہ بدل ہے۔

منہ نہ کھلنے پر ہو وہ عالم کہ دیکھا ہی نہین زلف سے بڑھکر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

حالانکہ اُسنے چہرے پر نقاب ڈال رکھی ہے اور وہ پوشیدہ ہے مگر اسپر بھی وہ عالم ہو کہ کبھی دیکھا ہی نہین نقاب نے اُس کے چہرے کو ایسا پر رونق بنا دیا ہے کہ اگر چہرے پر زلف بھی بکھرتی تو ایسی اچھی نہ معلوم ہوتی اس مین یہ ٹکڑا کہ دیکھا ہی نہین خصوصیت سے داد کے قابل ہے کھلنا بمعنی زیب دینا مصنف مرحوم نے نقاب کو اس مین مذکر باندھا ہے مگر یہ لفظ تذکیر اور تانیث مین مختلف فیہ ہے ناسخ مرحوم اور اکثر شعراے لکھنؤ اس کو مونث لکھتے تھے اور لکھتے ہین۔

در پہ پڑنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصہ مین مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

ظاہرا اس شعر مین معشوق کی بد عہدی اور شوخی وعدہ خلافی وغیرہ کا ذکر کیا ہے مگر اس مین الفاظ اتنے اچھے جمع کیے گئے ہین کہ جن سے بہت بڑے معانی کا پتہ چلتا ہے یعنی مین کوچہ گردی کرتا ہوا اُس کے در پر پہونچا اور اس کی بزم کی اجازت چاہی تو اُس نے مجھے در پر پڑے رہنے کی اجازت دیدی۔ مگر ایسا ستم ظریف شوخ طبع اور وعدہ خلاف ہو کہ جب تک مین نے اپنا لپٹا ہوا بستر اُس کے دروازہ پر کھولا اتنی دیر مین وہ پھر گیا یعنی بدعہد ہوگیا اور مجھے دھتا بتا دی۔ یا یہ کہا کہ مجھ سے یہ کہکر اب پلٹ گیا اور مین دیکھنے سے محروم ہی رہا

کیون اندھیری ہی شب غم ہی بلاؤن کا نزول آج ادھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا

اور یہ مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظم صاحب دونوں حضرات نے (اُدھر) لکھا ہے
معنی بیان کیے ہیں کہ پہلے مصرع میں سوال و جواب ہے یعنی تاریکی شب غم کا سبب یہ ہے کہ
بلندی عرش پر سے بلائیں اُتر رہی ہیں اور تاروں نے اُن کے اُترنے کا تماشہ دیکھنے کے لیے
اس طرف سے اُس طرف آنکھیں پھیر لی ہیں یعنی اس کثرت سے اتر رہے ہیں کہ جیسے میلہ
قابل تماشہ ہو مگر میں ان معانی اور اس توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اُدھر بمعنی آنجا نہیں ہے بلکہ
اُدھر بمعنی اینجا اس جگہ صحیح ہے اس صورت میں یہ معنی ہوتے ہیں بلکہ مصنف اعتراضاً کہتا
ہے کہ شب غم اس قدر تاریک کیوں ہے حالانکہ آج بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدۂ اختر
نحوست بھی ادھر ہی کو کھلا رہے گا جس سے تاریک ہونا چاہیے۔ کیوں از راہ اعتراض
ہے نہ کہ بطریق سوال۔

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

مجھے غربت میں کیا خوشی ہو جب زمانہ کے حوادث کا یہ حال ہو کہ نامہ بر وطن سے جو
خط لاتا ہے وہ اکثر کھلا ہوا ہوتا ہے اور کھلے خط میں اکثر اخبار بد لکھتے ہیں دوسرے معنی
یہ بھی ہیں کہ مجھے غربت میں کیا خوشی نصیب ہو سکتی ہے جب نامہ بر وطن سے اکثر خط کھلے
ہوئے لاتا ہے یعنی میرے اعزا اور میرے دوست بھی مجھے کسی خاص راز کے لکھنے کی قابل
نہیں سمجھتے مگر پہلے معانی زیادہ اچھے اور مناسب ہیں۔

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

نعت کا شعر ہے یعنی اے غالب میرے کام کیوں بند رہیں میں اُس رسولؐ کی امت
میں ہوں جس کے واسطے آسمان کا گنبد بے در کھل گیا۔ ایہام ہے قصہ معراج کی طرف
بہت اچھا شعر ہے اور کیا کہوں۔

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

رات میں اس قدر بیتاب تھا اور اس قدر میرے دل میں سوز پیدا ہو گیا تھا کہ اس کو
دیکھ کر گھٹا کا پتہ پانی ہو رہا تھا اور اشیر کو میرے سوز دل کی تاثیر یہ تھی کہ اس پانی میں جو

حلقۂ گرداب پڑتا تھا وہ شعلۂ جوالہ تھا۔

وان کرم کو عذر بارش تھا عنان گیر خرام گریہ سے یان پنبۂ بالش کف سیلاب تھا

یہان سے مصنف اپنی اور معشوق کی حالت کا تقابل کرتا ہے جس کے لیے الفاظ اور حالات اور سب مناسب چیزین لائی گئی ہین کہتا ہے کہ چونکہ زہرہ ابر آب ہو رہا تھا اور پانی بھی برس رہا تھا اس لیے اُنکے کرم کو بارش کا عذر مانع تھا یعنی وہ تو بوجہ بارش کے میرے یہان نہ آسکتے تھے اور یہان رونے سے تکیہ کی روئی کف سیلاب بنی ہوئی تھی یا کف سیلاب تکیہ کی روئی تھی یعنی روئی کا تکیہ بہا بہا پھرتا تھا۔ اور پانی سیل مین اس قدر جھاگ تھی کہ روئی معلوم ہوتی تھی یہ تمائیل نہایت مناسب ہین۔

وان خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یان ہجوم اشک مین تار نگہ نایاب تھا

وہ اپنی خود آرائی اور زیبایش کے خیال سے موتی پرو رہے تھے اور یہان ہجوم اشک اس قدر تھا کہ تار نظر بھی چھپ گیا تھا۔ آنسو کو موتی سے تشبیہ دیتے ہین اور تار نگہ سے استعارہ کرتے ہین مگر یہان یہی لطف ہے کہ مصنف نے تشبیہ نہین دی ہے حالت کا تقابل کر کے پوری تمثیل دیدی۔

جلوۂ گل نے کیا تھا وان چراغان آب جو یان روان مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

وہان جلوۂ گل تھا اور اُس کے عکس سے پانی مین چراغان کا تماشہ دکھائی دیتا تھا اور یہان جوے چشم تر تھی اور اس سے خون خالص روان ہو رہا تھا اور لہو کی بوندین جو پلکون پہ پڑی ہین شاخ گل معلوم ہوتی تہین۔

یان نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بیخودی جلوۂ گل وان بساط صحبت احباب تھا

ہماری بیخودی کی بزم مین آہ کی شمع روشن تھی اور وہان صحبت احباب کے لیے پھولون کا فرش بچھا ہوا تھا۔

فرش سے تا عرش وان طوفان تھا موج رنگ کا یان زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا

وہاں طوفان رنگ کا جوش و خروش فرش سے عرش تک تھا یان زمین سے آسمان تک آگ لگا دینے کے قابل تھا۔

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

میرا دل جس کو کاوش ناخن میں مزا آ رہا تھا اس طرح سے آنکھوں سے خون ٹپکانے لگا یعنی ایسی حالت میں میں نے یہ غزل کہی۔

۱۰ نالۂ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا تھا سپند بزم وصل غیر گو بیتاب تھا

میرے نالۂ دل میں انداز اثر بالکل نہ تھا کیونکہ اگرچہ میں اس نالہ سے بیتاب ہو کر جل رہا تھا مگر یہ ادہ جلنا بزم غیر کی اور زینت بڑھاتا تھا اور وہاں میرا جلنا سپند کا کام کر رہا تھا یعنی میرے نالہ اور بیتابی کا اثر الٹا تھا۔ سپند دفع نظر بد کے لئے جلاتے ہیں۔

اسی مضمون کو تھوڑے سے تغیر سے دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

دو چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ نغمہ ہو جاتا ہے گر نالہ بھی میرا جائے ہے

ایسا ہی ایک مضمون اور ہے۔ ؎

اُف اثر کا مری آہوں سے ہوا ہو جاتا جاتے جاتے تیرے کوچہ میں صبا ہو جانا

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

سیلاب کے آنے سے میرے دل کو کیا خوشی ہو رہی ہے عاشق کا گھر شاید صدائے آب کا ساز تھا یعنی جس طرح سے ساز و صدا وغیرہ باعث طرب ہے اسی طرح صدائے سیل آب کے واسطے اس کا گھر گویا سانہ ہو گیا جس سے عاشق کو خوشی ہوئی مطلب یہ ہے کہ عاشق اپنی ویرانی کے سامان کو سامان طرب سمجھتا ہے اور اپنی بربادی سے خوش ہوتا ہے۔

نازش ایام خاکستر نشینی کیا کہوں پہلوئے اندیشہ وقف بستر سنجاب تھا ۱۱

مولانا علی حیدر صاحب نظم اس کی شرح یوں فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں خاک نشین تھا لیکن میرا دل قناعت کے تخم و ناز کے سبب سے فرش سنجاب پر لوٹ رہا تھا مگر میرے نزدیک غالب کا

مطلب یہ ہے کہ خاک نشینی کے ایام کا فخر و ناز کیا بیان کروں کہ اُس زمانے میں ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ کبھی ہم بھی بستر قاقم و سنجاب پر تھے - اور اس طرح سے خیالِ عیش کف عیش بنا ہوا تھا مگر افسوس کہ اب وہ زمانہ بھی نہ رہا۔ یہ معانی اندیشہ کے لفظ سے پیدا ہوئے اور غالب کا یہی انداز بیان اکثر جگہ پایا جاتا ہے مثلاً۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

ان دونوں شعروں میں ترقی مدارج مقصود ہے -

منشی غلام اللہ صاحب بسمل خلف منشی سرفراز علی کنبوہ ساکن بانس بریلی شاگرد مرزا غالب مرحوم نے بھی اسی زمین میں بالکل اسی رنگ کا اتباع کرتے ہوئے ایک غزل لکھی ہے - اس میں شک نہیں کہ حقِ شاگردی کو خوب ادا کیا ہے - ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے

شب فورِ اشک گردوں کفِ سیلاب تھا — دورۂ چشم کو آب حلقہ گرداب تھا
واں حنا بندی عنانِ گیر خرامِ ناز تھی — یاں ان کا سیدہ غرقِ اشکِ خوں ناب تھا
شمع بزمِ عیش تھا واں خندۂ دنداں نما — اشک جو آنکھوں سے ٹپکا یاں وہ خونِ ناب تھا
واں رخِ پر نور تھا صبحِ امیدِ زندگی — یاں ہر اک داغِ جگر خورشیدِ عالمتاب تھا
واں نگاہِ سرمہ آلودہ بھی تکیں بہ سالِ — موجزن یاں چشمِ تر سے خون کا سیلاب تھا
یاں دلِ شوریدہ کو سر پھوڑنے کا تھا خیال — زیرِ سر واں تکیۂ زانو برائے خواب تھا
دیدۂ بیخواب تھا یاں ہائے محوِ انتظار — بسترِ راحت کے لیے واں قاقم و سنجاب تھا
حسن تمکیں آزما کو پاسِ خودداری وہاں — نالۂ آتشِ عشق کو مجھ تک یاں آداب تھا
انکو پاسِ ننگ دامنگیر مجھکو پاسِ وضع — وہ اُدھر بیتاب تھے اور یاں اِدھر بیتاب تھا
ہو گیا بسمل خستہ یوں آج سرگرمِ سخن — ایک مدت سے نوا سنجی کو دل بیتاب تھا
دیدۂ بے خواب کو شب تھا کسی کا انتظار — کان آہٹ پر تھے واں مژگاں خوں ناب تھا
ہائے اس بے تاب و ناتواں پر تو ہوا تیغ آزما — نشترِ قضا و جنبشِ قصاب تھا
کسکو جوں خنجر جھکتی ہے ادا مغرور کی گردن ادھر — خنجرِ خمدارِ قاتل صورتِ محراب تھا
ہو گیا سانحہ دل اب کہاں وہ شعلہ تعلق اب کہاں — نغمۂ بلبل فسانہ جلوۂ گل خواب تھا

میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر
بسترِ سنجاب تھا نے بالشِ کم خواب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں — ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

کچھ نہ کرنا ایک محاورہ ہے جو کوتاہی کرنے کے معنی میں مستعمل ہے کہتا ہے کہ میرے جنون نے نارسائی کی اور اپنی حد پر نہ پہونچ سکا ورنہ حد جنون کے مقام کا ایک ایک ذرہ رشک خورشید عالمتاب تھا۔ مولوی علی حیدر صاحب یہ کہتے ہیں کہ جنون نارسا نے کچھ نہ کیا یعنی اکتساب فیض سے اور سجاد معشوق سے محروم رکھا ورنہ ایک ایک ذرہ نے ایسا اکتساب نور کیا تھا کہ بشک وہ آفتاب تھا اس میں حالات ماضی کا خیال کیا گیا ہے اور یہ نا ممکن ہے۔
اگر زیادہ غور کیا جائے تو یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ جہاں یعنی جس مقام تک جنون پہونچ چکا تھا اس مقام کا ذرہ بھی روکش خورشید عالم تاب تھا۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے — کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

آج اپنے قیدیوں کی تجھے پروا کیوں نہیں کل تلک تیرے دل میں بھی محبت تھی اس شعر میں خصوصیت سے یہ دو لفظ قابل ذکر ہیں تلک یہ اب متروک ہے اور فصحا بجائے اس کے تک استعمال کرتے ہیں۔ باب مہر و وفا فارسی کا محاورہ ہے اردو کی زبان اس کی متحمل نہیں ہے

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا — انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

پہلے شعر کے ثبوت میں یہ شعر لکھا گیا ہے اول جو بیان کیا ہے کہ کل تلک تیرا دل بھی باب مہر و وفا تھا کہ تیرے دام کا ہر حلقہ انتظار صید میں ایک دیدہ بیتاب بنا ہوا تھا اس شعر میں مرزا نے چشم معشوق کو اسی کے دام کا حلقہ بنایا ہے ایک جگہ اپنی آنکھوں کو معشوق کے دام کا حلقہ قرار دیا ہے وہ یہ ہے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر — یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے — اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

گویا غالب کوئی دوسرا شخص ہے جس کو روکا گیا اور جس کا سیل نالہ اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ آسمان کف سیلاب بننے والا تھا۔

دیکھئے اس سیل گریہ کے مضمون کو اسی غزل میں دوسرے انداز سے باندھ چکے ہیں سچ یہ ہے کہ قادر الکلامی اسی کا نام ہے۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

اس شعر کے یہ دونوں معنی ہو سکتے ہیں کہ خون جگر یار کی پلکوں کی امانت تھا۔ اور وہ ایک ایک قطرہ بہانا پڑا یہی معنی مولانا نظم نے لکھے ہیں مگر میرے نزدیک یہ معنی اور بھی اچھے ہیں اور مناسب حال ہیں مجھے حساب دینا پڑا حساب دینا اس وقت پڑتا ہے۔ اور حساب نہیں ہوتا ہے کہ جہاں کوئی اغفلت یا غبن وغیرہ پایا جاتا ہے یا کوئی بدنظمی ہوتی ہے اسی وجہ سے مصنف کہتا ہے کہ میں بیقراری ہی میں بہت سا خون جگر بہا چکا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی اس کی یاد مژہ کی کاوش اور محبت نے مجھے چین نہ لینے دیا اور جس قدر میں خون رو چکا تھا اتنا ہی پھر خون رلایا اور اسی سے اندازہ ہے میں مجھے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ گویا یہ شعر بطور افسوس کے ہے۔ تھوڑے سے اور بدل سے دوسری جگہ کہتے ہیں کہ ؎

بلا سے گر مژہ یار تشنہ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خوں فشاں کیلئے

یعنی اگر اس کی مژہ کا عشق خون رلائے گا تو رلائے مگر میں اپنی مژگان کی عادت کے لیے بھی کچھ بچا رکھوں۔

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

تو نے میرے دل کو توڑ کر مجھے مصیبت میں ڈال دیا کیونکہ میرا دل گویا ایک آئینہ تھا جس میں ایک شہر یعنی بہت سی آرزوؤں کی تصویریں تھیں۔ اور اس کے ٹوٹنے سے سب مٹ گئیں اور ایک دل کے ساتھ مجھے ایک شہر کا ماتم کرنا پڑ گیا۔ مولانا نظم اس کی یہ شرح لکھتے ہیں۔ (میرے نزدیک صحیح نہیں ہیں (اور وہ یہ ہے کہ وہ لکھتے ہیں) قاعدہ ہے کہ آئینہ میں ایک شکل نظر آتی رہتا ہے لیکن جب شیشہ توڑ ڈالو تو ہر ٹکڑے میں وہی پورا عکس نظر ہونے لگتا ہے اور یہاں ہر پارہ مجلس دیکھ کر ایک ایک آرزو کا خون ہوتا ہے غرضکہ

جس آئینہ میں معشوق کے عکس و تمثال کا جلوہ تھا اُس کے ٹوٹنے سے ایک شہر آرزو کا
خون ہو گیا یہ کیا ہوا مضمون ہے سب

نظر آتے کبھی کا ہیکو ک جا خون بنا لیتے — بس اتفاق آئینہ اسکے روبرو ٹوٹا

ایک شہر آرزو میں ویسی ہی ترکیب ہے جیسے بیابان ماندگی۔ اور یک قدم وحشت میں۔ میرے نزدیک اس ترکیب کی تمثیل ان تماثیل سے صحیح نہیں۔ بلکہ یہاں کثرت افراد ہے اور وہاں وحدت مقصود ہے۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — دلدادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

بے انتہا بلیغ شعر ہے اس میں مصنف نے اک سامان حسرت دکھانا چاہا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھے اسکا بڑا شوق تھا کہ سڑکوں اور شاہراہوں کی ہوا کھاتا پھروں۔ اور یہ امرا و شرفا کے شہر کا طریق ہی ہے کہ شام و صبح کو ہوا کھانے کے لیے نکل جایا کرتے ہیں تو اب مرنے پر یہ سزا دو کہ میری نعش کو گلیوں میں کھینچے پھرو اور اس صورت سے میری نازک دماغی اور میرے شوق کو لوگوں پر اظہار کرکے۔ دنیا سے ناکام اور یہاں کے تمام شوقوں سے انکو حسرت دلاؤ کہ یہ ایسا تھا اور اب یہ اتنا مجبور اور بے بس ہو گیا یہ کہ میرا حالت زندگی میں بھی جنونوں کی تھی بعد مرگ بھی ہی
مولانا نظم اس کے یہ معنی لکھتے ہیں۔ ہوا کے معنی آرزو۔ رہ گذار سے رہ گذار معشوق مراد ہے۔ مگر یہاں اگر ہوا کے معنی آرزو کے لیے جائینگے۔ تو دلدادہ جس کے معنی خود آرزومند اور عاشق کے ہیں بیکار ہو جائے گا۔ اور شعر اک ان مل بے جوڑ سے زیادہ وقیع نہ ہوگا۔

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال — ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا

شرح نظم صاحب ملاحظہ ہو جس طرح تلوار میں جوہر آبدار ہوتے ہیں اسی طرح موج سراب کے ذرے تھے۔ حاصل یہ کہ سرزمین عشق پر تلوار برستی ہے بس۔ حالانکہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ موج سراب دشت وفا کی کیفیت نہ پوچھ کہ اس نے کیا کیا ستم کیے گویا کہ اسکا ہر ایک ذرہ ایک جوہر تیغ تیز تھا جس نے آرزوؤں کا خون کر دیا۔ سراب اس کو کہتے ہیں کہ کہیں صاف شفاف جگہ پر کسی مسافر کو پانی کا دھوکہ ہو جائے۔ اور یہ اکثر ریگستان میں ہو جاتا ہے تو گویا مصنف کہتا ہو کہ میں گویا آرام اور محبت کا ایک پیاسا مسافر تھا اور معشوق کی وفا کی صورت پر دھوکہ کھا

وفا نہ تھی۔ بلکہ سراب وفا تھا جس سے مجھے صرف وفا کا دہوکا ہی دہوکا تھا یعنی محبت اور آرام کی اس مسافر کی طرح تمنا رکھتا تھا جو پیاسا ہو اور اس کو کسی جگہ پر پانی کا دہوکہ ہو اور اس سے وہ خوش ہو جائے مگر جب قریب پہونچے اور بجائے پانی کے وہ زمین دیکھ کر جلتے جی مر جائے اسی طرح اس سراب دشت وفا کے ذرہ ذرہ نے جو معشوق کی طرف سے مجھے نظر پڑتی تھی قتل کردیا یعنی اس کی جھوٹی تسکین اور وعدہ خلافی نے مجھے مار ڈالا۔ یا اگر وفا کو معشوق کی وفا سمجھا جائے تو دوسرا پہلو یہ نکلتا ہے کہ مجھے اپنی وفا سے کیا کیا امیدیں تہیں یعنی جذبہ کی توقع۔ اور معشوق کی جانب سے بہی وفا کی امید تہی۔ مگر وہ صرف ایک سراب نکلا۔ اور میری وفا بیکار رہی۔ اور میرے دشت وفا کے ذرہ ذرہ نے مجھی کو قتل کیا۔

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب   دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

ہم سمجھتے تھے کہ غم عشق کچھ کم ہے۔ مگر کم ہونے پر ایک زمانہ کا غم نکلا یعنی بہت نکلا یا یہ سمجھیے کہ ہم سمجھے تھے کہ غم عشق اب کم ہوا ہے اب ہم کو آرام ملیگا۔ مگر اب دیکھا تو کم ہونے پر غم دنیا نے گھیر لیا۔ گویا ایک آفت سے چھوٹے تو دوسری میں پڑ گئے ؎۔

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا   پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

مگر مرجح پہلے معنی ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

چونکہ ہر کام کا آسان ہونا مشکل ہے لہذا ہر آدمی کبھی آدمی نہیں کہا جا سکتا ؎

انچہ چشم کم دیدیم و بسیار است و نیست   نیست جز انسان درین عالم کہ بسیار است و نیست

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی   در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

سیل گریہ میرے کاشانہ کی خرابی چاہتا ہے اور در و دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اب یہ کوئی دن میں بیابان ہو جائے گا۔

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھکو   آپ جانا ادہر اور آپ ہی حیراں ہونا

ہائے شوق کی دیوانگی کہ دمبدم یہ مجکو تیری گلی مین لیجاتا ہے اور پھر آپ ہی آپ حیران ہوتا ہون کہ ہائے مین یہان کیون آیا تھا۔ ایک شعر بالکل اسی مضمون کا مجھے یاد ہے

یہ شوق تھا کہ جنون تھا کہ تیرے کوچہ مین
ہزار بار گئے ہم ہزار بار آکے

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگان ہونا

چونکہ اُسکے جلوے مین یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر ایک سے ایک نگاہ کا تقاضا کرتا ہے تو جب اُس نے آئینہ دیکھا جس مین اُس کے چہرے کا عکس پڑا اور اُس کا ظہور ہوا تو گویا وہ اُسکا جلوہ ہوا اور اسی سے اس آئینہ کے جوہر مین یہ خاصیت ہو گئی ہے کہ وہ بھی مژگانی کرنے لگا ہے یا اُسکے جلوہ کی خاصیت سے مژگان بنا چاہتا ہے۔ یا آسان ایک یہ بھی معنی ہین کہ چونکہ اسکا جلوہ نگاہ کا تقاضا کرتا ہے تو آئینہ آنکھ بن گیا ہے کہ اُسکو دیکھے اور اُس کا جوہر اُس آنکھ کی پلکین بننا چاہتا ہے کسی کا ایک شعر پہلے مصرع کے مضمون سے لڑا بھڑتا ہے۔

چاہا تھا اُسکے جلوہ نے اک وعدہ نگاہ
ہم اپنے دل کو دیکھ کے خاموش ہو گئے

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریان ہونا

قتل گاہ تک اہلِ تمنا کے جانے کی خوشی نہ پوچھ گویا قاتل کی تلوار کو دیکھکر انکو ہلال عید کے دیکھنے کی خوشی ہو رہی ہے عید نظارہ۔ ترکیب مقلوب ہے اور یہان مصنف ہلال نظارہ عید کہنا چاہتا تھا۔ مگر معلوم نہین کس وجہ سے نہ کہہ سکا ایک شعر ہے۔ لا اعلم

آؤ کہ سب سے ہی گلے مل لین ہم آج اے حسرت
ہے ہلال عید جو خنجر کفِ قاتل مین ہے

لے گئے خاک مین ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستان ہونا

یعنی ہم تو خوشی کی تمنا مین مر گئے خدا کرے تو ہمیشہ خوش و خرم رہے

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکدان ہونا

تمنا کا زخم کھانا پارۂ دل کے لیے سامانِ عشرت اور زخم جگر کے واسطے نمکدان مین غرق

ہونا یعنی اسیر نمک چھڑکا جانا اُسکے لیے سامان لذت ہے۔ زخم کے لیے نمک اور نمک کی وجہ سے لذت اور تمنا کے لیے عشرت لایا گیا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

میرے قتل کے بعد اُس نے ظلم سے توبہ کر لی ہائے کیا جلد اپنی بُری عادت سے پشیمان ہوا ہے جب کام اختیار سے باہر ہو چکا ہے۔ اگر یہی معنی لیے جائیں تو یہ شعر صحیح اور از راہ تشنیع ہے۔ اسی سے یہ بھی معنی پیدا ہوتے ہیں کہ وہ بڑا زود پشیمان نکلا۔ اور بہت جلد اُس نے توبہ کی میں قتل ہو ہی چکا تھا۔ اور اب رقیبوں کی باری آئی تھی کہ وہ پشیمان ہو کر توبہ کر بیٹھا۔ اگر پہلے معانی پسند ہوں تو ایک شعر حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کا سنیے جس میں داد فصاحت دی گئی ہے اور یہی مضمون ہے۔ ایسے فرماتے ہیں کہ ؎

آفرین بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریبان ہونا

اس کے صاف صاف معنی تو یہ ہیں کہ اس چار گرہ کپڑے کی قسمت پر افسوس ہے جسکی تقدیر میں عاشق کا گریبان ہونا لکھا ہو۔ مگر دراصل یہ قصہ طلب شعر ہے۔ غالبؔ مرحوم جب جوسر بازی کی بدولت قید میں رہے تھے اور کپڑے بہت میلے ہو گئے تھے تو اسیر ایک مرتبہ یہ شعر کہا ہے ؎

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اور جس دن اس زندان تیرہ و تار سے نجات پائی کپڑے تبدیل کیے پرانے و پھرانے میلے کچیلے کپڑے پھاڑ پھینکے اور ساتھ ہی یہ شعر کہا۔

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

رات کو ساقی کے شوق نے وہ قیامت برپا کر رکھی تھی کہ مجلو دریائے شراب تک صورت خانۂ خمیازہ یعنی انگڑائی کی شکل پر نظر آتا تھا۔ چونکہ شوق میں ایک انتشار رہتا ہے اور خمار بھی ایک تکلیف دہ چیز ہے اسواسطے شوق کو خمار سے تشبیہ دی اور چونکہ وہ شوق ساقی کا تھا۔

اسواسطے اس کو خار کہنا اور بہی اچھا ہے یعنی میری جا ئیان اتنی اتنی لمبی تہین کہ وہ دریاے شراب تک پہونچ گئی تہین ۔

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکان کھلا
جادہ اجزاے دو عالم دشت کا شیرازہ تہا

یک قدم وحشت یعنی تہوڑی ہی وحشت ۔ یا وحشت کے ایک قدم چلنے سے گویا دفتر امکان کی مین نے سیر کر لی ۔ گویا وہ جادہ جسپر مین نے وحشت مین قدم رکھا تہا جادہ نہ تہا ۔ بلکہ وہ جادہ ایک شیرازہ تہا جس مین اجزاے پریشان ہر دو عالم منسلک تہے ۔ اس مین اپنی وحشت کی زیادتی اور عظمت دکہانا مقصود ہے کہ حالانکہ مین ایک ہی قدم چلا یعنی بہت کم میری وحشت کا ظہور ہوا ۔ مگر اس کم وحشت مین مین نے ہر دو عالم کو روند ڈالا ۔ اگرچہ مولانا علی حیدر صاحب نے اس مین کہینچ تان کر تصوف کے معانی پیدا کر دیے ہین مگر مین کہتا ہون کہ یہ مرزا کا خاص مضمون ہے اور ایسے ہی مضامین اور خیالات کا انہون نے کئی جگہ اظہار کیا ہے مثلاً ۔ ایک جگہ فرماتے ہین ؎

دریاے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بہی ابہی تر نہوا تہا

اور کئی جگہ علی ہذا ۔
جادہ کو شیرازہ سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ نہایت نازک ہے اس سے پہلی غزلون مین بہی لکہ چکے ہین کہ ؎

نظر مین ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشان کا

مانع وحشت خرامی ہاے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تہا

جناب نظم صاحب اس شعر کے یہ معنی تحریر فرماتے ہین ۔ کہ مصنف نے صحرا گرد مجنون کی صفت ڈال کر اس کے گہر کا پتہ بتا دیا ۔ یعنی مجنون کا گہر تو صحرا ہے اور صحرا وہ گہر ہے جسمین دروازہ نہین پہر لیلیٰ کیون نہین وحشی ہو کر اس کے پاس چلی آئی کون اسے مانع ہے ۔ میرے نزدیک اگر وہ معنی غلط نہین ہین تو نہون مگر مندرجہ ذیل معانی اس سے زیادہ فصیح ہین اور انکی صحت پر غالب کے طرز بیان کو مین گواہ بناتا ہون ۔

یعنی اگر مجنون اپنے گہر مین قید تہا ۔ یا ایسے گہر مین رہتا تہا کہ جسمین دروازہ نہ تہا ۔ اور

اس سبب سے وہ کہیں آجا نہ سکتا تھا۔ اور اس سبب سے وحشت سے باز رہتا [illegible] تو مجبور تھا مگر لیلے جس کے گھر میں دروازہ بھی موجود تھا اور نکل سکتی تھی اور وحشت خرامی کر سکتی تھی اس کو کون مانع آتا تھا کہ وہ جنگلوں میں نہیں نکلجاتی تھی۔ اسپر جذبۂ عشق مجنون کا اثر ہونا چاہیئے تھا۔ اور مجنون کی قید او جنون کی وجہ سے اس کو معذرت ہونی چاہیئے تھی۔

یہ مصنف کا خاص انداز بیان ہے ان کے متعدد اشعار اس رنگ کے موجود ہیں جنمیں وہ معشوق کو عاشق کے مقابلہ میں گنہگار قرار دیتے ہیں۔ اہل نظر غور فرمائیں ؎

جلوہ گاہ آتش دوزخ ہمارا دل سہی　　فتنۂ شور قیامت کسکی آب و گل میں ہے
بخود بوقت ذبح طپیدن گناہ ما　　دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن　　دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

حسن ہر چند کہ مستغنی ہے مگر اس کے استغنا کی رسوائیاں کچھ نہ پوچھیئے۔ ہاتھ مہندی کا اور رخسارہ غازہ کا مرہون احسان ہے اور یہ احسان باعث رسوائی ہے۔

نواب مرزا خان داغ دہلوی مرحوم ایک جگہ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

اپنی صورت پہ جو نازاں ہو گوارا کیا ہے　　آنکھ نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

نالۂ دل نے دیئے اوراق لخت دل بباد　　یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

میرے نالۂ دل نے لخت دل کے اوراق کو یعنی دل [صد]پارہ کو پریشان کر دیا۔ گویا نالہ ایک شاعر تھا جس کا دیوان دل پریشان تھا۔ اس نے اس کو جو [illegible] ایک یادگار تھا اس کو خود برباد کر دیا۔ بباد دادن فارسی کا محاورہ ہے۔ اردو میں برباد کرنا۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

دوست اقربا میری کیا غمخواری کر سکتے ہیں اب میرے ناخن تراش کر مرہم لگا رہا ہے اور اپنی تدبیر پر نازاں ہو گئے ہیں میں کہتا ہوں کہ جب تک یہ زخم بھریگا میرے ناخن بھی بڑھ جائینگے اور میں پھر اس زخم کو نوچ ڈالونگا۔ ایسے شعر اردو کے لیے مایہ ناز ہیں۔ اور غالب کو غالب انہیں اشعار نے بنا دیا ہے۔ ناطق گرانی کہتے ہیں ؎

انزت از ور دیسکہ دل ز امن گرفت   ناخن زدوم بداغ اگر بہ شدن گرفت

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک   ہم کہینگے حال دل اور آپ فرمائینگے کیا

یعنی استغنا اور بے نیازی کی بھی کوئی حد ہوتی ہو اور اب آپکی بے نیازی حد سے گذر گئی - اب کبتک آپ میرا حال دل سنکر کیا کیا کہے جائینگے اور تجاہل عارفانہ سے کام لینگے - ایک جگہ اور فرماتے ہین کہ ؎

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا   کہانتک اے سراپا ناز کیا کیا

؎ اور

حد چاہیے سزا مین عقوبت کیواسطے   آخر گناہگار ہون کافر نہین ہون مین

حضرت ناصح گر آئین دیدہ و دل فرش راہ   کوئی مجکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

اگر حضرت ناصح تشریف لاتے ہین تو بسم اللہ بسر و چشم تشریف لائین - مگر کوئی للہ مجھے یہ تو سمجھا دے کہ وہ مجکو کیا سمجھائینگے یعنی کیا مجھے انھون نے ناسمجھ خیال کر رکھا ہے مین ناسمجھ نہین ہون سب سمجھتا ہون مگر عشق سے مجبور ہون اس مین میرا کوئی اختیار نہین ہے - ایک اور جگہ فرماتے ہین ؎

جانتا ہون ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت ادہر نہین آتی

اسی مضمون کو ادنی تغیر کے ساتھ مولانا حالی مرحوم فرماتے ہین ؎

وہ سب باتون کی ہے ناصح خبر   مجھے سمجھائے کو ہم سمجھائینگے کیا

آج وان تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہون مین   عذر میرے قتل کرنے مین وہ اب لائینگے کیا

یعنی روزانہ وہ سے مرزا پاس
خنجر لیکر جو پاس آتے تھے تو ہمکو نہین پاتے   اور ہم کو جو پاتے ہین تو خنجر نہین ملتا
مگر دیکھین آج کیا عذر کرین گے ہم تو تلوار اور کفن سب ساتھ لیکر جاتے ہین اسی مضمون کو مولانا عرفی نے نہایت عمدہ طریقہ سے ادا کیا ہے جس کا جواب نہین فرماتے ہین کہ ؎

مشتاق ام بہر بہانہ کشتہ کن باتیغ و کفن   تا در خانہ جلاد و مقتل خویش رسم

عرفی کے یہان دو لفظ شعر مین ایسے ہین کہ جن سے شعر کا پایا بہت عالی ہو گیا ہے سینہ جان گشتہ اور غزلخوان۔

گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا یون سہی یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

اگر ناصح نے ہم کو قید کر دیا۔ اچھا یہی سہی۔ مگر کیا اس قید سے وہ جنون جاتا رہے گا جو عشق نے مجھ مین پیدا کر دیا ہے۔ دوسرے مصرع مین استفہام انکاری و استخباری ہے۔ یعنی نہین چھوٹ سکتے۔ اگر غالب پر الفاظ کے جمع کرنے کی تہمت لگائی جائے تو یہ بھی سمجھ لیجئے کہ چھٹنا اور قید ہونا بھی دونون اچھے لفظ ہین جنکے جمع ہونے سے اک لطف پیدا ہو گیا ہے یہ ایک عام مضمون ہے مگر یہان نہایت خوبی سے ادا ہوا ہے۔

خانہ زاد زلف ہین زنجیر سے بھاگینگے کیون ہین گرفتار وفا زندان سے گھبرائینگے کیا

ہم زلف کے (جو زنجیر سے زیادہ ہے) غلام خانہ زاد ہین تو زنجیر سے کیا بھاگینگے۔ ہم قید گرفتاری سے کیا گھبرائین گے۔ کہ وفا کے پابند ہین جو قید سے بھی زیادہ ہے یعنی ناصح ہم کو زنجیر اور قید سے کیا ڈراتا ہے ہم کو ان سے زیادہ چیزون سے سابقہ پڑا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب ہم زلف اور وفا کے عاشق ہین تو ان چیزون سے کیا گھبرائین یہ تو اس کا نتیجہ ہین

ہے اب اس معمورہ مین قحط غم الفت اسد ہمنے یہ مانا کہ دلی مین رہین کھائینگے کیا

دلی سے محبت اٹھ گئی اور یہان غم الفت کہین نہین اس کا قحط ہے تو ہم جو غم الفت کھانے کے عادی ہین یہان رہ کر کیا کھائین کیونکہ وہ یہان نایاب ہے لا محالہ ہم کو یہ شہر چھوڑ دینا پڑے گا۔ کیونکہ ؎

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثے است صحیح نتوان مرد بہ سختی کہ من اینجا زادم

جناب نظم یون فرماتے ہین ہمین غم کھانے کا ضرر اٹھانا ہوا ہے اور وہ بھی یہان نہین ہے یعنی اس شہر مین ایسے معشوق نہین ہین جن سے محبت کیجئے۔ حسرت صاحب نے بھی یہی شرح لکھی ہے میرے نزدیک اس مین ایک قباحت ہے۔ وہ یہ کہ جناب حسرت صاحب نے محض معشوقون کو خاص کر دیا ہے۔ اور قحط ایک عام وبا ہے یعنی اگر معشوق نہین ہین تو دیگر اعزا اقربا کا

غم بھی کھانے کو نہین ملتا۔ یہان الفت سے محض عشق مراد نہین ہے بلکہ باہمی تعلقات ہین۔ واللہ اعلم۔ ناظرین جیسے چاہین صحیح سمجھین۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت جو وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ہماری قسمت مین اس سے ملنا نہ لکھا تھا۔ ابتک جیتے رہے اور اس کے وصل کا انتظار کیا۔ اگر اور بھی جیتے تو بھی انتظار ہی کرنا پڑتا وصل نہ ہوتا۔ اس زمین مین قریب قریب سب مشہور شعرا نے طبع آزمائیان کی ہین مگر مرزا غالب مرحوم نے دو ایک شعر ایسے کہے ہین جن کا جواب نہین۔

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یعنی ہم تیرے وعدہ کرنے سے جیے تو تو نے یہ سمجھکر جھوٹ جانا کہ اگر ہمارے وعدے کا اعتبار ہوتا تو تجھے شادی مرگ ہو جاتی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اے جان تیرے وعدہ کرنے پر جو ہم جیتے رہے تو تو سمجھ کہ ہم نے اس کو جھوٹ سمجھا کیونکہ اگر کہین ہم کو اس وعدہ کا اعتبار ہوتا تو ہم خوشی سے مر جاتے بہر حال شعر نہایت عمدہ ہے۔ ایک شعر اسی مضمون کا یاد نہین کس کا ہے

بیم از وفا دار و بدہ وعدہ کہ من
از ذوق وعدہ تو بفردا نمی رسم

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

چونکہ تو نازک ہے اس سبب سے تیرا عہد بھی نازک تھا یہ ہم کو اس وجہ سے معلوم ہوا کہ اگر وہ عہد مضبوط ہوتا تو تو اس کو نہ توڑ سکتا۔ کیونکہ نازک آدمی سے ایسا اہم کام نہین ہو سکتا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہان سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یعنی وہ تیر جسے تو نے آدھا کھینچکر چھوڑ دیا ہے اسے کوئی میرے دل سے پوچھے یعنی اس کی لذت سے بس میرا دل ہی واقف ہے کہ اگر یہ نیم کش نہ ہوتا اور تو پوری قوت سے اس کو چھوڑتا تو یہ جگر کے پار ہو جاتا اور خلش کا لطف باقی نہ رہتا۔ یہان تیر نیم کش سے مراد کنکھیون سے دیکھنا ہے۔ یہ شعر مقبول عام ہے۔ اور کوئی شک نہین کہ بیمثل کہا گیا ہے۔ جو کہ دا

دیتا ہی۔ اور اس سے دو جیم جمع ہو گئے ہین ۔ اور یہ عیب ہی مگر یہان برا نہین معلوم ہوتا۔ چستی بندش اسی کا نام ہی جو کی واو کا گرنا غیر فصیح نہین ہی بلکہ بھلا معلوم ہوتا ہی۔ ذوق مرحوم ایک جگہ ایسا ہی مضمون دوسرے پہلو سے نظم فرما گئے ہین وہ بھی بہت خوب ہی مگر غالب کا شعر مقبول عام ہی اور ایسی جگہ کہنا پڑتا ہی کہ خدا جسکو چاہی عزت دے۔ ذوق

شکر پردہ ہی مین اس بت کو حیا نے رکھا ۔۔۔ ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

ایک شعر ذوق مرحوم کے مضمون سے ملتا جلتا منشی امیر احمد صاحب مرحوم کے یہان بہت خوب ہے

شرم کو آپ کی اللہ سلامت رکھے ۔۔۔ شوخیون نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہوتا

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جاے کہ یہ دونون شعر غالب کے شعر سے ہم مضمون ہین بلکہ نہین کچھ کچھ فیما بین مشابہت ہی اور یہ محض تیرہمکش نے مجھے یاد دلا دیے ہین۔

یہ کہان کی دوستی ہی کہ بنے ہین دوست ناصح ۔۔۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

شاعرون کے لیے غمخوار دوست بھی ایک دشمن ہی اور ناصح کو تو ہمیشہ برا بھلا کہا ہی جاتا ہی اسکا ذکر ہی فضول ہی یہی غالب بھی کہتے ہین کہ یہ کہان کی دوستی ہی کہ دوست مجھے نصیحت کرنے بیٹھ گئے ہین یہ کہان کی دوستی ہی کہ دوست ناصح بنکر میری جان کھائے جاتے ہین۔ کوئی میری غمگساری کرتا کوئی میرے دکھ درد کا علاج کرتا۔

کہون کس سے مین کہ کیا ہی شب غم بری بلا ہی ۔۔۔ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

کس سے کہون اور کیا کہون کہ شب غم کیا چیز ہی اس مین مجھے روز سیکڑون بار موت آتی ہی اور مر نہین جاتا۔ اگر ایک بار مر کر اس عذاب سے نجات پا جاتا تو بہت اچھا تھا مگر ایسا نہین ہی مجھے کسی اور شخص کا ایک شعر یاد ہی جو اگر میرا قیاس غلطی نہین کرتا ہی تو ضرور اسی غالب کے شعر سے ماخوذ ہی ؎

نہ پوچھ ہجر کی راتون کی کاہشین ہمدم ۔۔۔ وہ کیا جئے گا جسے موت بار بار آئے

بقول مولانا نظم صاحب یہ شعر حد تحسین سے باہر ہے۔

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۔۔۔ جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

مصنف غم کی سختی اور برائی ایک دوسری تکلیف دہ چیز سے تشبیہ دیکر بیان کرتا ہے کہتا ہے جیسے تم سمجھے ہو اگر یہ شرارہ ہوکر پتھر میں چھپ جاتا تو پتھر سے لہو ٹپکتا یعنی پتھر بھی خون کے آنسو بہاتا اور ایسے آنسو بہاتا کہ پھر وہ آنسو تھم نہ سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں آگ کو چھپا سکتے مگر غم کو نہیں چھپا سکتے ہیں۔ پتھر سے تشبیہ دینے میں ایک یہ لطافت مدنظر رکھی ہے کہ سخت دل سے زیادہ سخت دل بھی غم کی برداشت نہیں کرسکتا ہے۔ یا یہ کہ شرارہ جو پتھر میں ہوتا ہے اگر یہ غم ہوتا تو پتھر اس کی برداشت نہ کرسکتا اور ہمیشہ اس سے خون ٹپکا کرتا۔

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

غم اگرچہ جان کا گھلا دینے والا ہوتا ہے مگر اس سے کوئی متنفس بچ بھی نہیں سکتا ہے کیونکہ دل موجود ہے اور دل کا خاصہ رنج و غم ہے اور وہ اس سے کبھی خالی نہیں رہ سکتا۔ اسی ہمکو عشق نے مار رکھا ہے مگر اس غم جانگسل کو ہم برا کیا سمجھیں اگر یہ غم نہ ہوتا تو اور کوئی غم ہوتا۔ غرضکہ جب تک دل ہے غم سے نجات نہیں پا سکتے (پہ) پر کے بجائے اب متروک ہے اور پہ بھی بجائے مگر اور لیکن کے غیر فصیح اور قابل ترک ہے ذکر میں کچھ برائی نہیں ہے مگر اچھا یہ ہے کہ اگر لکھا جائے یعنی

تری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہم مر کے رسوا ہوئے کہ جنازہ اٹھنے اور مزار بننے کی ضرورت پڑی۔ رسوائی یوں ہوئی کہ کوئی ہمارا جنازہ اٹھانے والا ہے نہ مزار بنانے کا کسی کو خیال ہے اس سے ہم بیکس اور خانماں خراب مشہور ہوئے اور دنیا کو ہماری بے خانمانی اور بیکسی کا پتہ چلا اور سب کو ہماری حالت کا اندازہ ہو گیا ورنہ کوئی جانتا تھا کوئی نہ جانتا تھا۔ کاش ہم کہیں دریا میں ڈوب جاتے کہ جنازہ اٹھنے اور مزار بننے کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور ہمارا حال کسی پر نہ کھلتا اور ہم بدنام نہ ہوتے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یعنی اگر ذات واحد میں دوئی پائی جاتی تو کبھی نہ کبھی تو وہ کسی کو دکھائی دیتا - دوچار

ہونے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ کبھی اُس کی کسی سے جنگ ہوتی اور یہ دلیل قرآنی سے بھی ہے۔
لو کان فیہما الہۃ الا اللہ لفسدتا یعنی اگر آسمان و زمین میں سوائے خدا کے اور
چند خدا ہوتے تو ضرور فساد ہوتا۔ کیونکہ چند طبیعتیں یا اختیارات مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ معترض
کر سکتا ہے۔ کہ اگر وہ باہم سلوک کر لیتے تو فساد نہ ہوتا۔ مگر اس کا یہ جواب ہے کہ صلح دو برابر والوں
میں نہیں ہو سکتی۔ ایک غالب ہوگا اور ایک مغلوب۔ اور جو مغلوب ہے وہ خدا نہیں ہے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب تو نے جو مسائلِ تصوف بیان کیے یہ ایسے مسائل ہیں کہ ہمیں اگر تو شراب خوار
نہ ہوتا تو ہم تجھکو ولی کامل سمجھتے۔ یا اگر تو شراب خوار نہ ہوتا تو پورا ولی تھا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مولانا نظم اس کے معانی یوں بیان فرماتے ہیں کہ رقیب بوالہوس کو نشاطِ کار و لطف
وصل نگار حاصل ہے اب ہمارے جینے کا کیا مزہ رہا۔ مصنف کی اصطلاح میں ہوس صحبت
رقیب کا نام ہے۔ دوسرا پہلو یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں انسان کو ہوا و ہوس سے رہائی نہیں
ہے اگر مرنا نہ ہوتا تو اس طرح کے جینے میں کوئی مزا نہ تھا یعنی حاصل زندگانی مرنا ہے۔ اور جناب
حسرت صاحب نے صرف یہ لکھا ہے نشاط کے معنی امنگ کے ہیں یعنی کام کرنے کی امنگ۔ مگر
میرے نزدیک اس کی ضرورت نہیں ہے کہ مصنف کی ایک خاص اصطلاح مقرر کی جائے۔
سیدھے سیدھے یہ معنی ہیں کہ حرص انسانی کو محض کام کرنے کی امنگ اور خوشی کا سبب یہ ہے
کہ مرنا لابدی ہے یعنی آدمی خوش ہوتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ بھی کر لیا اور وہ بھی کر لیا
اور میری زندگی میں یہ ہو جائے وہ ہو جائے۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو زندگی کا کوئی لطف نہ تھا کیونکہ
کسی کو کسی کام کے بنانے کی کوئی خوشی نہ ہوتی۔ نہ کسی کے دل میں امنگ باقی رہ جاتی۔ کیونکہ
ہر شخص مطمئن ہو کر آج کے کام کو کل پر اور کل کے کام کو پرسوں پر ٹال دیتا۔ اور سمجھتا کہ مرنا تو
ہے ہی نہیں جب چاہیں گے کر لیں گے۔ اس صورت میں نہ کوئی کام ہوتا نہ خوشی ہوتی۔
اور جینے کا مزا جو محض خوشی پر منحصر ہے باقی نہ رہتا۔ نہ زیست کا کوئی حاصل ہوتا۔ اس سے
معلوم ہوا کہ حاصل زندگی موت ہے۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا / کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

پہلے ایک شعر اسی مضمون کا آچکا ہے سے

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک / ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائینگے کیا

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں / شکایتہائے رنگیں کا گلا کیا

آپ جو رقیب پر بیجا عنایتیں فرماتے ہیں اور میں انہیں دیکھ کر شکایتیں کرتا ہوں اسکا آپ مجھ سے کیوں گلا کرتے ہیں بیجا نوازشیں دیکھکر کیونکر میں خاموش رہ سکتا ہوں یا یہ کہ میں آپ کی بیجا نوازشیں جو میرے حال پر ہوتی ہیں دیکھتا ہوں یعنی ظلم و ستم سہتا ہوں۔ پھر اس حال میں اگر آپ میری شکایتیں رنگین الفاظ میں کرتے ہیں تو ان کا تو میں کیا گلا کروں گا۔ سبب یہ ہے کہ میں بیجا نوازشیں دیکھتا ہوں تو آپ جو مجھ سے رنگین شکایتیں فرماتے ہیں انکا تحمل کیوں نہ کروں

نگاہ بے محابا چاہتا ہوں / تغافلہائے تمکیں آزما کیا

میری خواہش یہ ہے کہ تم مجھ پر بے تکلفانہ نظر ڈالو۔ مگر تم تغافل سے کام لیتے ہو اور میرے ضبط اور تحمل کا امتحان لینا چاہتے ہو۔ اسی غزل میں آگے چل کر اسی مضمون کو نہایت صاف طریقہ سے ادا کرتے ہیں سے

کیا کس نے جگرداری کا دعوے / شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے / ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

رقیب کا عشق عشق نہیں ہے وہ محض ہوس ہے۔ اور اس کو ناموس وفا کا کچھ خیال نہیں ہے اس کی محبت کی مثال ایک تنکے کے جلنے کی سی ہے کہ دم بھر جل کر روشنی دیتا ہے پھر کچھ نہیں بقول حضرت ناطق مدظلہ سے اہل ہوس کو درد محبت کہاں نصیب یہ مال انہیں نہیں ملتا پڑا ہوا۔

ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اس کی وفا کچھ بھی نہیں / چار دن کی چاندنی ہے اور کیا کچھ بھی نہیں

نفس موج محیط بیخودی ہے / تغافلہائے ساقی کا گلا کیا

ہماری ہر سانس دریائے بیخودی کی ایک موج ہے یعنی دمبدم بے ہوشی کا دورہ ہوتا ہے تو ہم کو ساقی کے تغافل کی کیا شکایت ہوسکتی ہے۔ اور اس کی کیا ضرورت ہے۔

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگیہائے صبا کیا

اگر مجھے پیراہن کے بسلنے کا دماغ ہوتا تو صبا کی آوارہ گردی کا غم ہوتا۔ کہ یہ بوئے گل کو پریشان کیوں کرتی پھرتی ہے اگر یہ جمع رہتی تو میرے پیراہن بسانے میں کام آتی۔ مگر مجھے پیراہن بسانے ہی کا دماغ نہیں ہے تو صبا کی اس حرکت بیجا کا کیا غم کروں۔ اسی زمین میں نواب مصطفیٰ خان صاحب شیفتہ کی ایک غزل ہے جس کو دیکھنے سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی یہ غزل دیکھکر کہی گئی ہے اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انھوں نے اس کے مضمون نقل کیے ہیں بلکہ غزل کا انداز بالکل یہی ہے چنانچہ صبا کا قافیہ اُن کے یہاں یہ ہے اور اس میں ایک آدھ لفظ ایسا ہے جو میرے خیال کی تائید کرتا ہے ؎

شمیمِ گل میں بوئے پیرہن ہے غلط ہے یہ کہ احسان صبا کیا

شیفتہ مرحوم کا شعر بہت بلیغ ہے۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ہر قطرہ سے صدائے انا البحر بلند ہو رہی ہے اور ہر ایک قطرہ اتحادِ دریا کا دعویدار ہے اسی طرح ہم بھی اپنے دریا کے ساتھ دعوائے اتحاد رکھتے ہیں ہم اُس میں سے یا اُس سے ہیں ہمارا کیا کہنا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دیا اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

شیفتہ اسی قافیہ کو یوں فرماتے ہیں ؎

ہیں تہا آپ قصدِ عرضِ احوال جو وہ خود پوچھتے ہیں پوچھنا کیا

غالب مرحوم کے یہاں نہایت عمدہ طریقہ سے اس قافیہ کو باندھا گیا ہے اور شیفتہ کے یہاں بالکل معمولی۔

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ شہیدانِ وفا کا خونبہا کیا

تجھے خوف ہی کہ اگر تو میری طرف دیکھے گا تو مین مرجاؤن گا۔ مگر نہین تو خوف نہ کر میری طرف دیکھ اگر مین شہید ہوجاؤن گا تو سمجھ خونبہا دینا نہ پڑے گا کیونکہ شہیدان وفا کا خونبہا ہوتا ہی نہین ہی (ادہر دیکھ) ایک محاورہ ہے جو محل تاکید پر مستعمل ہی مگر یہان یہ محاورہ دونون معنی پیدا کرتا ہے اور یہ سب صرف برمحل کی خوبی سے ہے شیفتہ مرحوم نے بھی قریب قریب یہی مضمون ادا کیا ہے مگر ان کے یہان بھی شعر کی بندش نہایت چست ہے جو کسی طرح غالب سے کم نہین ہی۔

فنائے عاشقان عین بقا ہے دیت زندون کی کیسی خونبہا کیا

کہتے ہین کہ تو عاشقون کو قتل کر انکا فنا ہونا عین بقا ہے اور جب وہ باقی ہین تو گویا زندہ ہین اور زندہ کی دیت اور خونبہا نہین دیا جاتا۔

سن اے غارتگر جنس وفا سن شکست قیمت دل کی صدا کیا

اے غارتگر جنس وفا۔ اے صدائے شکست قیمت دل کے شایق سن مگر شکست قیمت دل مین صدا کہان ہوتی ہے۔ یہان سن سے دونون معنی مفہوم ہوتے ہین کہ آ میری بات سن یا شکست قیمت دل کی صدا سن جسے تو سن نہین سکتا۔ مین نے کئی نسخون مین بجائے قیمت کے شیشہ دیکھا ہی اور وہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے شیشہ سے حسن شعر دوبالا ہوجائیگا سن سے یہ معنی مفہوم ہوتے ہین کہ بطور طنز اس کو تعبیر کیا جاے۔ یا کہا جاے کہ لے سن اگر تجھے دل کے ٹوٹنے کی صدا اچھی معلوم ہوتی ہی تو مین بھی شکست دل کی کچھ حقیقت نہین سمجھتا۔ نظم صاحب نے اپنی شرح مین موخر الذکر معنی لکھے ہین اور یہ بھی۔ کہ تو جو کہتا ہے کہ ہمین شکست دل کی خبر نہین تو کہین شکست دل مین آواز ہوتی ہی جو تجھے سنائی دیتی۔ بہرحال یہ شعر نہایت اچھا ہی۔

کیا کس نے جگرداری کا دعوی شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

یعنی مجھے یہ دعوی نہین ہی کہ تم مجھ سے جدا ہوجاؤ تو مین صبر کرسکون گا۔ مولانا حالی مرحوم فرماتے ہین سے ؎

[illegible]
[illegible]

یہ قاتل وعدہ صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

او قاتل او کافر تو ایسا وعدہ کیوں کرتا ہے جس میں مجھے صبر کی ضرورت پڑے تیرے نزدیک یہ وعدہ صبر آزما ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک فتنہ طاقت ربا ہے۔ یہ انداز بیان مرزا غالب کا حصہ ہے شیفتہ مرحوم نے بھی اس رنگ میں اسی انداز بیان سے کام لیکر ایک نہایت لطیف قطعہ کہا ہے۔ اور تقلید اور تتبع کا حق جیسا چاہیے ویسا ادا کیا ہے انتہا یہ ہے کہ اگر معلوم نہ ہو تو شاید کوئی معلوم نہ کر سکے کہ شیفتہ کا قطعہ ہے یا غالب کا تفریح طبع۔ ناظرین کے لیے میں اس کو یہاں نقل کرتا ہوں۔

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز — تلون سے ہے تجھکو مدعا کیا
کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیوں — کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا
کبھی محفل میں وہ بیباکیاں کیوں — کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکین صولت آفریں کیوں — کبھی الطاف جرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ ہائے جانگزا کیوں — کبھی یہ نغمہ ہائے جانفزا کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی — کبھی کہنا کہ یہ تم نے کہا کیا
کبھی بے جرم یوں آزردہ ہونا — کہ کیا طاقت کہ پوچھوں میں خطا کیا
کبھی اس درجہ بھی پہلو [illegible] — کہ ہم سے جلوہ ہائے دلربا کیا
یہ سب طول اس نے سنکر بے تکلف — جواب اک مختصر مجھکو دیا کیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

ہم کو یہاں یہ لکھنا بھی ضرور ہے کہ اگرچہ فی زمانہ مرزا غالب کے کلام کو عام مقبولیت حاصل ہے اور بڑے بڑے خوشگو اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ غالب کے رنگ کی تقلید کیجائے مگر بدقسمتی سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ غور کرنے پر جہاں تک ہم نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ مقلدان غالب نے اکثر مغلق الفاظ سے غالب کی تقلید کا بیڑا اٹھایا ہے۔ باقی نہ معانی آفرینی ہے نہ نازک خیالی نہ بندش چست ہے نہ مضامین اعلیٰ ہیں اسی سبب سے کہنا پڑتا ہے۔

کلاہ گوشۂ کبک در گوشش کرد   تنگ خویشتن را فراموش کرد

بعض لوگ ایسے ہیں جنھوں نے چند الفاظ میں غالب کے اتباع کو ختم کر دیا ہے اور وہی الفاظ اُن کے فیصدی ۹۵ اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مرکز۔ رگ گل کھینچنا۔ تشنج پیدا ہونا۔ خون دل کا سمٹنا۔ اور بہت سے الفاظ جنھیں ضرور کہیں ہم مفصل لکھیں گے۔ ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ غالب کے اشعار میں درد زیادہ ہے اور محض اسی خوبی سے غالب کی شاعری کو قابل اتباع قرار دیا ہے مگر درد پیدا کرنے کا طریقہ ایک خاص مقرر کر لیا گیا ہے کہ جسقدر مضامین ہوں اُن میں موت کا ذکر کیا جائے اور فیصدی ۸۰ شعروں میں جنازے اٹھائے جاتے ہیں لکھنؤ کے بعض موجودہ شعرا میں اکثر اسی قسم کے شعر پسند کیے جاتے ہیں۔ بلکہ میں اپنے تجربہ کی بنا پر یہ کہنے کو تیار ہوں کہ وہ شعر ہی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں موت اور نزع کے مصائب بیان نہ کیے جائیں بلکہ یہاں تک کہدینے میں باک نہیں ہے کہ انبساط و انقباض جو شعر کی دو خاص تعریفیں ہیں ان میں سے انبساط تو بالکل غائب ہے رہا انقباض وہ اور کسی صورت سے پیدا نہیں کیا جاتا محض موت کے مضمون لکھدیے جاتے ہیں۔ چونکہ ذکر موت ایک ایسا ذکر ہے جس سے ہر شخص کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس لیے اسی ذکر اور مضمون کو معیار درد قرار دیدیا گیا۔ اور لطف یہ کہ اسی ایک مضمون کی بنا پر کوئی خود کو غالب کا صحیح متبع اور کوئی میر تقی میر کا مقلد کہکر خوش ہوتا ہے۔

اندھیری راتیں گور غریباں پر چراغ کا ٹمٹمانا۔ مرنے کے وقت بالوں کا پریشان کرنا وغیرہ وغیرہ چند مضمون ہیں۔ میرا روے سخن کسی خاص فرقہ کی طرف نہیں ہے بلکہ جو کچھ لکھا گیا ہے محض تقلید کی بنا پر۔ اب متبعان غالب شیفتہ کے کلام کو انصاف سے دیکھیں اور اگر میں غلطی پہ ہوں (حالانکہ کئی دیوان موجودہ شعرا کے میری شہادت کے لیے تیار ہیں) تو مجھے معاف فرمائیں۔

وا اُسکے بیان سے ہے غالب اسکی ہر بات   عبارت کیا۔ اشارت کیا۔ ادا کیا

یعنی اُسکی عبارت اشارت ادا سب بلائے جان ہیں۔ گویا ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا　　پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

یعنی جب ہماری برابر کسی پر قہر و غضب نہیں کیا گیا۔ اور ہماری طرح کوئی آفت اور مصیبت میں مبتلا نہیں ہوا تو یہ کیا بیجا ہے جو ہم کہتے ہیں کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یعنی عبادت اور بندگی میں آزادی نہیں چلتی مگر ہم اس میں بھی ایسی آزادی کام لیتے رہے کہ اگر خانہ کعبہ کا دروازہ بند دیکھا تو وہاں سے واپس چلے آئے۔ پھر اوروں کی تو کیا حقیقت ہے۔ عرفی اسی مضمون کو ایک دوسری طرح سے علی الرغم ظاہر کرتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

وقت عرفی خوش کہ نکشودند چون در بر رخش　　بر در نکشودہ ساکن شد و در دیگر نزد

یعنی میں وہاں گیا۔ اور اس کے گھر کا دروازہ بند دیکھ کر میں نے واپس لوٹنا یا کسی دوسرے دروازہ پر جانا مناسب نہ سمجھا وہیں پڑا رہا۔

اور غالب کہتے ہیں کہ میں نے اپنی وضع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا در کعبہ بند دیکھ کر واپسی مناسب سمجھی مگر اور کسی طرف کا رُخ نہیں کیا۔ یا وہاں رہ کر انتظار دروازہ کھلنے کا نہیں دیکھا۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا　　روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

تو وہ بے نظیر ہے کہ تیری یکتائی کو کوئی نہ مٹا سکا اور کوئی آئینہ سیما معشوق تیرا مقابل پیدا نہ کرسکا۔ خاصہ ہے کہ جب آئینہ مقابل ہوتا ہے تو مدمقابل پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہاں وہ مسئلہ قضیہ بھی ٹوٹ گیا (آئینہ سیما) جسمیں عکس یعنی مدمقابل ہونے کا پورا احتمال تھا وہ بھی کوئی مقابل پیدا نہ کرسکا اس شعر کو اگر وحدت وجود کے بارے میں مان لیں تو شاید کچھ بیجا نہ ہوگا یہ ایک عام مضمون ہے یا یہ کہ کوئی تیرا مقابلہ نہ کرسکا۔

کم نہین نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوبان　　تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہوا

تیرے بیمار کی بیماری بُری نہین ہے اسلیے کہ معشوقون کی آنکھ کو بھی بیمار کہتے ہین اور یہ بھی بیمار ہے تو اس صورت سے یہ اس کا ہمنام ہوا اور ہمنامی کا فخر کچھ کم اس کے لیے مایۂ ناز نہین ہے اس شعر مین انتہائی حسرت ہے اور قائل اپنی بدترین حالت کو معشوق کی ایک چیز سے ہمنام پاکر اسی پر صبر نہین بلکہ ناز کرتا ہے۔

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا　　خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہوا

یعنی وہ نالہ جو دل سے لب تک نہ آسکے اک داغ بنکر سینہ مین رہ جاتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے وہ قطرہ کہ دریا تک نہین پہونچتا ہے خاک مین مل کر رہ جاتا ہے اور داغ کی صورت پیدا کرتا ہے ایسے ہی مضمون کو مصنف نے اک نئے رنگ سے دوسری جگہ یون بیان کیا ہے۔

بسکہ روکا مین نے اور سینہ مین ابھرین پے بہ پے　　میری آہین بخیۂ چاکِ گریبان ہوگئین

نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسیکو نہ ملا　　کام مین میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہوا

مطلب یہ ہے کہ دنیا مین ہزارون دکھ ہین جن سے اہل دنیا ناواقف ہین اور اسی لحاظ سے اُن دکھون کی ہستی کو کوئی مسلم نہین جانتا مگر نہین بہت سے دکھ ایسے ہین کہ انکو مین جھیلتا ہون اور کوئی نہین جانتا اور بہت سے فتنہ ایسے ہین جو دنیا مین نہین اٹھے اور دنیا ان کو نہین جانتی مگر وہ میرے کامون مین اٹھ رہے ہین۔

ہر بنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب　　حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہوا

اس مین استفہام اقراری ہے یعنی عشق کا ذکر کیا جاے اور آنکھون سے جوے خون روان نہو یہ کیسے ممکن ہے اگر ایسا ہو تو یون کہیے کہ وہ عشق کی داستان کا ہے کو ہوا امیر حمزہ کی کہانی ہے۔

قطرہ مین دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو مین کل　　کھیل لڑکون کا ہوا دیدۂ بینا نہوا

دجلہ ایک ندی کا نام ہے جو بغداد کے نیچے سے نکل گئی ہے اور مجازاً ہر ایک ندی کو دجلہ کہتے ہیں اور یہاں بھی مصنف کی مراد یہی ہے یعنی اگر دیدۂ بینا ہے تو ہر جزو میں کل اور ہر قطرہ میں دریا ضرور نظر آئے گا جیسے کہ مخلوق سے خالق اور صنعت سے صانع کا پتہ چلتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ دیدۂ بینا نہیں ہے اس میں بھی استفہام ہے

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بڑی زبردست خبر تھی کہ غالب کو سزا دی جائے گی اور اس کے ٹکڑے کئے جائیں گے مگر افسوس ہے کہ تماشا نہ ہوا تماشا دیکھنے ہم بھی گئے تھے اس میں معشوق کا استغنا دکھایا گیا ہے کہ قتل کا وعدہ کیا اور عاشق جانباز وہاں خود گیا مگر معشوق نے یہاں بھی وعدہ خلافی کی اور اس کے جان لینے میں بھی انکار رہا۔ مولانا نظم صاحب اس کی شرح یوں فرماتے ہیں اپنی رسوائی اور مورد تعزیر ہونے کا اظہار ہے کہ لوگ اسے تماشا سمجھے ہوئے ہیں مگر یہ مطلب ہماری سمجھ سے باہر ہے اب دیکھئے کہ کہنہ مشق شاعر نے ایک معمولی پامال مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ نہایت بلند خیال معلوم ہوتا ہے اگر شعر میں یہ مضمون اس صورت میں لایا جاتا کہ غالب تیرے قتل کا وعدہ کیا گیا تھا اور تو وہاں گیا مگر قاتل نے قتل نہ کیا تو شعر جیسا کچھ ہوتا ظاہر ہے غرضکہ ایک رکیک خیال کو چستی بندش انوکھا خیال بنا کر دکھا دیتی ہے۔ ایک فارسی کا شعر اسی خیال سے لبریز ہے مگر فرق یہ ہے کہ جس صورت سے معشوق کی بے اعتنائی کو ایک پیش پا افتادہ مضمون سے شاعر نے ہمیں بندش کید ساتھ پیش کیا ہے وہ ایک تصویر ہے جس کے دیکھنے سے آنکھیں سیر نہیں ہوتیں۔ ملاحظہ ہو

طغیان ناز بین کہ بجا گوشۂ خلیل
آید بزیر تیغ و شہیدش نمی کند

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

اسد ہم ایک بے سر و سامان مجنون فقیر ہیں کہ وحشت ہم کو صحرا بصحرا لیے پھرتی ہے

اور ہمارے پاس پشت خار تک نہین ہے جس سے اپنی کمر کھجلا لین چونکہ ہم جنون مین ہم
پھرتے ہین تو ہرن ہم سے پیچھے رہ جاتے ہین اور انکا سینگ سر مژگان ہماری پشت کو لگا نہوا
اور وہی پشت خار کا کام دیتا ہے معانی آفرینی کی حد ہے تو ہو مگر شعر کو چیستان یا بھول
بھلیان سے زیادہ نہین کہہ سکتے اور یہ صورت محال کی حد مین ہے۔ یاد رہے کہ غالب کے لیے مایۂ ناز ہین اور
غالب ان شعرون نے نہین بنایا بلکہ مہمل گو کا خطاب دلایا تھا۔ اور یہین سے سمجھ لینا چاہیے کی ایک پہچان ہے
کہ معنی آفرینی بھی وہین تک اچھی ہے کہ شعر لغو نہو جائے۔

پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا بہ خون غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا

چونکہ مین باوجود کوشش ہمیشہ درگاہ کریم سے قریب نہو سکا تو اب اسی شرم
نے کریم کی نذر کرنے کے لیے اس دعوی پارسائی کو تحفہ بنایا ہے جو سو مرتبہ گناہ ور اس کی مثال
ہاتھ سے مجروح ہوا یعنی اپنی سو بار کی ٹوٹی ہوئی توبہ کو میری شرم نارسائی درگاہ رواغ کی
معذرت کے لیے پیش کرتی ہے۔ اس شعر کو نہایت بلیغ کر کے کہا گیا ہے واقعی با بیان
ایسی ہے جیسے جناب مرزا قوی صاحب فرماتے ہین ؎

بڑا کریم ہے وہ جرم بخش ہی دے گا خدا کے سامنے سر اپنے قوی جھکانا ہو گئین

نہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بمہر صد نظر ثابت ہے دعوی پارسائی کا

یہ بہ یا نہوا لحاظ سے

حسن موصوف تماشا دوست صفت یعنی حسن دوست جو تماشا کو دوست رکھتا ہے ایسا نہ ہو کہ
اس سے کوئی اس کو بیوفائی کا الزام دیکر رسوا نہ کرے بلکہ اسی تماشا دوستی سے اس کی پارسا
ئی کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ سو آنکھین اور نظرین جو دیکھنے والون کی اسیر پڑتی ہین وہ گویا
سو مہرین ہین جو اس کی پارسائی پر دال ہین اس مین اگر طنز کا پہلو نکالا جائے تو وہ کچھ
اچھا نہین۔

زکات حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

اے جلوۂ بینش زکوٰۃ حسن ادا کر کہ تیری زکوٰۃ لیکر فقیر کا کاسہ گدائی ایسا چراغ بنجائے

جو آفتاب کا مقابلہ کرے۔ چراغ جلنے سے مراد گھر کی رونق ہے یعنی تو جو اس کے کاسہ میں اپنے
حسن کی زکوٰۃ دے گا۔ تو وہ کاسہ اس کے گھر کا چراغ اور اس کے گھر کی رونق بنجائے گا۔
ظاہر ہے کہ فقیر اگر بھیک لیکر گھر جاتا ہے تو اس کے گھر چراغ جلتا ہے۔ یہ ایک محاورہ ہے
جو یہاں نہایت بلاغت سے ادا ہو گیا ہے۔ جلوہ بینش کو دیکھتے ہوئے خیال پیدا ہوتا ہے
کہ خم کاسہ گدائی کا استعارہ آنکھوں سے کیا گیا ہے جس سے یہ مطلب پیدا ہوتا ہے کہ اے جلوہ
… تو میری آنکھوں کو اپنا جلوہ دکھا کر روشن کر دے۔ خانہ استعارہ ہے دل سے یعنی
… جلوہ آنکھوں میں سما جائے تو میرا دل اس نور سے منور ہو جائے۔ نظم صاحب فرماتے
ہیں کہ افسوس کاسہ گدائی دل سے استعارہ ہے کہتے ہیں کہ اے جلوہ گاہ بینش میرے کشکول دل کو زکاۃ
… روشن کر دے کہ اس فقیر کے لیے وہ چراغ ہدایت ہو جائے اور آفتاب کی طرح
وعدہ … جہالت کو دور کر دے مگر میرے نزدیک آنکھوں کا استعارہ کاسہ گدائی سے اکثر کیا
… ہے جیسے آتش کہتے ہیں ؎

آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کیلئے

… علیہ الرحمہ ؎

… کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

… جان کر بیجرم قاتل تیری گردن پہ
رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا

تو نے محض بے جرمی کی وجہ سے مجھے قتل نہ کیا اور خیال کیا کہ یہ بیگنہ ہے اس کا خون
کون اپنی گردن پر لے۔ مگر یہ نہ سمجھا کہ جیسے بیگناہ کا خون گردن پر رہے گا اسی طرح آشنائی
کا حق گردن پر رہ جائے گا۔ اس شعر میں نہایت ہی نازک خیالی دکھائی ہے جو غالب کا
حصہ اور ان کی شاعری کا جوہر خاص ہے ایک شعر میں معشوق کو دوست بنا کر اس طرح اسے قتل
کی ترغیب دی ہے ؎

دوست ہو کر دیکھتے ہو تشنہ کامی فراق
تم پلاتے کیوں نہیں تلوار کا پانی مجھے

تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

میری زبان کی تمنا بے زبانی کا شکریہ ادا کر رہی ہے جس کے سبب سے بیدست و پائی

کے شکوہ کا تقاضہ مٹ گیا یعنی بیدست و پائی کا شکوہ بار بار میری زبان پر تقاضہ کرتا ہوا کہ مجھے بیان کر۔ مگر اب اس نے مجھے بے زبان دیکھ کر شکایت چھوڑ دی اور وہ تقاضہ نہیں کرتا اور میری زبان کی جان بچ گئی اسی وجہ سے زبان بے زبانی کے شکریہ میں محو ہے۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

میری نفس اور نکہت گل کی اصل ایک جگہ اور ایک سبب سے ہے فرق یہ ہے کہ میرے یہاں اس کا نام نفس یعنی شعر ہے اور چمن میں نکہت گل اس کا نام ہے۔ ادھر بہار آئی اور اس کی بو پھیلی ادھر میری غزل گوئی شروع ہوئی مصنف نے بہت صاف الفاظ میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے ؎

ہو نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

تیرے جور و جفا اور ظلم کا ہر ایک حسین کے منہ میں شکوہ ہے اور ہر ایک حسین کا دہن گویا ایک حلقہ ہے اور بہت سے حلقوں سے زنجیر بنتی ہے تو اس طرح گویا ایک زنجیر رسوائی کی ہے جو تیری نیکنامی کے پاؤں میں پڑ گئی ہے۔ دوسرے مصرع میں مصنف اپنے خیال کو اور ترقی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ معشوق کے منہ کو معدوم خیال کیا ہے اور تیرا شکوہ ہر ایک معشوق کے دہن میں ہے تو لازم آیا کہ تیری بیوفائی کا چرچا عدم تک ہے۔

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

اے غالب نامہ کو اتنا طول نہ دے۔ ایک مختصر سی یہ بات لکھ دے کہ میرے دل میں حسرت ہے کہ میں تیرے سامنے جدائی کے ظلموں کی شکایتیں بیان کروں۔ ایک جگہ اسی مضمون کو اس سے اچھے پیرایہ میں صاف الفاظ میں یوں فرماتے ہیں ؎

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے اس سے جو میں یہ بھی کہوں وہ بھی

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا   بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائیگا

اگر رنج شب جدائی بیان نہ ہوگا تو سمجھ لیجئے کہ داغ ماہ کی میرے منہ پر مہر لگ گئی ہے ظاہر اگرچہ کوئی لطیف معنی اس شعر سے مستخرج نہیں ہوتے۔

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب   پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا

اگر شب جدائی میں ایسا ہی پتہ پانی ہوتا ہے تو یہ چاندنی میرے خانمان میرے گھر کے لیے سیلاب ہو جائے گی یعنی ممکن ہے کہ جیسے میرا زہرہ آب ہو گیا ہے چاندنی کا بھی زہرہ آب ہوا اور وہ میرے گھر کے لیے سیلاب کا کام دے۔ یا یہ کہ شب ہجر کی ہیبت ایک بارونق اور باعث تسکین شے کو بھی میری بربادی کا باعث ثابت کرے اور یہ تباہی کی اور معین اور مددگار ثابت ہو۔

لے تو لوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بوسہ مگر   ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

میری محبت بالکل بے غرضانہ ہے اور میں اسے اس کی آنکھوں میں پاک اور بے لوث ثابت کرنا چاہتا ہوں اگرچہ حالت خواب میں مجھے بوسہ کا اختیار باقی ہے مگر اس کی بدگمانی کا خیال مانع آتا ہے۔

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا   یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

ہم سمجھے تھے کہ ہم اپنے دل کو وفا کے تباہ اور برباد اور صرف کرینگے مگر اس نے امتحان ہی میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

واں گئے بھی ہم تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا   مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

ہر ایک کے دل میں تیری جگہ ہے اگر صرف تو مجھ سے راضی ہو گیا تو سارا زمانہ مجھ پر

راضی ہو جائے گا۔ یہ شعر تصوف کے رنگ مین ڈوبا ہوا ہے اور مصنف نے اس مین اس شعر
اور محاورہ کی وجہ وجیہہ بیان کی ہے کہ خدا مہربان تو سب مہربان یعنی تیری مہربانی سے سوا
کے مہربان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تو سب کے دل مین ہے اور ناراض ہونا محض دل پر
موقوف ہے تو جب تیرا تمام عالم کے دل پہ قبضہ ہے تو ان کے تمام افعال و حرکات پر بھی
قبضہ ہے۔ شعر

سائین انکھیان پھیریان تو بیری ملک جہان
ٹک اک جھولا ہر کا تو لاکھون کرین سلام

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط — شعلہ خس مین جیسے خون رگ مین نہان ہو جائیگا

اگر تیری نظر گرم یعنی نظر عتاب اسی طرح ضبط کی تعلیم دیتی رہی جیسے کہ مجھکو دیتی ہے تو اس کا
یہ اثر ہوگا کہ شعلہ خس و خاشاک مین اس طرح چھپ جائے گا جیسے خون رگون مین [illegible] حاصل
یہ ہے کہ تیرا عشق تیرا غم ایک شعلہ ہے اور میرا دل خس سے مشابہ ہے محض تیری نگاہ گرم
کی تعلیم ضبط سے مین اس کو دل مین چھپائے ہوئے ہون۔ نگاہ گرم سے مراد نگاہ عتاب ہے
ایک جگہ فرماتے ہین شعر

لینا پرنیان کا شعلہ آتش مین آسان ہے — مگر مشکل ہے حکمت دل مین سوز غم چھپانے کی

ایک جگہ اسی ضبط کے مضمون کو یون ادا کیا ہے شعر

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

یون تو ضبط کے مضامین غالب کا حصہ ہین مگر قابل غور یہ بات ہے کہ ایک قادر الکلام شاعر
کس کس طرح ایک ہی مضمون کو نئے ڈھنگ سے ظاہر کرتا ہے۔

باغ مین مجھکو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر — ہر گل تر ایک چشم خونفشان ہو جائیگا

یعنی میرا حال ایسا زبون ہے اور مین ایسا واجب الرحم ہون کہ اگر تو مجھے باغ مین لیجائیگا
تو ہر پھول میرے حال کو دیکھکر روئے گا۔ اس سے یہ بہتر ہے کہ مجھکو باغ مین نہ لیجا۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر مین نہو — ابتلک تو یہ توقع ہے کہ وان ہو جائیگا

اگر میرا تیرا انصاف حشر مین بھی نہو تو بڑا افسوس ہے ابتک تو اس امید پر خوش ہون کہ وہی انصاف ہو جائے گا۔ ذوق مرحوم ایک جگہ فرماتے ہین کہ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہین کہ مر جائین گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائین گے

یہ شعر ہے کہ مرزا غالب اس کو پڑھ کے سر دھنتے تھے ایک نہایت شوخ مضمون جناب شمس مثنوی کا ایسے ہی مضمون کا ہے بہت ہی خوب فرمایا ہے ؎

بروز حشر شہیدون کو ہی بڑا دعوے　　مزا تو ہے جو ثابت ہو جرم قاتل پہ

اس کی سادگی و شوخی حد تحسین سے باہر ہے۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد　　دوستی نادان کی ہے جی کا زیان ہو جائیگا

اسد تو بھی خود ہوشیار آدمی ہے خیال کر کہ کیا فائدہ ہے جو تو نادان سے دوستی کرتا ہے مشہور مثل ہے کہ نادان کی دوستی جی کا زیان۔

درد منت کش دوا نہوا　　مین نہ اچھا ہوا برا نہوا

میرا نہ اچھا ہونا برا نہین ہے اچھا ہے کہ اگر اچھا ہو جاتا تو میرے درد پر دوا کا احسان ہوتا اور کسی کا احسان میری غیور طبیعت کو پسند نہین ہے۔ ایک جگہ احسان کے بارے مین یون مذمت فرماتے ہین ؎

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم　　اے خانمان خراب نہ احسان اٹھائیے

ایک جگہ یہ فرماتے ہین ؎

نہ پکڑین دامن الیاس گرداب بلا مین ہم　　کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا

سعدی فرماتے ہین ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است　　رفتن بہ پای مردی ہمسایہ در بہشت

جمع کرتے ہو کیون رقیبون کو　　اک تماشہ ہوا گلا نہ ہوا

مین تم سے گلا کرتا ہون تو تم رقیبون کو کیون جمع کرتے ہو میرا گلا گلہ نہوا بلکہ ایک تماشہ ہو گیا۔ اگرچہ قاعدہ ہے کہ چار آدمیون کو جمع کر کے کسی بات کا فیصلہ کیا کرتے ہین مگر

مصنف کا رشک اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ رشک کے مضامین غالب کے یہاں نہایت ہی عمدہ طریقے سے نظم ہیں جن کا جواب نہیں ہے مثلاً ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

وغیرہ وغیرہ۔ ایک میرا شعر ہے ؎

کرتے ہیں شب وصل وہ دشمن کی برائی
میں کہتا ہوں آخر وہ تمہیں آپ سے ...

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہم اب اپنے مقدر کی کہاں آزمائش کرنے جائیں جب تو نے ہی ہماری گستم ... خنجر کو نہ آزمایا یعنی ہماری خوش قسمتی اسی پر موقوف ہے کہ تو ہمکو قتل کر دے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اس سے پتہ چلتا ہے کہ تیرے لب بہت شیریں ہیں کہ رقیب کی گستاخیوں پر تو نے اسے گالیاں بھی دیں مگر وہ ان سے بیمزا یعنی ناراض نہوا۔ شیریں۔ اور کھانا۔ مزا وغیرہ الفاظ مناسب الفاظ ہیں جو نہایت خوبی سے جمع ہوگئے ہیں۔ اور یہ آورد سے پاک معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک الفاظ مناسب کا جمع کرنا حسن شاعری ہے اور اس سے بڑھ کر عیب ہو جاتا ہے اور اس کا ذکر ہی فضول ہے جیسے کوئی صاحب فرماتے ہیں ؎

مرغ دل کو توڑے ہے بلی ترے دروازہ کی
زخمت تن کو کاٹے ہے چوہا تمھاری ناک کا

لاحول ولا قوۃ۔ نواب مصطفیٰ خان کے یہاں ایک شعر اسی مضمون کا ہے جو نہایت بلاغت سے کہا گیا ہے ؎

دشمن پس دشنام بھی ہے طالب بوسہ
محو اثر لذت دشنام نہ ہوگا

یعنی دشمن بعد گالیوں کے بھی بوسہ کی تمنا کرتا ہے کیوں نہ کرے آخر لذت دشنام کا اس پر کچھ اثر ہوگا ہی ہوگا کیونکہ گالیاں تیرے شیریں لبوں سے نکلی ہیں اور وہ شیریں ہیں اسی لیے وہ چاہتا ہے کہ چھیڑ کر اور زیادہ گالیاں کھائے یا کمبخت دشمن محو اثر لذت دشنام نہوا۔ وہ بوالہوس ہے

نہ تیری گالیاں بوسے سے کچھ کم ہیں یا یوں سمجھ لیجیے کہ ؎

غصہ میں ترے ہم نے عجب لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

(۵) تھی خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ان کے آنے کی بڑی گرم خبر ہے مگر آج ہی میری بے سروسامانی رنگ لائی ہے اور دن میسر ہوتا تو ہوتا تھا آج بوریا بھی ندارد ہے۔ اگرچہ مضمون ایک ہے لیکن حسن بیان نے چمکا دیا ہے مطلب یہ کہ سب دن چنگی تہوار کے دن ننگی۔

(۶) کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

یہ شعر غالب کے مغلق شعروں میں سے ہے جس کی شرح جناب نظم صاحب نے ان دو الفاظ میں فرمائی ہے (وہ) اشارہ ہے نمرود جس کی طرف فقط حالانکہ اس میں قلب ماہیت کا الزام عاید ہوتا ہے کیونکہ نمرود مذکر اور خدائی مونث ہے یعنی جس نمرود کی خدائی تھی۔ مگر مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب میں اس شعر کے معنی یہ لکھے ہیں یعنی میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھکو سوا نقصان کے فائدہ نہ پہنچا۔ میرے نزدیک یہ معنی ہیں کہ خدا جس کی میں نے عبادت کی کیا وہ نمرود تھا اور کیا اس کی خدائی نمرود کی خدائی تھی کہ میرا بھلا نہ ہوا۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا (۷)

میں نے جان آفرین کو اپنی جان دیدی۔ مگر کیا ہرج ہے یہ اسی کی دی ہوئی تھی میری چیز نہ تھی سچ بات تو یہ ہے کہ مجھ سے کچھ حق ادا نہ ہوا۔

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا (۸)

اگر ہمارا زخم دب گیا تب بھی لہو بدستور جاری رہا۔ کام اگر رک گیا مراد ہے وہی زخم کے دبنے سے تب بھی میری حاجت روائی نہیں ہوئی۔ لیکن لہو نہ تھما۔ تھما متروک ہے تھما مستعمل ہے۔ حسرت صاحب نے اس کی یہ شرح فرمائی ہے۔ کام جب رک جاتا ہے تو روا نہیں ہوتا۔ [illegible]

یہان ایسا نہین ہوا اور زخم کے دب جانے پر بھی لہو جاری ہو۔ خیال میرا اور اُن کا قریب قریب یکسان ہے لیکن شرح الفاظ مین فرق ہے۔

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے   لیکے دل دلربا روانہ ہوا

روانہ قافیہ معمولی ہے۔ اسے متقدمین نے عیوب شعر مین شمار کیا تھا۔ لیکن فصحائے متاخرین اُس کو حسن شعر سمجھتے ہین مگر بقول جناب نظم صاحب شعر قافیہ معمولی سے سست ہو جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ انداز رہزنی ہے یا طریق دلستانی ہے کہ معشوق دل لیکر روانہ ہو گیا دیکھئے قافیہ نے شعر کو بالکل بھدا کر دیا ہے۔

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہین   آج غالب غزلسرا نہ ہوا

یہ غزل شاید بیش طرح پڑھی گئی ہو۔ اور دوسرے مصرع مین شاید طرح سے مراد ہے

گلہ ہے شوق کو دل مین بھی تنگی جا کا   گہر مین محو ہوا اضطراب دریا کا

میرا شوق اتنا زیادہ ہے کہ اس کو میری تنگدلی کی شکایت ہے یہ واقعہ ایسا ہے کہ جیسے ایک موتی مین تمام دریا کا اضطراب سما گیا۔ مرزا نے تنگدلی کی اکثر شکایت کی ہے۔ ایک آدھ شعر ہم پہلے لکھ چکے ہین۔ اور آئندہ لکھیں گے۔ مگر یہ مضمون مرزا عبدالقادر صاحب بیدل عظیم آبادی کے یہان یون بندھا ہوا ہے۔ صفائی وغیرہ وہان بھی نہین ہے مگر ہم مضمون ہونے کی وجہ سے شعر لکھتا ہون ؎

دل آسودۂ ما شور امکان در نظر دارد   گہر دزدیدہ است اینجا زبان موج دریا را

یعنی ہمارا دل جس کو تو آسودہ دیکھتا ہے اسمین ایک عالم کا شور سمایا ہوا ہے۔ گویا موتی مین دریا بھر کا اضطراب ہے۔

یہ جانتا ہون کہ تو اور پاسخ مکتوب   مگر ستمزدہ ہون ذوق خامہ فرسا کا

یعنی مین جانتا ہون کہ تو اور میرے خط کا جواب لکھے یہ امر غیر ممکن ہے۔ مگر میری خامہ فرسائی کا ذوق کب مانتا ہے۔ خوامخواہ لکھنا پڑتا ہے۔ اور رات دن بیٹھا ہوا

خط لکھا کرتا ہون۔ ایک جگہ اور فرماتے ہین کہ

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھون ۔۔۔ مین جانتا ہون جو وہ لکھین گے جواب مین

ایک شعر میر حسن صاحب مرحوم کا بالکل اسی مضمون کا ہے

گرچہ دلکو ہے یقین خط تو نہین لکھنے کا وہ ۔۔۔ پر تقاضہ شوق کا لکھنے سے کب رہتا ہے باز

حنائے پائے خزان ہے بہار اگر ہے بھی ۔۔۔ دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

اول تو بہار کا وجود ہی دنیا مین نہین ہے اور اگر ہے بھی تو وہ خزان کے پاؤن کی مہندی ہے یعنی خزان کی زیب و زینت کے لیے ہے اور ظاہر ہے کہ ہستی دنیا عدم کے لیے ہے۔ بوجہ رنگینی کے بہار کو حنا کہا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ عیش دنیا فانی ہے اور کلفت خاطر دائم اور باقی ہے۔ دوسری شرحون مین کہا گیا ہے کہ بہار اگر ہے بھی تو وہ مہندی کی لالی ہے چار دن مین جاتی رہے گی پھر خزان ہی کا قدم درمیان رہیگا۔ میرا ایک شعر ہے۔ آسی

بہار باغ جہان مین خزان کا عالم ہے ۔۔۔ شگفتہ ہونا ہے غنچہ کا ٹوٹنا دل کا

غم فراق مین تکلیف سیر باغ نہ دو ۔۔۔ مجھے دماغ نہین خندہ ہائے بیجا کا

مین فراق کے غم مین مبتلا ہون ہمدمو مجکو سیر باغ کی تکلیف نہ دو مجھے پھولون کی بیجا ہنسی اچھی نہین معلوم ہوتی۔ ایک جگہ فرماتے ہین کہ

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے ۔۔۔ کہ موج بوئے گل سے ناک مین آتا ہے دم میرا

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہون ۔۔۔ کرے ہے ہر بنِ مو کام چشم بینا کا

اگرچہ نظارۂ حسن مین میرا ہر بنِ مو چشم بینا کا کام کر رہا ہے مگر ابتک حسن کی محرمی حاصل نہین ہے یعنی کنہ ذات تک رسائی نہین ہے۔ ہر بنِ مو کو چشم بینا اس وجہ سے کہا ہے کہ جب ہر شے آئینہ ظہور قدرت ہے تو بنِ مو بھی اسی مین داخل ہے جیسے کہ ایک جگہ حمد کے موقعہ پر علامہ فیضی لکھتے ہین کہ

در ہر بنِ مو کہ ہے نہی گوش ۔۔۔ فوارۂ فیض اوست در جوش

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے   ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

ہم نے اپنا دل پہلے ہی بے مانگے اُس کی ناز و ادا کے حوالہ کر دیا ہمیں حسن کے تقاضہ کی برداشت ہی نہیں ہے واضح ہو کہ حُسن اور چیز ہے اور ناز و ادا اور چیز ہے۔ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ ادا و ناز حسن کو ہم دل نہ دیتے تو حسن ہم سے دل لینے کا تقاضہ کرتا۔ مگر ہم نے اسے گوارا نہیں کیا اور حسن کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ نظم طباطبائی لکھتے ہیں کہ ناز و ادا حسن کا تقاضہ ہے — مطلب میرا اور اُن کا قریب قریب ایک ہی ہے۔

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے   مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

اے ہمدم یہ نہ کہہ کہ میں اتنا ہی روتا ہوں جتنی میرے دل میں حسرت ہے۔ اپنے دل کی حسرت اور اپنے آنسوؤں کا مجھے اندازہ ہے یعنی یہ کہ مجھے اور زیادہ رونا چاہئے حسرت کو رونے کی وجہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور وجہ گریہ بھی۔ دریا دل سے استعارہ ہے۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسدؔ   جفا میں اسکی ہے انداز کار فرما کا

یعنی جب آسمان کو دیکھتا ہوں تو مجکو وہ یاد آ جاتا ہے جس نے اُسے جفائیں سکھائی ہیں اور جو بانی جور و جفا ہے۔ ایک جگہ یوں فرماتے ہیں ؎

ہم دنیا سے گریاں بھی فرصت سر اُٹھانے کی   فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا   خطِ جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

گرفتگی و بستگی و تنگی و ضبط نفس حیرت کے لوازم ہیں اور جب ہر قطرہ میں حیرت کے سبب سے یہ صفات پیدا ہوئے تو وہ موتی بن گیا۔ اور پیالہ میں جو لکیر تھی وہ عقد مروارید ہو گئی۔ اس بیان سے فقط حیرت کی شگرف کاری کا اظہار مقصود ہے لیکن یہ مضمون کہ یہ حیرت حسن ساقی کو دیکھ کر پیدا ہوئی مصنف کے ذہن میں

رہ گیا۔ شرح نظم صاحب۔

جب ساغر مے لب یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے بفرط حیرت منجمد ہو گئے اور گوہر بن گئے اور خط جام رشتۂ گوہر کی مانند ہو گیا۔ شرح حسرت صاحب

پہلی شرح میں بالکل بعید از قیاس معنی پہنا کر مصنف کو۔ المضمون فی بطن الشاعر کا الزام دیا ہے اور کئی اک الفاظ بیکار چھوڑ دیئے۔ دوسری شرح میں بھی دو باتیں ہیں جنکا ثبوت الفاظ شعر سے نہیں ملتا میرا خیال یہ ہے کہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے۔ قطرۂ مے کا کام حیران کرنا ہے اور وہ حیرت نفس پرور۔ اور روح پرور ہے خط جام مے کو اس کی روح پروری نے رشتۂ گوہر بنا دیا ہے۔ اس سے فقط مدح شراب مقصود ہے۔

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ۔۔۔ غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

میرے عشق کا جو اس کو اعتبار ہو گیا ہے اس نے مجھکو تباہ کر دیا۔ کیونکہ آہ غیر نے کی مگر چونکہ اسکو میرے عشق کا اعتبار تھا اُسنے سمجھا کہ میں نے آہ کی ہے اور اسی لیے مجھ پر وہ خفا ہوا اور اس طرح سے کوئی کرے اور کوئی بھرے والا مضمون ہو گیا۔

جب بتقریب سفر یار نے محمل باندھا ۔۔۔ تپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

جب اُس نے سفر کا ارادہ کیا اور محمل باندھا۔ تو میرا دل نہایت بیقرار ہوا اور محمل کے ہر ذرہ۔ یا عام ذرہ ذرہ پر شوق نے ایک دل باندھ دیا اور محمل کے ساتھ بھیجدیا یعنی ذرات محمل میرے دل طپاں تھے۔ ذرہ کی چمک اور دل کی تپش کا عالم یکساں ہے مطلب یہ ہے کہ اُس کی محمل کے ساتھ ہی دل تپاں بھی رخصت ہوا اور سہ

سمجھ کر یار جائے گا تو اپنا ہے سفر پہلے

پر عمل کیا۔

اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخی ناز ۔۔۔ جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

دیکھنے والوں نے حیرت کدۂ شوخی ناز میں جوہر آئینہ کو طوطی بسمل قرار دیا ہے یعنی آئینہ یار کے جوہر وں کی سبزی جو متحرک معلوم ہوتی ہے اور بعض وقت بعض رخ سے دکھائی دیتی ہے

گویا طوطی ہے جیسے ناز کی شوخی نے بسمل کر دیا ہے اور وہ تڑپ رہی ہے۔ جوہر کی حرکت اور کبھی کسی رخ سے دکھائی دینا کبھی کسی رخ سے دکھائی دینا۔ طوطی بسمل کے ساتھ وجہ شبہ ہے۔ آئینہ کا کام حیران کرنا ہے۔ تو آئینہ کا گھر یعنی پشت آئینہ گویا حیرت کدہ ہے جہاں وہ طوطی بسمل تپاں ہے جیسے بیتاب چمن طاؤس بسمل میں بھی یہی تشبیہ ہے۔

یاس و امید نے یک عربدہ میدان مانگا عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

ہمت کی عاجزی نے سائل کے دل کو ایک طلسم بنا دیا ہے جس میں امید و بیم لڑ رہی ہیں اور ہر ایک غالب ہونا چاہتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ سوال کرنا بہت برا ہے اور یہ کم ہمتوں کا کام ہے جس سے دل طلسم بیم و امید بنجاتا ہے۔ میرا ایک صاف سا شعر ہے اگرچہ اس میں دوسرا پہلو ہے۔ آسی

بلائے جان ہوئی دل کو منت تاثیر جسے کوئی نہ سنے اس صدا کا کیا کہنا

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضمون غالب گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

میں اپنے تشنگی کے ذوق کے مضمون کو ادا نہیں کر سکا۔ اگرچہ دریا کو بھی ساحل قرار دیدیا یعنی یہ ہے ذوق میں وہ تشنگی ہے کہ اس نے دریا کو بھی ساحل بنا دیا۔ میں یہ بھی کہہ چکا۔ مگر یہ بھی کم ہے ابھی اپنی تشنگی ذوق و شوق کی حالت کا حق بیان نہیں کر سکا۔

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بڑا افسوس ہے بڑا تعجب ہے کہ میں بزم مے سے یوں پیاسا چلا آؤں تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ میں نے توبہ کر لی تھی اس لئے ساقی سے سوال نہ کیا۔ مگر ساقی نے خود مجکو کیوں نہ پلا دی۔ اس قسم کے مضمون کے دو شعر شیخ علی حزیں کے یہاں بھی ہیں جو درج ہیں

چہ شد از توبہ اگر دامن خشکے دارم پیش ابر کرم پیر مغاں اینہمہ نیست
افسردہ ایم صبا را چہ پیشود رہ گم نکردہ بوئے گلے تا دماغ ما

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

مجھے کسی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔ اسی کو اس کی شرح سمجھئے یا معنی یا سرقہ یا نقل۔

اب ہیں اک تیر میں شفتہ جگر و دل دونوں
گئے وہ دن کہ تھا بیمار سے بیمار جدا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

یعنی عاجزی اور درماندگی میں اگر کوئی تدبیر ہو سکے تو جب جانوں ورنہ جب ضرورت نہ تھی تو سب تدبیریں خیال میں آتی تھیں مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت اچھے ہوشیار بیوقوف بن جاتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے ہیں

جب آنکھ تھی بند دیکھتے تھے سب کچھ
جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا ہم نے

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا گھر رونے سے ویران ہو گیا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ گھر جہاں اب دریا ہے اگر دریا نہ ہوتا تو ویران ہوتا۔ غرضکہ ہر حالت میں ویران ضرور رہتا۔ ایک جگہ کہتے ہیں

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

تنگیٔ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

میں تنگیٔ دل کی کیا شکایت کروں۔ اگر میرا دل تنگ نہ ہوتا۔ تو اس کی شگفتگی اور واشدگی پریشانی کے درجہ پر پہونچ جاتی۔ یہ شعر بھی اسی قبیل سے ہے جیسا پہلا شعر ہے کہ۔

عاشق کو الغرض ہے مصیبت ہی ہر طرح
ہو وہ سبک جو تیری نظر میں گراں نہ ہو

بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

اس سے دربار کی دربان کی سنگدلی کا اظہار مقصود ہے کہتا ہے کہ وہ ایسا سنگدل ہے کہ تمام عمر ہم عشق یار میں مبتلا رہے۔ مگر وہ ہم کو اس کے گھر میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کاش بجائے اس کے رضوان اس گھر کا دربان ہوتا کہ عمر بھر عبادت کرتے تو اس بہشت میں ہمیں داخل تو ہونے دیتا۔ مگر یہاں تو ہنوز روز اول کا مضمون ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ شعر مذاق تصوف میں کہا گیا ہے یعنی صوفیہ کا یہ مسئلہ ہے کہ سب اُس سے یا اُسمیں سے ہیں تو اس میں سے تو ہو نہیں سکتے کیونکہ وہ لا تجزی ہے بلکہ سب اُس سے ہیں۔ اور وہ سب سے پہلے بھی تھا اور بعد کو بھی رہے گا۔ کیونکہ صنعت سے صانع کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ صنعت کے نہ ہونے سے صانع کی ہستی میں فرق نہیں آسکتا وہ بدستور رہوگی۔ اس لیے مصنف کہتا ہے کہ جب کوئی مخلوق نہ تھی تب بھی خالق موجود تھا۔ اور اگر کچھ نہ ہوتا تب بھی خالق ہوتا۔ کیونکہ لا شے سے شے ہو نہیں سکتی پہلے نہ تھا تو بعد کو کہاں سے آیا۔ مگر مجھکو میری ہستی نے ڈبودیا اور کھودیا۔ یعنی عین ذات یا اپنے مبدء سے علیحدہ کردیا۔ کاش میں نہ ہوتا۔ تو کیا بگڑ جاتا۔ صرف اس ہستی نے مجھے جدا کردیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

ما ہما عین خودیم اما خود از وہم دوئی   درمیاں ما و غالب ما و غالب حائل است

حکیم ہمام کہتے ہیں کہ فنا کے بعد پھر اپنے مبدء سے مل جائیں گے فرماتے ہیں ؎

درمیان من و دلدار حجاب است ہمالم   آنہم امید کہ روزے زمیاں برخیزد

ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا   نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

جب غم نے اس کو بےحس کردیا تھا تو اب میرا سر جو کٹ گیا ہے اُس کے کٹنے کا کیا غم ہو نہ کٹتا تو وہی بدستور زانو پر رکھا ہوتا۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے   وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

غالب کو مرے ہوئے مدت ہوگئی مگر اب بھی اس کی بحث وتحقیر کی عادت یاد آتی ہے

ایک ذرہ زمیں نہیں بیکار باغ کا   یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

باغ کا ایک ذرہ زمین بھی بیکار نہیں ہے یہاں تک کہ یہاں جادہ بھی چراغ لالہ کی بتی ہے داغ کو چراغ کے ساتھ اکثر استعارہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں یہ مفہوم

پیدا ہوتا ہے کہ روشوں کی پٹریوں نے باغ کی رونق کو اور چار چاند لگا رکھے ہیں یعنی جادہ باعث فروغ چراغ لالہ ہے اگر داغ کو چراغ نہ مانا جائے اور داغ بھی مانا جائے تو قیاس سے مراد وہ تپتی ہوگی جو زخم میں رکھتے ہیں تیسرے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ کثرت نشو و نمائے لالہ اسقدر ہے کہ جادہ رگ گل لالہ بن گیا یعنی وہ بالکل پھولوں میں چھپ گیا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل	کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہے دماغ کا

بلبل کے حال پر پھول ہنس رہے ہیں کیونکہ عشق کو اطبا نے خلل دماغ کہا ہے یا یہ کہ عشق کی کسی کی نظروں میں وقعت نہیں ہے۔

کون سنتا ہے زمانہ میں کسی کا درد دکھ	نالۂ بلبل پہ گل بھی خندہ زن ثابت ہوا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکر سخن مجھے	تریاکی قدیم ہوں دود چراغ کا

مجھے نشۂ فکر سخن سے میں ابھی سرشار نہیں ہوا ہوں بلکہ ہمیشہ چراغ کے دھوئیں کی افیون کھاتا رہا ہوں یعنی میں نے ہمیشہ راتوں کو فکر سخن میں صرف کیا ہے۔

دود چراغ خوردہ شب اور وہ ام ہیرو نہ	معذور ہم ار نماندہ دماغ مرا تری

سو بار بند عشق سے آزاد ہم ہوئے	پہ کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

یہ نہیں ہے کہ ہم قید عشق سے کبھی آزاد ہی نہیں ہوئے مگر ہمارا دل ہی فراغت کا دشمن ہے وہ آپ گرفتار ہوتا ہے اور اس کو گرفتاری کا شوق ہے پھر ایسی حالت میں

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم	آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی	کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

بے شراب کے آشوب ہوشیاری کے برداشت کرنے کی کسے طاقت ہے اسی لیے میرے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کھینچا صفحۂ دل پر سے اُسے کاٹ دیا خط کھینچ دینے کے بجائے خط ایاغ کھینچ دینا ایک لطیف معنی رکھتا ہے یعنی اُس کے مقابلہ پر اس کو ترجیح دی اور حسن

کی وجہ سے ترجیح دی اسی کے خطرے سے آشوب آگہی کو رد اور باطل کیا یعنی ہوشیاری کے مقابلہ پر میں نے بیہوشی کو اچھا سمجھا دنیا میں بے عقل اور بیہوش بنکر رہنے کو شعرا اچھا جانتے ہیں۔ خود غالب فرماتے ہیں کہ ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

حالی فرماتے ہیں ؎

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانہ

ایک فارسی شاعر کہتا ہے ؎

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند

بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

نشہ بھی آنکھوں میں ہوتا ہے نظر بھی آنکھ میں ہوتی ہے مصنف کہتا ہے کہ خون دل کے بغیر مجھے اپنی موج نگاہ یعنی نظر غبار معلوم ہوتی ہے جو باعث تکلیف ہے۔ خون دل کو شراب سمجھا ہے اور آنکھ کو میکدہ قرار دیا ہے یعنی یہ میکدہ تلاش شراب میں خراب ہو رہا ہے۔ مے وہی خون دل ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ بغیر مے کے اس میکدہ میں خاک اڑ رہی ہے۔

باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل ہے تو ابر بہار کس کے دماغ کے لئے خمکدہ ہو وہ بھی تیرے ہی لیے ہے دوسرے یہ معنی ہیں کہ میرے سرور دل کا یہ بساط جو مجھ کو تیرے حسن کا ہرا بھرا شگفتہ باغ ہے۔ ابر بہار سے مستی کا دماغ میرے دماغ کو نہیں ہے۔

وہ مری چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا راز مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا

میری چین جبین سے اُس نے میرے غم پنہاں کو معلوم کر لیا اور خط کے بے ربط مضمون کو عنوان کی خرابی سے سمجھ گیا چین جبیں کی تشبیہ عنوان سے نہایت بدیع ہے

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز　　چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

جب سے کہ میں نے اپنے آئینہ (یعنی دل کو) گریبان سمجھا ہے اسی وقت سے اسکے چاک کرنے میں مصروف ہوں۔ گویا جبھی سے اس آئینہ پر صیقل کر رہا ہوں مگر اتنا تک یہ پورے طریقہ سے صاف نہیں ہوا۔ یا یہ گریبان اتنا پھٹا ہے کہ ایک الف کا نشان بن گیا ہے آزاد قلندر مشرب لوگ اپنے سینہ پر ایک الف کا نشان کھینچ لیا کرتے ہیں یعنی صفائی دل خاطر خواہ حاصل نہیں ہوئی۔ بیش نہیں فارسی کی زبان ہے۔ اُردو میں آنا کچھ اچھا نہیں ہے غالب نے ایک جگہ اور انہیں الفاظ کا دوسرے مضمون میں اعادہ کیا ہے فرماتے ہیں ؎

دور کن نقش دوئی از ورقِ سینۂ ما　　اے نگاہت الف صیقلِ آئینۂ ما

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ　　اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

میری گرفتگی دل کی شرح نہ پوچھ مختصر یہ ہے کہ میرا دل غموں سے اس قدر تنگ ہو گیا کہ میں اپنے دل کو قید خانہ سمجھتا ہوں۔ اور قید خانہ بھی ایسا تنگ قید خانہ کہ جس کی شرح (جس کے معنی کھلنے کے ہیں) بھی نہیں ہو سکتی۔ یا لفظ شرح کی بھی اس میں گنجائش نہیں۔ اور یہ سب علایق دنیوی کے سبب سے ایسا ہوا۔ مرزا یاس عظیم آبادی نے جو غالب کے طرز بیان اور دقت پسندی کے سخت ترین مخالف ہیں۔ اور جنھوں نے مرزا کی زبان کو دیوزاد کی زبان کہا ہے اپنی صاف زبان میں یوں اس کی شرح کی ہے ؎

زندگی کشمکش رنج و محن میں گذری　　چار دیوار عناصر کو میں زنداں سمجھا

حالانکہ مرزا غالب کے یہاں زنداں سمجھنے کے مناسب الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً گرفتاری تنگی وغیرہ۔ مگر یہاں یہ کچھ نہیں ہے صرف چار دیوار ہے جس سے زنداں کے ثابت کرنے کی بیجا کوشش کی گئی ہے مگر ہم اس بات کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ غالب کے الفاظ و خیال کو خوب بدل دیا ہے۔

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام　　رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

میری بدگمانی نے اس کا چلنا پھرنا گوارا نہ کیا۔ کیونکہ چلتے وقت جو اس کے رخ پر

پسینہ آیا تو پسینہ کے قطروں کو میں نے رقیب کی حیران آنکھیں سمجھیں یعنی میں سمجھا کہ وہ اسکو دیکھ رہا ہے۔ قطرۂ عرق میں فک اضافت ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ میرا معشوق اتنا بدگمان ہے کہ سرگرم خرام بھی نہیں ہوتا ہے بلکہ چلتے وقت جو شرم یا حرکت سے اس کو پسینہ آتا ہو اس پسینہ کے قطرہ قطرہ کو وہ دیدۂ حیران عاشق جانتا ہے۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا　　نبض خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

میں نے اپنے عجز ہمت سے یہ سمجھ لیا کہ وہ بدمزاج ہے۔ گویا تنکے کی نبض دیکھی اور شعلہ کا حال معلوم کر لیا یعنی ہمت خود کرنے کی کچھ نہیں تھی اور الزام اس کو دیا۔ نبض خس سے اپنی عجز ہمت اور شعلہ سوزاں سے اس کی بدخوئی کا استعارہ کیا ہے۔

سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی　　ہر قدم سایہ کو میں اپنا شبستاں سمجھا

عشق کے سفر میں میرے ضعف نے راحت طلبی کا پہلو اختیار کیا اور ہر قدم سایہ کو میں نے سمجھا کہ یہی میرا گھر ہے۔ اور یہی میری منزل ہے اور اس صورت میں مجھے قدم قدم پر ٹھہرنا پڑا۔ قاعدہ ہے کہ راہ میں جب مسافر تھک جاتا ہے تو اس کو آرام کی تلاش ہوتی ہے۔ ایک شعر اسی مضمون کا غالباً مرزا داغ مرحوم نے فرمایا ہے ؎

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے　　بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دم مرگ　　دفع پیکان قضا اسقدر آساں سمجھا

میرا دل مرتے وقت تک اس کے مژہ سے گریز کرتا رہا۔ حالانکہ مژۂ یار پیکان قضا تھا جس کا روکنا اور دفع کرنا غیر ممکن تھا۔ مگر اس بے وقوف نے اس کا دفع کرنا ایسا آسان سمجھا اور آخر نہ بچ سکا۔ یہ تا دم مرگ سے پتہ چلتا ہے۔

دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسدؔ　　غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

اس کو وفادار سمجھ کر دل اس کو کیوں دیا۔ اسدؔ یہ تمھاری بھی غلطی ہے کہ تم نے ایک کافر کو مسلمان سمجھا۔ میں یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نظم صاحب نے علاوہ گزشتہ

بہت سے شعروں کے اس شعر میں بھی جاں اور دل کے لفظ سے مرزا مرحوم پر ضلع جگت کا الزام لگایا ہے میں کہتا ہوں کیا ایسے ہی مناسب الفاظ کہ جن کی نشست اس خوبی سے واقع ہوئی بضلع جگت سمجھے جاتے ہیں۔ یوں کافر اور مسلمان کا لفظ بھی اس میں موجود ہے۔ اگر ایسا ہی خیال کیا جائے تو شاید کوئی صاف سے صاف شعر بھی اس سے خالی نہ ہوگا ؎

کشتۂ دل خویشم کہ ای ستمگر ان یک سر دیدہ دلفریبہا الفت مہربانیہا

اس میں ایک لفظ حشو قرار دیا جا سکتا ہے۔

دل جگر تشنۂ فریاد آیا پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

میرے دل اور جگر کو پھر فریاد کی تشنگی پیدا ہوئی اور اس تقریب سے پھر دیدۂ تر یاد آگیا کہ یہ تشنگی رونے ہی سے بجھے گی۔ آیا دوسرے مصرعہ کا فارسی کے محاورہ کا ترجمہ ہے۔ اردو میں ہوا اس کے بجائے بولیں گے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا

ہنوز قیامت یعنی میرے اضطراب کو تسکین نہیں ہوئی تھی کہ تیرا وقت سفر یاد آگیا اور قیامت میں قیامت برپا ہوگئی۔ داغ ؎

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

سادگیہائے تمنا یعنے پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

میری آرزوئیں کتنی سادی ہیں کہ اسی نیرنگ نظر کو جس نے مجھے تباہ کر دیا یاد کرتی ہیں میر کا شعر ہے ؎

ہمیں تو دیکھئے جس نے کیا ہے ہم کو تباہ تباہ ہو کے بھی ہم اس نظر کو دیکھتے ہیں

دوسرے معنی نیرنگ سے یہ پیدا ہوتے ہیں۔ نیرنگ جادو۔ اور افسوں وغیرہ کو کہتے ہیں تو اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ میری سادہ تمنائیں خیال کرتی ہیں کہ شاید وہ نیرنگ نظر ہمارا کچھ کام بنا دے گا۔ ان کی سادہ لوحی اس سے ظاہر ہے کہ انکو اس نیرنگ کا علم بھی ہے مگر پھر بھی وہی خواہش بیجا ہے۔

عذر واماندگی اے حسرت دل   نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

اے حسرت دل تیرے تقاضہ پر چاہتا تھا کہ نالہ کروں مگر مجھے اس وقت اپنا جگر خستہ یاد آگیا۔ اس لیے میں نے فریاد نہ کی پہلے مصرعہ میں قبول کر۔ اور دوسرے مصرعہ میں کہ محذوف ہے۔

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

ہماری زندگی یوں بھی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی ہے تیرا راہ گذر فضول یاد آیا کہ اسکو یاد کر کے میں مر گیا مرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب ہم اس رہ گذر پر گذر نہیں سکتے اور کبھی رات دن اس رستہ کو روندا کرتے تھے حسرت صاحب یہ شرح لکھتے ہیں کہ جب کامگاری ممکن ہی نہیں ہے تو تیرا رہگذر بیکار ہی یاد آتا ہے یعنی جب وہاں بھی بحالت ناکامی بسر ہو گی تو اس کا یاد آنا عبث ہے یوں بھی زندگی کسی نہ کسی طور پر گذر ہی جاتی۔

نظم صاحب فرماتے ہیں تیرا راہگذر یاد آنے سے میری زندگی گذر گئی اور یہ بات اچھی ہوئی کہ میں زندگی سے بیزار تھا لیکن اس کے یاد آنے سے ایسا اندوہ و قلق ہوا کہ اگر اسکو نہ یاد آیا ہوتا تو زندگی تو کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی۔

ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ ہم کو زندگی بار تھی اور تیرا راہگذر یاد آیا جہاں جا کر ہمارا مر جانا مسلم ہے یوں بھی کسی نہ کسی طرح مر ہی جاتے۔ جب مرنا کسی نہ کسی صورت ضرور رہے تو یہاں اور وہاں برابر ہے اس کا یاد آنا عبث ہے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی   گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

داروغہ بہشت رضوان سے میری لڑائی ہو گی اور بڑی لڑائی ہو گی اگر تیرا گھر مجھکو بہشت میں یاد آیا۔ کیونکہ میں بہشت پر تیرے گھر کو ترجیح دیتا ہوں۔ یا یہ کہ میں بمقابلہ بہشت کے تیرے گھر کو ترجیح دوں گا۔ اور وہ مجھ پر خفا ہوگا۔ یا رضوان بہشت میں جب تیرا گھر دے سکیگا تو میں لڑوں گا۔ دو شعر اور اسی قبیل کے مرزا نے فرمائے ہیں۔

کرتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہے مگر اس قدر آباد نہیں

آہ وہ جرأت فریاد کہاں
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا

دل میں جو پہلے فریاد کی جرأت تھی وہ اب کہاں ہے۔ اسی لیے میں دل سے تنگ ہو گیا اور اب اپنا جگر یاد آتا ہے جس میں فریاد کی طاقت زیادہ تھی۔

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا

میرا خیال پھر تیری گلی میں چلا ہے شاید دل گم گشتہ کے ڈھونڈھنے کو جاتا ہے اور اس کا گم ہونا اور وہاں کسی جگہ رہ جانا اس کو یاد آتا ہے۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جس جنگل میں وحشت میں میں جا نکلا ہوں وہ بہت ہی ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر اپنا گھر یاد آ رہا ہے کہ وہ بھی ویرانی میں اس سے مشابہ ہے یا یہ کہ اس جنگل کی ویرانی دیکھکر جی چاہتا ہے کہ گھر لوٹ چلیں

مومن مرحوم کہتے ہیں کہ

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

یعنی ہم وہ آشفتہ سر تھے کہ کبھی اپنے سر کا ہوش نہیں رہا اور یہ حالت کچھ آج نہیں بلکہ بچپن میں بھی ایسے ہی تھے انتہا یہ ہے کہ شوخی سے ہم نے مجنوں کے سر میں مارنے کو جب پتھر اٹھایا ہے تب اپنا سر یاد آیا اور پھر وہ پتھر اپنے ہی سر میں مار لیا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

اس شعر میں وہ جامع الفاظ ہیں جن سے اس قدر عبارت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ یعنے معشوق کچھ دیر میں عاشق کے پاس پہونچا ہے اور عاشق اس سے دیر میں آنے کی شکایت کرتا ہے اور معشوق کہتا ہے کہ ہاں تاخیر ہوئی جس کے جواب میں عاشق پھر کہتا ہے کہ تاخیر ہوئی تو کچھ تاخیر کا سبب بھی تھا یا بلا وجہ تاخیر ہوئی۔ پھر وہ جواب دیتا ہے کہ ہم آرہے تھے اسپر عاشق پھر کہتا ہے کہ آتو رہے تھے مگر اس تاخیر سے جو باوجود عزم مصمم کے آپ کے آنے میں ہوئی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کوئی نہ کوئی آپ کو روک بھی رہا تھا اور روکنے والا سوا اس کے جس سے آپ کی بے تکلفی ہو کوئی نہیں ہوسکتا۔ سراج لکھنوی

مرنے والا مر گیا اب عذر و حیلہ کیا ضرور
آپ نے تاخیر کی اور جان کر تاخیر کی

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اسمیں کچھ شائبۂ خوبی تقدیر بھی تھا

صرف تم ہی میری تباہی کے باعث نہیں ہو بلکہ اس میں میری تقدیر بھی شامل ہے گویا سہ غالب۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہمپہ بہت سے ستم ہوئے

یہ شعر بہت اچھا ہے اس میں حد عشق اور ادب حسن کو بہت ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

مصنف نے عجب انداز سے اپنی یاد دلائی ہے کہتا ہے کہ میں وہ ہوں جسے کبھی شکار کر کے تو نے اپنی فتراک میں باندھا تھا۔ ایک میرا شعر ہے سہ

یاد کر یاد میں وہ ہوں جسے بھولا ہے تو — اب تو پہچان کے اے وعدہ فراموش مجھے

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا

اس شعر پر مرزا یاس نے ایک مرتبہ ان الفاظ سے اعتراض کیا تھا اک رنج گرانباری تھا مگر کچھ اک رنج کے کیا معنی کچھ بھی اور اک بھی یہی استادی اور قادر الکلامی ہے اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ یہاں لفظ کچھ اور ایسا پر اعتراض ہے کہ دونوں ایک ہی معنی

بتا رہے ہین اور اس طرح یکجائی استعمال مین کوئی ایک ضرور حشو ہوگا لیکن اگر عالیجاہ کو شعر کا مطلب سمجھنے اور باریکیون پر خیال کرنے کی عادت ہوتی تو یہ اعتراض نہ سوجھتا شاعر کہتا ہے قید کی حالت مین تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد ہے اور وہان اک گرانباری زنجیر کا اور بھی رنج تھا اگر زیادہ نہین کچھ یونہی سا اب دیکھئے تو دونون لفظ ہم معنی نہین رہے اور شعر مین ایک خوبی پیدا ہوگئی جو بلا اجتماع کے ممکن نہین تھی۔ از گلدستہ خیال فروری ۱۴ء

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہ کیا کہ آپ جلوہ دکھا کر آنکھوں کے آگے سے اوجھل ہوگئے مین صرف دیدار ہی کا مشتاق نہ تھا بلکہ میرے لب تقریر کے بھی تشنہ تھے لہذا چاہیے تھا کہ آپ کچھ بات بھی کرتے اس ایک جھلک دکھانے سے تو صرف ایک بجلی سی آنکھون کے آگے کوند گئی جس نے اور آنکھون کو خیرہ کر دیا اور کچھ نتیجہ نہوا۔

یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی   گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

اُس کا حسن یوسف کے حسن سے زیادہ ہے۔ مین اُس کو یوسف کہوں اور وہ کچھ نہ کہے بس یہ سمجھو کہ یہ خیریت ہوئی۔ ورنہ اگر اس بات پر وہ خفا ہو جاے تو بجا ہے اور مجکو سزا دے تو درست ہی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سمجھے کہ مجھے غلام بتایا۔ تو اسپر اس کا غصہ درست ہے میرا شعر ہے ؎

وہ یون ہی اک تو سلے دل نام سے یوسف کے چڑھتے ہین
اور اک تم ہو کہ یوسف کہہ کے ثانی اور کہتے ہو

دیکھکر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا   نالہ کرتا تھا و لے طالب تاثیر بھی تھا

غیر کو دیکھ کر میرا دل کیون نہ ٹھنڈا ہو کہ مین نے اُس کو روتے دیکھا اور ساتھ ہی اپنے دعا کے اثر کا طالب تھا۔ تو اس سے میرا جی خوش ہوا کہ اس کی نالہ و آہ بھی بے اثر ہے اور تو اس سے بھی ناراض ہے ؎

شادم کہ از رقیبان دامن کشان گذشتی   گو مشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

پیشہ میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام　　ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوانمیر بھی تھا

جاہلانہ مثل مشہور ہے کہ پیشہ حبیب اللہ اسی بارہ میں مصنف کہتا ہے کہ فرہاد کا پیشہ کوہکنی وغیرہ تھا۔ اور عاشقوں میں کوئی پیشہ ہونا اک عیب ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ فرہاد کے لئے پیشہ کوئی عیب نہیں تھا کیونکہ کوہکنی جو اس کا پیشہ تھا وہ محض معشوق کے انقیاد اور فرمانبرداری کے لئے تھا ورنہ وہ بھی ایک ہم ہی جیسا آشفتہ سر تھا۔ اگرچہ بجائے ہم ہی کے ہمیں لکھنا فصیح ہے مگر اس جگہ ہم ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جوانمیر وہ جو جوان مرجائے۔

ہم سے مرنے کو کھڑے یار نہ آیا نہ سہی　　آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ہم مرنے کو کھڑے ہی تھے یار تلوار لیکر ہمارے پاس نہیں آیا تھا نہ سہی آخر اس کے پاس کوئی تیر تو تھا دور ہی سے کھینچ کر مارتا اور ہمارا کام تمام کر دیتا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

محض ظرافت کی راہ سے یہ شعر لکھا گیا ہے۔ کہتا ہے کہ جو کراماً کاتبین نے لکھ دیا بس وہ پتھر کی لکیر ہو گئی آخر جب انھوں نے لکھا تو اس وقت کوئی ہمارا آدمی بھی تھا۔ کیونکہ ہر معاملہ فریقین کے سامنے طے ہوتا ہے اور جب ہی کوئی دستاویز وغیرہ لکھی جاتی ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب　　کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

ریختہ۔ ریختہ اردو کی شاعری کو کہتے ہیں یعنی غالب اردو کی شاعری کے کچھ تنہا تم ہی استاد نہیں ہو پہلے زمانہ میں کوئی استاد میر بھی تھا۔ میر سے میر تقی مراد ہیں۔ ایک جگہ اور بھی کہتے ہیں ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

لب خشک در تشنگی مردگاں کا　　زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

ہیں ان لوگوں کا جو پیاس میں مر گئے ہیں لب خشک ہوں اور ہیں وہ محروم رنجیدہ

دل ہوں کہ دل آزردوں کا زیارت گاہ ہوں ۔

ہم ناامیدی ہمہ بدگمانی ۔۔۔ میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگان کا

میں اُن لوگوں کا دل ہوں جنھوں نے وفا کا فریب کھایا ہے اور آخر میں اُن کے ارمان مایوسیوں سے بدلے ہیں اسی طرح میں بھی سراسر بدگمانی اور یاس بنا ہوا ہوں اور گویا انھیں کا دل ہوں ۔ ؎

سر بسر یاس ہوں میں اور ہمہ حرماں ہوں میں ۔۔۔ شاید اپنے دل مایوس کا ارماں ہوں میں

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ۔۔۔ اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

اے ستمگر تو کسی کا بھی دوست نہ ہوا تھا اوروں (یعنی غیروں) پہ تو نے وہ ظلم کیے ہیں جو مجھ پر بھی نہیں کیے ۔ یا یوں سمجھیے کہ میں مطمئن تھا کہ تو اوروں پہ ظلم نہیں کرتا اور یہ ظلم سب میرے ہی لیے ہیں مگر یہ خیال بھی غلط نکلا ۔ بہت سے نئے ظلم ۔ یا ایسے ظلم تو نے مجھ پر نہیں کیے اور غیروں پر کیے اور مجھے محروم رکھا ۔ اسی بنا پر یہ شکایت کی گئی ہے ۔ جیسے کہ داغ مرحوم فرماتے ہیں ۔ ؎

اے فلک تو نے دیا تھا غم جو کھانے کے لیے ۔۔۔ وہ بھی سب کر دیا سارے زمانے کے لیے

مرزا یاس نے اعتراض کیا ہے کہ اس شعر کی ردیف بیکار ہے اور اس کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ بھی کی جگہ ہے اکثر نسخوں میں دیکھا گیا ہے ۔ اس صورت میں ردیف بیکار نہیں رہتی ۔ مگر ہمارے نزدیک ہے صحیح نہیں ہے بھی صحیح ہے اور ردیف بیکار نہیں ہے ۔ کیونکہ شاعر کا مطلب تو یہ ہے کہ راز کھل اب کھلا ہے کہ پہلے میں سمجھا ہوا تھا کہ تو اوروں کا دوست ہے مگر نہیں تو کبھی کسی کا بھی دوست نہیں ہوا تھا ۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ۔۔۔ خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

ماہِ نخشب ایک چاند تھا جسے حکیم ابنِ عطا مشہور بہ ابنِ مقنع نے سیماب وغیرہ سے بنایا تھا یہ چاند ایک کنویں سے نکلا کرتا تھا اور اس کی روشنی چار فرسنگ تک ہوتی تھی ۔ پھر بھی وہ اصلی چاند کے مقابلہ میں بالکل ماند تھا ۔ اسی طرح شاعر کہتا ہے کہ

خورشید ہنوز میرے مہر انور میرے معشوق کے حسن و جمال کے برابر نہین ہوا تھا اور اُسکے مقابلہ مین اُس مین ابھی روشنی پیدا نہوئی تھی کہ دست قدرت نے اس کو ناقص چھوڑ دیا

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں مین ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہوا تھا

جس کی جتنی ہمت ہے اتنی ہی توفیق الٰہی اسکی مدد کرتی ہے دیکھ لیجئے کہ جو قطرہ گوہر بننے کو پسند نہین کرتا وہ آنکھون مین رہتا ہے۔ ورنہ اگر موتی ہوتا ہے تو زیادہ سے زیادہ کانون تک یا تاج شاہی تک پہونچتا ہے۔

مین سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہون　　یعنی سبق شوق مکرر نہوا تھا

مین بیوقوف یار کی رنجیدگی سے خوش ہون کہ میرا عشق مکرر نہوا تھا یعنی لڑائی ہو کر صلح نہین ہوئی اور وہ چشمکین اور وہ محبتین نئے سر سے تازہ نہین ہوئین اور یہ بھی میری سادگی ہے کہ رنجیدگی ہی سے خوش ہون۔ داغ ایک جگہ فرماتے ہین ؎

بڑا مزا اُس ملاپ مین ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

جبتک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم　　مین معتقد فتنۂ محشر نہوا تھا

قیامت کو قامت سے اکثر تشبیہ دیتے ہین اور یہ مضمون پامال ہے کہتا ہے کہ جبتک قد یار مین نے نہ دیکھا تھا اُس وقت تک مجھے قیامت کا اعتقاد نہین ہوا تھا۔ ایک جگہ یون فرمایا ہے ؎

ترے سرو قامت سے اک قد آدم　　قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہین

امیر اور داغ مرحوم کے مشہور مطلع انھین مضامین مین کہے گئے ہیں۔

امیر　سایہ مین آپ بلند قامت کے
فتنہ سب سو گئے قیامت کے

داغ　عشق مین اک بلند قامت کے　　ہم گلے پڑ گئے قیامت کے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سر دامن بھی ابھی تر نہوا تھا

اس میں اپنے کثرت معاصی کا اظہار مقصود ہے کہ گناہ کا دریا خشک ہو گیا اور میرے دامن کا ایک کونا بھی نہ بھیگا تھا یعنی جتنی معاصی تھے اُن سب کا ارتکاب میں کر چکا اور ابھی میرے دل کی ایک ذرا سی بھی حسرت نہیں نکلی۔ آزاد مرحوم لکھتے ہیں کہ اُستاد ذوق مرحوم شعر مذکور بہت پسند کرتے تھے۔

جاری تھی اسدؔ داغ جگر سے مری تحصیل آتشکدہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

جیسی کہ داغ جگر سے میری تحصیل جاری ہے یعنی اُس کی بدولت گرم نالہ و آہ کرتا ہوں اسی طرح آتشکدہ سے بھی سمندر کو فائدہ نہ ہوا تھا۔ یا جب سے آتشکدہ داغ سے میری تحصیل جاری ہے کہ آتشکدہ میں سمندر کا وجود بھی نہ ہوا تھا۔

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اُس زمانہ سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پہ

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا رشتہ ہر شمع خار کسوت فانوس تھا

وہ موصوف خلوت فروز کسوت ناموس صفت۔ رات کہ وہ خلوت فروز مجلس ناموس محفل میں آتا تو فانوس کے لئے شمع کا ہر ایک رشتہ خار لباس بنا ہوا تھا یعنی شمع سے اس کو تکلیف ہو رہی تھی اور وہ شرمندہ تھا۔

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا کس قدر یارب ہلاک حسرت پابوس تھا

جس جگہ عاشق شہید ہوا تھا۔ وہاں کوسوں تک جو مہندی اُگتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کے دل میں تیرے قدم چومنے کی حسرت تھی اور یہ حسرت تھی جو مرنے کے بعد بھی نہیں گئی اور اس کی خاک سے حنا اُگتی ہے کہ شاید اسی بہانے پابوسی نصیب ہو۔ یہ مضمون مختلف طریقوں سے باندھا گیا ہے شاید آتش مرحوم کا شعر ہے۔

بجائے سبزہ کنگھی اُگ رہی ہے میرے مدفن پر

یا خود غالب مرحوم ایک جگہ فارسی میں فرماتے ہیں ؎

لالہ و گل دمد از طرف مزارش پس مرگ تا چہا در دل غالب ہوس روئے تو بود

حاصل اُلفت نہ دیکھا جز شکست آرزو دل بدل پیوستہ گویا یک لب افسوس تھا

محبت کا حاصل سوائے آرزوؤں کے خون ہونے کے ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔ دو ملے ہوئے دل گویا لب افسوس تھے یہ تشبیہ بدیع ہے جس کا اردو کے شاعروں کے یہاں ملنا دشوار ہے۔

کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیاں   جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

میں بیماری غم کی فراغت کا کیا بیان کروں اس نے مجھے بہت سے جھگڑوں سے آزاد کر دیا کیونکہ غذا جب ہضم ہوتی ہے تو اس کو کیلوس کہتے ہیں پھر جو اس سے خالص حاصل ہوتا ہے وہ جگر میں ہضم ہوتا ہے اس کو کیموس کہتے ہیں مگر خون کھانے میں کبھی کیلوس اور کیموس کا جھگڑا پیش نہیں آتا ہمیشہ خون دل کھاتا ہوں اور وہ ہضم ہو جاتا ہے۔ کیا کروں کی جگہ کیا کہوں لکھا گیا ہے اس میں شاید مصنف نے کچھ مصلحت رکھی ہو ورنہ اردو کا محاورہ بیان کرنا ہے نہ کہ بیان کہنا۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

آپ ہم کو طعنہ دیتے تھے کہ ہم تو کسی پر عاشق ہو جائیں ہمیں تو کسی کا حسن فریفتہ کر لے مگر یہ باتیں جبھی تک تھیں جب تک آئینہ نہ دیکھا تھا اب جو آئینہ دیکھا اور اس میں اپنا حسن لاثانی نظر آیا تو اپنا سا منہ لیکر رہ گئے اور عاشق ہونا ہی پڑا۔ اس میں معشوق کے حسن کا کمال ظاہر کیا ہے وہ ایسا حسین ہے کہ آپ بھی اپنے پر عاشق ہو گیا۔

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے   اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

اس سے یہ دونوں معنی مفہوم ہوتے ہیں کہ غریب قاصد کو میرا پیغام پہنچانے پر آپ کیوں قتل کرتے ہیں یہ اس نے از خود نہ پہنچایا تھا بلکہ ساری میری خطا تھی کہ میں نے اسکو بھیجا تھا مجھی کو قتل کیجئے۔ دوسرے یہ کہ عاشق بوجہ رشک کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ معشوق اپنے ہاتھ سے کسی اور کو قتل بھی کرے اس لیے وہ اس کو بچا رہا ہے کہ میری خطا ہے اس کی خطا نہیں مجھی کو قتل کیجئے یا دوسرے کا قصور بھی اپنے سر لے لیتا ہے گردن زدن فارسی کا محاورہ ہے اور گردن مارنا اس کا ترجمہ ہے اور یہی اردو کا بھی محاورہ ہو گیا ہے

اگر اس جگہ یہ کہدیا جائے کہ گردن نہ کاٹیئے تو کیسا بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سے فارسی کے محاورات ترجمہ ہو کر بجنسہ اردو کے محاورے ہو گئے ہیں۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا — جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

عرض ظاہر کرنا۔ نیاز عاجزی یعنی میں اس قابل نہیں رہا کہ عشق کے عجز و نیاز کو ظاہر کرسکوں کیونکہ یہ سب کچھ دل کی بدولت تھا کہ دل عشق کا مسکن تھا مگر وہ عشق کے صدمے اٹھاتے اٹھاتے مٹ گیا اور اس طرح میری مایۂ ناز چیز میرے ہاتھ سے جاتی رہی اسی زمین میں میر کا مطلع ہے ۔

روتا ہوں یوں کہ شوق بھرا دل نہیں رہا — یعنی میں تیرے ظلم کے قابل نہیں رہا

مومن مرحوم نے بھی بہ تبدیل قافیہ اس زمین میں مطلع خوب کہا ہے ۔

دل قابل محبت جاناں نہیں رہا — وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے — ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

میں حسرت ہستی کا ایک داغ اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں گویا میں ایک بجھی ہوئی شمع ہوں جو محفل کے قابل نہیں ہے۔ اسمیں مصنف نے وہ تین ایسی نازک باتیں بیان کی ہیں جو بے مثل ہیں ہستی کا استعارہ محفل سے کیا ہے مرنیوالا بھی جب مرتا ہے تو اس کے دل میں بھی حسرت زندگی کا داغ ہوتا جو اپنے ساتھ لیجاتا ہے۔ اور شمع کو بھی شعراء داغ کہتے ہیں جب وہ بجھتی ہے تو وہ داغ اپنے ساتھ لیجاتی ہے شمع کشتہ کو بھی اٹھا دیا جاتا ہے اور مردہ بھی اٹھا دیا جاتا ہے مردہ بھی کوئی فائدہ بزم ہستی کو نہیں پہونچاتا اور شمع کشتہ بھی کسی فائدہ کے پہونچانے کے قابل نہیں رہتی۔ ایسے شعروں پر اردو کی شاعری جس قدر ناز کرے کم ہے مرزا ثاقب لکھنوی کا ایک شعر ہے جس میں وہ غالب کے اس شعر کے تمام مطلب کو اگرچہ بیان نہیں کر سکے مگر شعر کے اچھے ہونے میں شبہ نہیں ہے ۔

ٹھہری نہ کوئی شے بھی جب ساتھ جانے والی — ہستی کی انجمن سے اک داغ لیچلا میں

ایک میرا شعر ہے ۔

لیچلا باغ جہاں سے گل داغ ہستی — پئے یاران عدم مل گئی سوغات مجھے

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں — شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

میرے نزدیک تو مصنف اس میں صرف اپنی گرانجانی کا اظہار کرتا ہے اور دست و بازوئے قاتل جس سے نزاکت دست و بازو مراد ہے اس کی تائید کے لیے الفاظ موجود ہیں مگر نظم صاحب نے اس کی یہ شرح لکھی ہے کہ میرا حال ایسا غیر ہوا ہے کہ وہ مجھے صید زبون سمجھتا ہے یہ معنی بھی بعید از قیاس نہیں ہیں اس مضمون کو ایک جگہ نظیری یا فیضی کہتا ہے ؎

آن شکارم من کہ ہم لایق بہ کشتن نیستم — شرم می آید مرا زانکس کہ صیاد من است

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے — یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

بر روئے مقابل شش جہت سے مراد دنیا مجاز کیونکہ دنیا کی چھ طرفیں ہیں زیر بالا مشرق مغرب شمال جنوب یعنی دنیا کے مقابلہ پر ہر طرف آئینہ خانہ کھلا ہوا ہے اور اس سے ناقص و کامل سب حیران ہیں یعنی اسرار قدرت کے سمجھنے میں تمام عقلمند اور بیوقوف حیران ہیں ؎ غالب

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست — گوئے طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

میرے جذبۂ شوق نے حسن کو بالکل بے پردہ کر دیا ہے اور میرے اور اس کے درمیان میں اب کوئی حجاب حائل نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف نگاہ ہے جس سے میں اس کو دیکھ رہا ہوں نگاہ کو اس لیے حائل کہا ہے کہ وہ اس کے جمال جہان آرا کو دیکھ نہیں سکتی سعدی رح ؎

درمیان من و دلدار حجاب است ہمام — آنہم امید کہ روزے زمیان برخیزد

مرزا قوی لکھنوی۔

اب دور کیا ہیں جلوۂ جانان کی لذتیں — اک پردہ رہ گیا ہے تو وہ بھی نگاہ کا

دل سے ہوا کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں — حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

میرے دل سے وفا کرنے کی خواہش مٹ گئی کیونکہ وہان یعنی معشوق کی سرکار مین سوائے اس کے نتیجہ کی حسرت کے اور کچھ وفا کا حاصل نہین ہی یعنی حسرت حاصل وفا ہی۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ　　جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

اسد مین عشق کے ظلم سے نہین ڈرتا مگر افسوس یہ ہی کہ جس دل سے عشق کے ناز اٹھاتا اور ظلم سہتا تھا اب وہ مٹ گیا۔ غالباً مصنف نے پہلے یہی مصرع کہا ہی اور اسی کی وجہ سے تمام غزل لکھی ہی پہلا مصرع ہین مگر بمعنی شاید لیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ شاید مین دل کی وجہ سے بیداد سے ڈرتا تھا اب دل ہی نہین پھر خوف کیسا۔

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

میرا رشک کہتا ہی کہ افسوس اُس کو غیر سے محبت ہی اور عقل کہتی ہی کہ وہ بیوفا کس کا آشنا ہی وہ جیسے تیرے ساتھ بیوفائیان کرتا ہی اُسی طرح دوسرون کیساتھ کرتا ہوگا۔

ذرّہ ذرّہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے　　گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

دنیا کا ذرّہ ذرّہ بوقلمونی اور دگرگونی کے میخانہ کا ایک ساغر ہی جو انسان کو حیران بیخود بنا دیتا ہی دیکھئے جو گردش مجنون کے لیے گردش یعنی تکلیف دہ ہی وہی گردش لیلیٰ کی آنکھون مین بھلی معلوم ہوتی ہی اور انکو پیاری ہی۔ آسی

عالم کا ہر ذرہ جو گردش و انقلاب مین مبتلا ہی یہ نیرنگ فلک کے اشارہ سے ہے۔

یہان لفظ ساغر سے معنی گردش نے تراوش کی اور اسی حالت سے نیرنگ کو میخانہ سے تعبیر کیا ہے اس کے بعد بر سبیل تمثیل کہتے ہین کہ مجنون کی گردش لیلیٰ ہی کے اشارہ سے ہے۔ از شرح نظم صاحب۔

جس طرح گردش مجنون چشم لیلےٰ کے اشارہ کی پابند تھی اسی طرح دنیا مین ذرّہ ذرّہ نیرنگی عالم کا تابعدار ہی۔ حسرت۔

مین یہ نہین سمجھا ہون کہ تابعداری اور پابندی وغیرہ کے معنی کس لفظ سے مترشح ہوتے ہین۔

شوق ہے ساماں طراز نازش ارباب عجز — ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

عاجزوں کے نازش کا سامان پیدا کرنے والا شوق ہے ذرہ کو شوق صحرا بنا دیتا ہے اور قطرہ کو دریا کر دیتا ہے یعنی شوق ذرہ کو صحرا اور قطرہ کو دریا سے ملا دیتا ہے اور صحرا و دریا سے مل کر وہ خود اس لقب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے — عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

میں ہوں اور میرا دل ہے جو سلامتی اور عافیت کا دشمن ہے اور آوارگی کا دوست ہے آفت کا ٹکڑا اتحاد رہ ہے۔

شکوہ سنج رشک ہمدیگر نہ رہنا چاہیے — میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

ہم دونوں کو ایک دوسرے کی شکایت نہ کرنا چاہیے تیرا رفیق آئینہ ہے یعنی اپنے بناؤ سنگار کی وجہ سے اس کو دیکھتا ہے اور میرا رفیق زانو ہے یعنی میں ہمیشہ فکر سے سر بزانو رہتا ہوں آئینہ کو زانو سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ لہذا دونوں برابر ہیں۔

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد — سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

کوہکن عاشق صادق نہ تھا بلکہ ایک شیریں کی تصویر کا نقاش تھا ورنہ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ پتھر سے سر مارے اور آشنا پیدا نہ ہو۔ ایک شعر کوہکن پر اور بھی آوازہ کسا ہے جو گذر چکا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

یا

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ہمارا رازداں ہمارا رقیب ہو گیا۔ کہ ہمارے معشوق کا ذکر اپنی زبان سے کرتا ہے یعنی ہم کو اتنا رشک ہے کہ اسکا ذکر اور اسکا نام کسی اور کی زبان سے سننا نہیں چاہتے یا یہ کہ من احب شیئا فاکثر ذکرہ۔ شعر میر

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

رشک سے یا تیرے نام کے اثر سے۔

مے وہ کیون بہت پیتے بزم غیر مین یارب — آج ہی ہوا منظور اُنکو امتحان اپنا

اگر ان کی غیر سے بے تکلفی نہوتی تو وہ دشمن کی بزم مین اتنی شراب کیون پیتے اگر یہ خیال کرون کہ انھون نے اپنا امتحان کیا ہوگا کہ دیکھون مین کتنی شراب پی سکتا ہون تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آج ہی انکو اپنا امتحان کیون منظور ہوا کبھی میرے یہان تو اتنی شراب نہ پی پس معلوم ہوا کہ یہ سب میری بدقسمتی ہے اور کچھ نہین۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکان اپنا

ہمارا امکان عرش پر ہے جس سے ہم اُس کی پورے طریقہ سے ماہیت نہین معلوم کرسکتے اور اس کو دیکھ نہین سکتے جیسے کہ آنکھ خود کو نہین دیکھ سکتی اس لیے کیا اچھا ہوتا اگر ہمارا امکان عرش سے ادھر ہوتا۔ کہ کسی بلندی کو ہم منظر بناتے اور اس کی سیر کرتے مگر اب تو اس سے اونچی کوئی جگہ ہی نہین کہ آتے ہم منظر اپنا ئین اور یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی کنہ سے بے خبر ہین۔

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی مین ٹالینگے — بارے آشنا نکلا اُنکا پاسبان اپنا

اچھا ہوا کہ اُنکا دربان ہمارا دوست نکلا اب وہ جسقدر ہم کو ذلیل کرے گا ہم اس کو مذاق مین ٹال دین گے اور دنیا کی نظرون مین سبک نہون گے اور کہتے رہین گے کہ ہمارا ان کا ہمیشہ سے مذاق ہوتا ہے۔

درد دل لکھون کبتک جاؤن انکو دکھلادون — انگلیان فگار اپنی خامہ خونچکان اپنا

میرا درد دل ایسا نہین ہے کہ اس کو لکھ سکون۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ جا کر اُنھین اپنی زخمی انگلیان اور خامہ خونچکان دکھا دون کہ لکھتے لکھتے میری یہ حالت ہوگئی اور کچھ نہین لکھ سکا ابھی ایک دفتر باقی ہے۔ یا یہ کہ ان سے کہون کہ مین اپنا درد دل کیونکر لکھون کہ میری انگلیان اور میرا قلم میری دردانگیز داستان لکھنے سے سوختہ ہوکر خونچکان ہوگئین۔

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا — ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستان اپنا

آپ نے اس شرم سے کہ مجھ سے بد نصیب نے اس پر سجدے کیے ہیں اپنا سنگ آستان بدل دیا ناحق بدلا وہ پتھر میرے سجدہ کرتے کرتے خود گھس جاتا۔ ایک جگہ یوں فرماتے ہیں ؎

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا — ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

یعنی دشمن بھی دوست کی شکایت میں ہمارا ہمزبان ہے اور یہ ہماری چالاکی ہے کہ ہم نے اس کو ملا لیا ہے اب یہ ہماری شکایت اس سے نہیں کر سکتا کہ وہ تجھے برا کہ رہا تھا۔

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے — بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

آسمان ہنرمندوں کا دشمن ہوتا ہے مگر ہم ایسے کہاں کے عقلمند اور ہنرور تھے کہ آسمان ہمارا دشمن ہو گیا۔ غالباً ہم سے اس کی یہ دشمنی بے وجہ اور بے سبب ہے۔ مولانا عرفی فرماتے ہیں کہ ؎

از من بگیر عبرت و کسب ہنر مکن — با بخت خود عداوت ہفت آسمان مخواہ

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشم خریدار پہ احسان میرا

میں وہ سرمہ ہوں جس کی قیمت اگر ہے تو یہ ہے کہ خریدار کی آنکھ پہ میرا احسان رہے۔ سرمۂ مفت نظر کی طرف اضافت تشبیہی ہے اور ایسی اضافت کو اضافت مجازی بھی کہتے ہیں۔ اس شعر میں غالباً اپنے کلام کی طرف اشارہ ہو جس کا فیض عام ہے۔

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — تیرے چہرے سے عیاں ہو غم پنہاں میرا

مجھے رونے کی اجازت دے ایسا نہ ہو کہ میرے اس ضبط کا اثر تیرے دل پر بھی پڑے اور میرا غم تیرے چہرے سے ظاہر ہونے لگے۔ کیونکہ میرے دل کو تیرے دل سے تعلق مخفی ہے میرے مکرم استاد مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق کا ایک شعر ہے جس میں نہایت صفائی کے

ساتھ عاشق و معشوق کے تعلق باہمی کو عجیب طریقہ سے بیان کیا ہے ؎

مری گواہی کو محشر میں آپ تو آئے ۔۔۔ تری نظر سے ٹپکتا ہوا لہو آئے

غافل بوہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں ۔۔۔ بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

غافل انسان کو اپنی خود آرائی کا وہم ہو گیا ہے اور کسی کام کے بننے پر وہ گمان کرتا ہو کہ یہ کام میں نے بنایا۔ مگر دراصل دنیا میں ایک کام بھی ایسا نہیں ہے جو بغیر حکم الٰہی کے بنتا ہو۔ قدرت الٰہی ہر چیز کی خبرگیراں ہے۔ یہاں تک کہ گھاس جیسی بے قدر چیز کی مشاطگی کے واسطے بھی اس نے صبا کو مقرر کر دیا ہے۔ خود آرائی سے یہاں عام کاروائی اور کارروائی مراد ہے اور اسی لفظی رعایت کی وجہ سے دوسرے مصرع میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو حسن کو نمایاں کرنے والی ہیں علامہ فیضی ایک جگہ لکھتا ہے کہ ؎

بے عشق اہراد بہ دستان ۔۔۔ برگے نہ چمد و بر من گلستان

سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ؎

گرچہ تیر از کمان ہمی گذرد ۔۔۔ از کماندار بیند اہل خرد

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ ۔۔۔ صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

بزم شراب سے عیش کی تمنا نہ رکھ کہ رنگ (یعنی عشرت) ایک ایسا شکار ہے جو اس دام گاہ یعنی بزم شراب سے چھڑک کر نکل گیا ہے۔ حاصل یہ کہ عیش نے بھی یہاں رہنا باعث کلفت سمجھا۔ اور اب وہ یہاں نہیں مل سکتی یہ بھی معنی نکل سکتے ہیں کہ عیش کبھی دنیا میں تھی مگر اب وہ اٹھ گئی۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے ۔۔۔ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

رحمت الٰہی اگر ہماری اس شرم کو جو ہمیں گناہ کرنے سے ہے اور جس کی وجہ سے ہم گناہ کا عذر کرتے ہوئے بھی شرماتے ہیں قبول کرے تو کچھ عجب نہیں ہے پہلے ایک جگہ ایسا ہی خیال یوں ادا کر چکے ہیں ؎

ہے عذر کرم تقصیر سے ہے شرم نارسائی کا ۔۔۔ بجز خط لب ... دعویٰ پارسائی کا

واقعہ یہ ہے کہ ایک قادرالکلام شاعر ایک ہی خیال کو مختلف صورتون مین ایسے بیان کر جاتا ہے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہین -

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہون مین کہ ہے
پرگل خیال زخم سے دامن نگاہ کا

مین مقتل مین عجیب خوشی کے ساتھ جاتا ہون کہ میری نگاہ کا دامن گل زخم کے خیال سے لبریز ہے ایک اور جگہ فرماتے ہین ؎

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہین ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤن سے ہے دو قدم آگے

جان در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

ہوا بمعنی خواہش اور شوق - یعنی اسد کی جان ایک نگاہ گرم کی خواہشمند ہے اور تیرے دادخواہ کا وکیل پروانہ ہے جیسے وہ شمع کی نگاہ گرم سے جل جاتا ہے اسی طرح تیرا دادخواہ بھی جلنے کا متمنی ہے پروانہ کو وکیل اس لیے بنایا ہے کہ وہ شمع کی نگاہ گرم سے جل جانے کی معشوق کے سامنے نظیر پیش کرے -

جور سے باز آئے پر باز آئین کیا
کہتے ہین ہم تجھکو منہ دکھلائین کیا

ظلم سے وہ باز آگئے مگر کیونکر ظلم سے باز آسکتے ہین یعنی اب باز آکر کہتے ہین کہ ہم تجھکو کیا منہ دکھائین کہ ہم نے تیرے اوپر بہت ظلم کیے ہین یہ بھی گویا ایک ظلم ہے - حاصل یہ کہ معشوق اگر چاہے بھی تو ظلم ترک نہین کرسکتا -

رات دن گردش مین ہین سات آسمان
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائین کیا

ہم کسی کام کے ہونے نہونے سے کیون گھبرائین سات آسمان گردش مین ہین ان کے پھرنے اور گردش کرنے کا آخر کوئی نتیجہ ضرور ہوگا اور جو کچھ ہونا ہوگا وہ ضرور ہوکر رہیگا یا یہ کہ ہم جو زندگی سے گھبرا کر مرنے کی تمنا کر رہے ہین یہ فضول ہے سات آسمان رات دن گردش کر رہے ہین آخر اُن کی گردش سے عمر ضرور تمام ہو جائے گی - ایک جگہ فارسی مین بھی مضمون لکھا ہے فرماتے ہین ؎

بہفت اختر و نہ چرخ خود آخر بچہ کار اند — بر قتل من این عربدہ با یار روا نیست

اسکا دوسرا مصرع وہی ہے جو لکھا ہے کہ یہ مضمون دوسرا گر نفس مطلب بالکل ایک نکلا ہے فرق یہ ہے کہ یہ خیال مکمل ادا ہوا اور دوسرے میں غیر مکمل ہے

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے — عمر یونہی تمام ہوتی ہے

منشی امیر احمد تسلیم نے اس مضمون کو نہایت ہی اچھے طریقہ سے ادا کیا ہے اگرچہ بادی النظر میں دھوکا ہوتا ہے کہ کچھ اور معنی ہیں مگر دراصل مطلب یہ ہے

آسمان گردش میں ہیں میرے ستانے کیلئے — چکیاں ذچل رہی ہیں ایک دانہ کے لئے

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

اگر اس کو ہمارے ساتھ دشمنی بھی ہو تو بھی ہم اپنے دل کو سمجھا لیں کہ اس کو ہم سے محبت ہے مگر جب وہاں نہ عداوت ہے نہ محبت پھر کیونکر دھوکا کھائیں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو — کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

نامہ بر کو خط دیکر ہم اس کے ساتھ کیوں ہو لئے یا الہٰی یہ ہمیں کیا ہو گیا کیا ہم اپنے خط کو آپ پہونچائیں اس سے کمال رشک اور جنون کا اظہار دونوں مطلب لئے جا سکتے ہیں۔

موج خون سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے — آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

چاہے ہم قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں مگر اس کے در سے نہ اٹھیں گے کیا تحقیر کے لئے ہے کہ کیا اس در سے اٹھا کریں ایک اور جگہ فرماتے ہیں

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

تمام عمر ہم نے مرنے کی راہ دیکھی اب دیکھئے مرنے کے بعد ہم کیا رنگ دکھاتے ہیں یا یہ کہ عمر بھر انھوں نے ہم کو مرنے کی راہ دکھائی اب دیکھئے جاشتہ پہ ہم کو کیا دکھاتے ہیں۔

موخر الذکر مضمون پر مولانا نظم اور حسرت صاحب دونوں متفق ہیں مگر مجھے شعر کے مصرع اولیٰ کو دیکھتے ہوئے ان معانی کا یقین نہیں آتا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

وہ لوگوں سے میری بینوائی اور عشق وغیرہ کا تذکرہ سنکر پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے اب کوئی ہمیں یہ بتاسے کہ اُسے ہم کیا بتائیں کہ غالب کون ہے۔ نعمت خان عالی ایک جگہ کہتا ہے ؎

زمردم یار می پرسد کہ حالی کیست طالع بین — کہ عمرم در محبت رفت و کارم آخر رسید اینجا

مگر غالب کے مصرع ثانی کا جواب نہیں ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

لطافت کا بغیر کثافت کے لطف نہیں آسکتا۔ آئینۂ بادِ بہاری ایک نہایت ہی لطیف شے ہے مگر بغیر زنگار چمن کے اس کا جلوہ نہیں ہوسکتا۔ اور اس کا غرا نہیں ہے جلوے کے لغوی معنی ظاہر ہونے کے ہیں اس لحاظ سے شعر کا یہ مطلب ہے کہ لطافت کا اظہار بغیر کثافت کے نہیں ہوسکتا جب تک زنگار چمن (سبزہ زار) نہ ہو اس وقت تک آئینہ بادِ بہاری کو کوئی نہیں دیکھتا۔ حاصل یہ کہ یہ دونوں باہم متعلق اور لازم و ملزوم ہیں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر — تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

یا یوں کہئے آئینہ بادِ بہاری پر زنگ لگا تو سبزہ زار پیدا ہوا۔

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل — جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

حریف ہم پیشہ کو کہتے ہیں چونکہ دو ہم پیشہ اکثر ایک دوسرے پر تفوق اور امتیاز ڈھونڈنے کی وجہ سے دشمن ہوجاتے ہیں اس لیے بے تکلف اس کے معنی مجازی دشمن کے قرار دیدیے گئے ہیں یہاں یہی معنی مقصود ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ ساحل اگرچہ خوددار ہے مگر اسکی خودداری جوشش دریا کی حریف بن کر مقابلہ نہیں کرسکتی ایسے ہی جب بزم میں تو ساقی ہو

وہان ہوشیاری کا دعویٰ بے بنیاد اور باطل ہے۔ گویا دعویٰ ہوشیاری ایک ساحل خود داری ہے۔ اور تیری ساقی گری جوشش دریا ہے۔ اس جوشش کے سامنے اُس ساحل ہوشیاری کو مجبوراً غرق آب ہونا پڑتا ہے۔ ایک جگہ علیہ الرحمہ یون فرمایا ہے

بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی　　جو تو دریائے مے ہے تو مین خمیازہ ہون ساحل کا

شرح اس کی پہلے لکھی گئی ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا مین فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ جب دریا مین مل جاتا ہے تو بظاہر فنا ہو جاتا ہے کیونکہ پھر اُس کو کوئی قطرہ کے نام سے نہین پکار سکتا۔ مگر یہ فنا دراصل اُس کی بقا کا موجب ہے کیونکہ ظاہر ہے بالکل علیحدہ رہ کر وہ مٹ جاتا اور اب دریا مین مل کر وہ مٹ نہین سکتا صرف اس کا نام تبدیل ہو گیا ہے۔ اسی صورت سے جب درد حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو بظاہر فنا کر دیتا ہے مگر دراصل وہ درد کی دوا ہو جاتا ہے اور فنا کر کے عالم بقا مین پہونچا دیتا ہے۔ سید محمد حسین کوثر لکھنوی کا شعر ہے ؎

آخر غم فراق ہی راحت فزا ہوا　　جب درد بڑھ گیا تو وہی اک دوا ہوا

تجھ سے قسمت مین مری صورت قفل ابجد　　تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

قفل ابجد اُس تالے کو کہتے ہین جسپر بنانے والا کوئی کلمہ لکھ دیتا ہے جب اُس کلمہ کے حروف کو متفرق کر دیتے ہین تو وہ قفل بند ہو جاتا ہے۔ اور جب انھین حروف کو جمع کر کے وہ کلمہ بناتے ہین جو واضع نے اسپر کندہ کیا ہے تو قفل کھل جاتا ہے اسی طرح مصنف اپنی قسمت کو اس سے مشابہ کرتا ہے کہ میری قسمت مین یہ لکھا تھا کہ جب تیرے ملنے کی تدبیر بن پڑے تب ہی تو مجھ سے جدا ہو جائے کسی اور شاعر نے اس کا چربہ یہ اُتارا ہے ؎

قفل ابجد کی طرح تھی مری قسمت شاید　　بنتے ہی بات کے ہوتا ہے وہ عیار جدا

دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت مین تمام　　مٹ گیا گھسنے مین اس عقدہ کا وا ہو جانا

کشمکش فکر علاج میں دل تمام ہوگیا - گویا کھولنے کی فکر میں یہ گرہ مٹ گئی اور ناخن تدبیر نے اس کا کام تمام کر دیا - دل کی عقدہ سے نہایت اچھی تشبیہ ہے -

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

تو پہلے ہماری وفا کے بدلے میں ہم پر جفا کرتا تھا مگر تو نے جب دیکھا کہ ہم جفا کو بھی خوشی سے برداشت کرتے ہیں تو تو نے جفا سے بھی ہاتھ اٹھا لیا اُن ارباب وفا سے اور بیچارے عاشقوں سے اس قدر دشمنی - اللہ اللہ از راہ استعجاب کہا گیا ہے - ایک جگہ اور بھی فرماتے ہیں ؎

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

یہ مسئلہ کہ پانی ہوا ہو جاتا ہے ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا - اور ہم کہتے تھے کہ ایک عنصر دوسرا عنصر کیونکر بن سکتا ہے - مگر اب ہم کو یقین آگیا اور ہم سمجھے کہ یہ خیال صحیح ہے پانی ہوا ہو سکتا ہے کیونکہ جب ہم میں طاقت تھی تو نالہ کرتے تھے مگر اب ضعف کی حالت میں ہم نالہ نہیں کر سکتے صرف آہ ہو سکتی ہے تو معلوم ہوا کہ وہی پانی (نالہ) اب ہوا (آہ) کی صورت میں بدل گیا ہے ایک جگہ ہوا کو پانی اس صورت سے بنایا ہے ؎

ز نالہ کار بہ اشک اوفتاد و دل خون باد — ز شرم بے اثری ہا فغان من آب است

فغان سے مراد آہ و نالہ ہے جو ایک ہوا ہے یا ہوائی کیفیت ہے اس میں اشک و نالہ کی تفریق سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے یہاں رونے کو جس میں آنسو بھی ہوتے ہیں نالہ نہیں کہا ہے - بلکہ مراد آہ و فغان سے ہے اگرچہ یہ ایک جدا اور نیا مضمون ہے مگر مناسب محل سمجھ کر لکھ دیا گیا - ایک جگہ مرزا ثاقب اسی زمین میں ایک شعر میں مسئلہ استحالۂ عناصر ان بیان کرتے ہیں ؎ خاک بھی اس دل سوزاں کی ملی ڈھونڈے میں تب مجھے معلوم ہوا شعلہ کا ہوا ہو جانا یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ غالب کی تقلید کی گئی ہے مگر جس خوبی سے کہ یہ مضمون غالب کے یہاں ادا ہوا ہے مرزا ثاقب اس صورت سے ادا نہیں کر سکے مطلع ہمیں ثاقب صاحب نے خوب فرمایا ہے اگرچہ اس میں بھی غالب کا تتبع ظاہر ہے ؎ دلکو تاکید وفا ہے کہ وفا ہو جانا درد کو حکم تقاضا کہ ادا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

میرے دل سے تیرے انگشتِ حنائی کا خیال مٹنا ایسا سخت دشوار ہوگیا جیسے کہ گوشت سے ناخن کا جدا ہونا دشوار ہوتا ہے۔ یہ تشبیہ نہایت مناسب ہے

ہے مجھے ابرِ بہاری سے برس کر کھلنا روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

میرے لیے روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا ایسا باعث انبساط ہے جیسے ابر کو برس کر کھلنا۔ واضح ہو کہ برس کر کھلنا اوس جگہ بولتے ہیں جب ابر خوب برسا ہو۔ اس شعر میں تشبیہ پیدا ہو گئی ہے۔

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

اگر گل کو تیرے کوچہ میں جانے کی ہوس نہیں ہے تو کیا سبب ہے کہ وہ ہوا کی گردِ راہ بنتی ہے یعنی وہ ہوا میں کیوں شامل ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ فعل اس کا محض اس لیے ہے کہ چونکہ صبا کا ہر جگہ گذر ہوتا ہے اور یہ اس کوچہ میں بھی جائیگی تو اس بہانے سے میں بھی وہاں پہونچ جاؤنگی۔

تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

اگر تو چاہے کہ ہوا۔ یعنی خواہش اور عشق کے اعجاز کو دیکھے تو برسات میں آئینۂ فولادی کو دیکھ کہ اسپر زنگ لگ جاتا ہے۔ یہ زنگ محض جذبِ عشقِ صیقل کی وجہ سے ہے کہ زنگ لگے گا تو صیقل ضرور کیجائیگی۔ نیز اس میں آئینہ معشوق بھی اور عاشق بھی دونوں طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

جلوۂ گل میرے دل میں اشتیاق دید پیدا کرتا ہے لہذا آنکھ کو ہر صورت میں کھل جانا چاہئے۔ اور گلہائے رنگا رنگ کی سیر کرنا چاہیئے۔ یعنی انسان کو ہر فن مولا بنکر زندگی بسر کرنا چاہئے

یا یہ کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تقاضہ کرتا ہے کہ آدمی چشم بینا سے اُسکو دیکھے اور صانع حقیقی کو پہچانے ۔ یا یہ کہ آنکھ باغ جہان کے ہر رنگ کو دیکھے۔

(ردیف ب)

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب ۔ دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موج شراب

پھر وہ وقت آیا کہ بطِ مے (یعنی صراحی جو بشکل بط ہو) پرواز کرے اور بطِ مے کو جو شناوری بطِ مے کو دوست رکھتا ہے۔ شنا کرنے یعنی تیرنے کے لیے موج شراب یا دریائے امواج شراب عنایت کرے۔ ظاہر ہے کہ بط ایک دریائی جانور ہے اور وہ اکثر تالابون جھیلون دریاؤن وغیرہ مین رہتا ہے۔ حاصل یہ کہ پھر فصل بہار آگئی چاہیئے کہ شراب کا دور چلے۔ بطِ مے کی بال کشائی کو دور شراب سے استعارہ کیا ہے۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستی ارباب چمن ۔ سایۂ تاک مین ہوتی ہے ہوا موج شراب

ارباب چمن (باغ کے سرسبز درخت) سیہ مست ۔ بہت مست ۔ تاک انگور کی ٹٹیان مطلب یہ ہے کہ جو ان چمن جو سیہ مست ہو رہے ہین اسکی وجہ نہ پوچھ۔ بات یہ ہے کہ سایۂ تاک کی ہوا موج شراب کا اثر رکھتی ہے۔ چونکہ یہ اُس سایہ سے ہو کر گذرے ہین اسوجہ سے بدمست ہو کے جھوم رہے ہین۔ سیہ مست اسوجہ سے کہا ہے کہ درختون کی گہری سبزی سیاہی کی حد تک پہونچ جاتی ہے اور یہ تشبیہ بے مثال ہے

جو ہوا غرقۂ مے بخت رسا رکھتا ہے ۔ سر سے گذرے پہ بھی ہے بال ہما موج شراب

حالانکہ پانی مین غرق ہو جانا باعث موت ہے مگر یہان معاملہ برعکس ہے کہ اگر موج شراب سر سے بھی گذر جائے تو گویا جسکے سر سے وہ موج گذرے اُسکے سر پر سے ہما گذرا جس کا سایہ پڑنا اور سر سے گذرنا رسائی بخت کی دلیل ہے۔ موج شراب کا سر سے گذرنا ۔ نشہ چڑھنے یا اُس کے نیچے تباہ ہونے کے بھی معنی پیدا کرتا ہے۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہی اگر موج ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

یہ برسات وہ موسم ہے کہ اسکی بہار سے جب بہت سی کیفیتوں اور بہت سی اشیا مین انقلاب پیدا ہو جاتا ہی تو اس بات کو دیکھتے ہوے کیا تعجب ہی کہ ہوائے بہار فیض موج ہستی کو موج شراب بنادے۔ چونکہ ہوائے بہار بھی نشاط آور ہے اور شراب بھی باعث سرور ہے اسواسطے مبالغہ مین یہ صورت پیدا کی گئی۔ موج ہستی اس لیے کہا گیا کہ دنیا بھی گذران ہے۔ اور یہ تشبیہ بالحرکت ہے جو نہایت لطیف ہے۔

چار موج اٹھتی ہین طوفانِ طرب سے ہر سُو موجِ گُل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

طوفان طرب سے ہر طرف چار موجین اٹھتی ہین اور انکا ہر طرف جوش ہے۔ موج گل یعنی چار طرف رنگارنگ پھول کھلے ہوے ہین (موج شفق) آسمان پر ہر طرف شفق پھولی ہوئی ہے (موج صبا) ہر طرف نسیم خوشگوار اٹھکھیلیان کرتی پھرتی ہی اور جابجا شراب کا دور ہے۔ مصنف نے اس شعر مین بہار کی تصویر کھینچ دیتی ہی

جس قدر روح نباتی ہی جگر تشنۂ ناز دے ہے تسکین بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

روح نباتی یعنی سبزہ جسقدر جگر تشنۂ ناز ہے یعنی سبزہ جسقدر لہلہانا چاہتا ہے۔ اور نمو اور ناز کی خواہش رکھتا ہے اُسیقدر موج شراب اپنے آب بقا کے گھونٹون سے اُسکو تسکین اور تقویت دیتی ہی۔

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک مین خون ہو ہو کر شہپرِ رنگ سے ہے بال کُشا موجِ شراب

بادہ شراب انگور کی بیلو نمین خون ہو ہو کر دوڑ رہا ہے۔ تو گویا اُس کا وہ دوڑنا پرواز کرنا ہے اور یہ رنگینی پر پرواز ہے جو بیلو نکے پتون وغیرہ پر ظاہر ہے تو گویا یہ رنگ موج شراب ہے۔ مولانا نظم نے لکھا ہے کہ لفظ خون مین اعلان نون فصیح ہے۔ اور اکثر فصحا بغیر اعلان اسکو استعمال بھی نہین کرتے۔ مگر میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہین ہے دونون صورتون مین فصیح ہے۔ عرفی ایک جگہ کہتا ہے ؎

خون کہ از مہر تو شد شیر بہ طفلی خوردم — ہمچنان خون شد و از دیدہ برون می آید

اسیطرح سیکڑون شعر مل سکتے ہین دل راحت پسند زحمتِ تلاش کو فضول سمجھتا ہے

موجۂ گل سے چراغان ہے گذرگاہ خیال — ہے تصور مین ز بس جلوہ نما موجِ شراب

چونکہ میرے تصور مین موجِ شراب جلوہ نما ہے اور موجِ شراب اپنی رنگینی کی وجہ سے مثل موجۂ گل ہے اور موجِ گل چراغان سے مشابہ ہے تو میرے گذر گاہ خیال مین گویا چراغان کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے —

ایک عالم پہ ہین طوفانی کیفیت فصل — موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

یعنی موجِ سبزہ اور موجِ شراب نے ایک جہان کے اوپر کیفیت فصل کا طوفان ظاہر کر دیا ہے - طوفانی طوفان ظاہر کرنیولے حاصل ہے کہ اُن دونون نے دنیا مین نشاط وطرب کا طوفان اُٹھا رکھا ہے —

Junaid 20.3.88

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل — رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

موسمِ گل عجیب چیز ہے جس سے ہنگامۂ ہستی کی شرح ہو رہی ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ بہار کی نشاط اور خوشگواری بھی چند روزہ ہے اور ہنگامۂ ہستی کی پائداری اور خوشی کا وجود بھی بے بقا ہے اسواسطے موسمِ گل اُسکی شرح ہے - موجِ شراب نہایت اچھی چیز ہے جو قطرہ کو دریا سے ملا دیتی ہے یعنی بے خود و مدہوش کر کے فنا سے مشابہ کر دیتی ہے - اور فنا روح کو اُسکے مرجع کیطرف لوٹا دیتی ہے جسکی تفصیل ـــ٥
عشرتِ قطرہ ہے دریا مین فنا ہو جانا مین گذر چلی ہے
موجِ شراب کا قطرہ کو دریا مین ملا دینا -
ایک لطف رکھتا ہے جو طبع سنجیدہ پر پوشیدہ نہین ہے -

ہوش اُڑتے ہین مرے جلوۂ گل دیکھ اسد — پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

اسد جلوۂ گل کو دیکھکر میرے ہوش اُڑے جاتے ہین اور اس سے پتہ چلتا ہے

کہ شراب کے دور کا وقت آپہونچا ہے یا یہ کہ اسد ذرا جلوۂ گل کو دیکھ سہرے تو اس کو دیکھکر ہوش وحواس غائب ہوئے جاتے ہیں لہذا شراب پینی چاہیئے ۔

(ردیف ت)

افسوس کہ دیدان کا کیا رزق فلک نے   جن لوگون کی تھی درخور عقد گہر انگشت

دیدان کیڑونکو کہتے ہین اس صورت مین یہ معنے پیدا ہوتے ہین کہ افسوس جن لوگون کی انگلیان سلک گہر کے قابل تھین انکو فلک کینہ جو نے فنا کر کے کیڑونکا رزق بنا دیا جیسے کہ ایک جگہ خاقانی فرماتے ہین ؎

ببین بادام چشمان را کہ دیدی اندرین دنیا   بگرد خانہ چشمش موران کاروان بینی
شہنشاہی کہ بر قصرش ہزاران پاسبان بودی   کنون بر قبہ گورش کلاغان پاسبان بینی

اور اکثر نسخون مین بجائے دیدان کے دندان دیکھا گیا ہے ۔ اس صورت مین یہ مطلب نکلتا ہے کہ افسوس آسمان نے ان عقلا کی انگلیان جو عقد گہر کی قابل تھین دانتونکا رزق بنا دیا ہے ۔ یعنی وہ اسکے انقلاب سے انگشت بدندان ہین ۔ یا اسکے ظلم سے اپنی انگلیان چباتے ہین ۔

کافی ہے نشانی تری ۔ چھلے کا نہ دینا   خالی مجھے دکھلاکے بوقت سفر انگشت

سفر کے وقت نشانی کے لیے چھلا وغیرہ دیتے ہین مصنف کہتا ہے کہ مجھے تیری یہی نشانی کافی ہے کہ تونے مجھے خالی انگلی دکھا دی اور نشانی نہ دی ۔ یا شوخی سے انگوٹھا دکھا دیا ۔

لکھتا ہون اسد سوزش دل سے سخن گرم   تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

اسد سوزش دل کی وجہ سے مین سخن گرم لکھتا ہون (سخن گرم خوبی سخن سے مراد ہے) اور یہ گرم سخن اس لیے ہین کہ کوئی میرے حرفون پر انگلی نہ رکھ سکے ۔ یعنی عیب جوئی نہ کر سکے ۔ اس شعر مین صنعت رعایت لفظی گرم بازاری ہے ۔ ایک جگہ مومن مرحوم

یون فرماتے ہین ؎

کیا تاب ہے میرے حرف پہ انگشت رکھ سکے　　ہر خط پہ نکتہ چین کو ہے وہم و گمان تیغ

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت　　پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

اگر کوئی قیامت تک زندہ رہا تو کیا پھر بھی اک روز مرنا ضرور ہے بقول شخصے ؎

جب فنا ٹھہری تو پھر کیا سو برس کیا ایک دن

جگر کو مرے عشق خونناب مشرب　　لکھے ہے خداوند نعمت سلامت

عشق جس کا مشرب خون پینا ہے۔ میرے جگر کو ہمیشہ خداوند نعمت لکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اسی کے خون سے پرورش پائی ہے۔ مشرب اس جگہ اگرچہ اردو ہے مگر بہت مناسب واقع ہوا ہے۔

علی الرغم دشمن شہید وفا ہون　　مبارک مبارک سلامت سلامت

علی الرغم دشمن یعنی بخلاف دشمن کے مین شہید وفا ہون۔ اسی پر خود کو مبارکباد دیتا ہے یعنی دشمن شہید وفا نہین ہوا ہے اور مین شہید وفا ہون۔ مبارک سلامت پورا جملہ مبارکباد کا ہے مولانا نظم نے اپنی شرح مین یہ لکھا ہے کہ مبارک اسوجہ سے کہ رقیب کے خلاف مراد ہے اور سلامت اسوجہ سے کہ شہید وفا زندۂ جاوید ہے۔

نہین گر سر و برگ ادراک معنی　　تماشائے نیرنگ صورت سلامت

اگر دریافت معنی کا سامان نہین ہے تو نہ سہی۔ نیرنگی صورت یعنی ظاہری اجسام وغیرہ کا دیکھنا ہی غنیمت ہے۔ کہ اثر کو دیکھکر موثر کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی عشق مجازی زینہ ہے عشق حقیقی کا۔

مند گئین کھولتے ہی کھولتے آنکھین غالب　　یار لائے مری بالین پہ اسے پر کس وقت

کھولتے ہی کھولتے آنکھیں بند ہو گئیں یعنی موت آگئی - یاروں نے مجھ پر احسان کیا کہ کوشش کر کے اسکو میری بالین پر لائے مگر اب وقت نکل چکا تھا - لانا بیکار ثابت ہوا - اسی مضمون کو یوں کہا گیا ہے ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دود شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

خط کے نکلنے سے بازار حسن دوست سرد ہو گیا - شاید خط رخسار حسن کی شمع کشتہ کا دھواں تھا - اس میں سبزہ رخسار کی برائی کی گئی ہے - شیخ شیراز بھی ایک جگہ اسی موقع پر فرماتے ہیں ؎

سبزہ در باغ گفتہ اند خوش است
داند آنکس کہ این سخن گوید
یعنی از روے نیکوان خط سبز
دل عشاق بیشتر جوید
بوستان تو گند نا زار یست
بسکہ بر مے کنی و مے روید

ایک جگہ یوں فرماتے ہیں ؎

گر دست بجان داشتمی ہمچو تو بر ریش
نگذاشتمی تا بہ قیامت کہ بر آید

اے دل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر
کون لا سکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

اے ناعاقبت اندیش دل اپنے شوق دید کو ضبط کر - کوئی ایسا ہے کہ جلوۂ دوست دیکھ سکے یہ تلمیح ہے قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف - اس قسم کے شعر بہت سے ہیں اور یہ مضمون قریب قریب تمام شعرائے ہند کا کہا ہوا ہے -

خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجیے
صورت نقش قدم ہوں رفتۂ رفتار دوست

دیکھیے حیرت نے کیسا میرا گھر اجاڑا ہے کہ مجھکو نقش قدم کی مانند وارفتۂ رفتار دوست بنا دیا ہے وارفتہ یعنے آوارہ - اور بحیثیت رفتار کے عشق میں وارفتہ ہونا ایک نہایت لطیف مناسبت لفظی ہے - تماشا کردن فارسی کا محاورہ ہے - جس کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے - مگر اردو میں - دیکھنا - ملاحظہ کرنا - موجود ہے - اور وہ اچھا ہے

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے — کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

اگرچہ میں دوست کا بیمارِ عشق تھا۔ اور اسی میں مجھکو مرنا چاہیے تھا۔ مگر میری محرومی قسمت دیکھیے کہ اس میں مرا تو دشمن کے ہاتھ سے مرا یعنی دشمن کے رشک میں مجھکو موت آئی۔ اور اس صورت میں کشتۂ دوست کے خطاب سے مفتخر نہو سکا۔

چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے — دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

چشمِ ما روشن۔ دل ما شاد۔ خوشی کے محل پر بولتے ہیں۔ چونکہ وہ بیدرد ہمارے رنج اور ہمارے دُکھ سے خوش ہے ہم اس سے بہت خوش ہیں۔ گویا ہمارا دیدۂ پُرخون اسکے لیے۔ شراب کا لبریز ساغر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ چشمِ ما روشن محض رعایت لفظی کے لحاظ سے لایا گیا ہے۔ مگر اس محل پر نہایت مناسب ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ہے محذوف ہے۔ اور یقیناً ایسا حذف بقول جناب حسرت موہانی نہایت ناگوار ہے۔

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُسکے ہجر میں — بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

یہ ایک قطعہ ہے۔ واضح ہو کہ مصنف کے زمانہ تک غزل میں قطعے لکھے جاتے تھے۔ مگر آجکل یہ رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ اور بعض شعرا اسکو عیوب شاعری سے سمجھتے ہیں۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جو محض تک بندی کر لیا کرتے ہیں اور جنکو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جب غزلیں مسلسل لکھی جاتی تھیں اور مقطع وغیرہ کسی چیز کی بھی پروا نہ کیجاتی تھی شاعری محض اظہار جذبات کا ایک آلہ تھا اور وہ سب قیود سے آزاد تھی اب تو شاعری کا یہ رنگ ہے کہ لفظ لفظ میں ذم کے پہلو نکالے جاتے ہیں اور یہ حالت خصوصیت سے لکھنؤ میں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ جو لوگ ایسے اعتراضات کرتے ہیں وہ خود یہ بھی نہیں جانتے کہ ذم کس جانور کا نام ہے اور تنافر کس چڑیا کو کہتے ہیں۔ مثال کے لیے لیجیے۔ کہ غالب کے اسی شعر میں (غیر یوں کرتا ہے) کو کہئیے ذم سے تعبیر کیا جاتا۔ حالانکہ اگر کبھی ناانصاف فرقہ غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی شعر بھی ایسا نہ ملے گا کہ جسمیں یہ پہلو نہیں نکالے جا سکتے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ امرا القیس علیہ

جیسا آدمی خود ہوتا ہے ویسا ہی دوسرے کو سمجھتا ہے۔ خرابیٔ اخلاق دوسرے کو بھی برا سمجھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایکدن کا ذکر ہے کہ مین نے اپنے ایک دوست کے سامنے مولانا حالی مرحوم کا یہ شعر پڑھا ؎

کیون چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھین گے ہم سبب تو بتا یا نہ جائے گا

شعر سنکر فرمایا کہ اسمین ذم ہے۔ آگے انھون نے جو کچھ وجہ بیان فرمائی میرا قلم اسکو نہین لکھ سکتا۔ مین کچھ کا کچھ لکھنے لگا۔ حالانکہ ابھی شعر کا مطلب بیان نہین کیا۔ سنیے غیر میری حالت کی اسطرح پرسش کرتا ہے جیسے کوئی دوست کسی دوست کا حال پوچھتا ہے ۔

تا کہ مین جانون کہ ہے اسکی رسائی وان تلک
مجھکو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست

اور یہ پرسش حال کچھ ازراہ مہربانی نہین ہے بلکہ مطلب کچھ اور ہے یہ جتانے کے لئے کہ مین یہ سمجھون کہ اسکی وہان تک رسائی ہے اسواسطے دوست کے وعدۂ دیدار کا مجھکو پیغام دیتا ہے ۔

جبکہ مین کرتا ہون اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

جب مین اُس سے اپنے ضعف دماغ کی شکایت کرتا ہون۔ یعنی یہ بات کہتا ہون کہ خاموش رہ میرا دماغ بہت ضعیف ہے مجھے کوئی بات سننے کی تاب نہین ہے تو وہ اور بھی زلف مشکبوئے یار کے قصہ کو طول دیتا ہے اور چھیڑتا ہے۔ سر کرنا فارسی محاورہ ہے شروع کرنے کے معنے مین اردو مین غیر فصیح ہے زلف کو شعرا مشکبو۔ اور عنبرین لکھتے ہین اس لحاظ سے شکوۂ ضعف دماغ پر اُس کا وہ قصہ چھیڑنا لطف سے خالی نہین ہے ۔

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

اگر مجھکو چپکے چپکے روتے دیکھ پاتا ہے تو اسکی شوخ گفتاری کا تذکرہ کرتا ہے

مہربانی ہاے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیان کیجیے سپاس لذت آزار دوست

اسحالت مین دشمن کی ان مہربانیون کی جو وہ میرا جی جلانے کے لیے کرتا ہے شکایت کرون - یا لذت آزار دوست کا شکریہ کرون کہ وہ اس کا اتنا ہمراز ہو گیا -

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ ہے ردیف شعر مین غالب زبس تکرار دوست

مجھے اپنی یہ غزل دل سے پسند ہے کیونکہ غزل کی ردیف مین بار بار لفظ دوست جو مجھکو پیارا ہے زبان پر آیا ہے بائے معنی

سنا تو نگا نصیحت پر نہ سنتا مین تو کیا کرتا کہ ہر اک بات مین ناصح تمھارا نام لیتا تھا

(ردیف ج)

گلشن مین بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

یعنے آج باغ مین عجیب طریقہ سے انتظام کیا گیا ہے - قمری (جو ایک مرغ نوا سنج چمن ہے) بھی اندر نہین جا سکتی اور اس کا طوق اسکے واسطے حلقہ بیرون در بنا ہوا ہے حلقہ بیرون در سے اندر کے جانے کی روک ٹوک مراد ہے - شیخ علی حزین فرماتے ہین ؎

عجب مدار کہ جوہر حلقہ بیرون در گردد
چنین کہ آئینہ حسن تو لبریز صفا گردد

یعنے میرا آئینہ حسن صفا کی لبریز ہو رہا ہے عجب نہین ہے کہ جوہر آئینہ حلقہ بیرون در بنجائے -

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغان کے ساتھ
تار نفس کمند شکار اثر ہے آج

آج ہم جب نالہ کرتے ہین تب ہی ایک دل کا ٹکڑہ اس فغان کے ساتھ آتا ہے شاید آج ہمارے نفس نے کمند بنکر اثر فغان کو شکار کر لیا ہے یعنی آج ہمارے آہ و نالہ مین اثر ہوا ہے کیونکہ ہم مدت سے چاہتے تھے کہ کسطرح موت آئے آج اسکے کچھ آثار ظاہر ہوئے ہین دوسری شرحون مین اسطرح اس شعر کے معنے بیان کئے گئے ہین تار نفس نے کمند ہو کے اثر کو شکار کر لیا ہے لیکن اس اثر کا نتیجہ الٹا ہے کہ ہر فغان کے ساتھ ایک پارۂ دل باہر آتا ہے یعنی اثر آہ سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے اثر آہ کے اس الٹے نتیجہ کے ذکر سے اپنی بدبختی کا اظہار منظور ہے میرے نزدیک ایک

سیدھے سادے مطلب کو چھوڑ کر تاویل سے کام لینا فضول ہے نیز دوسرا مصرعہ طنزیہ بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ باقی اُن معنوں کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا موخر الذکر معنی سے ملتا جلتا میرا ایک شعر ہے ؎

نہیں کوئی سہارا اب تو یداسے مرگ مایوسی
مری آنکھوں کو خود دعویٰ ہی میری لگدازی کا

ایک جگہ داغ مرحوم فرماتے ہیں ؎

خُدا ہی خیر کرے آج رنگ بیڈھب ہے
تپک رہا تھا کئی دن سے آبلہ دل کا

داغ کا شعر مترادف المعنی ہونیکی حیثیت سے نہیں لکھا گیا یاد آیا اور قلم اسکے لکھنے سے باز نہ رہا۔

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

اے عافیت اور اے انتظام خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے نکل بھاگو میرے آنسوؤں کا سیلاب آج در و دیوار گرانے کے لئے تیار ہے اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی اور یہ غالب کا خاص انداز بیان ہے ؎

خراب خانۂ دل اور موج سیل سرشک
تم اپنی یاد سے کہدو کہ اب یہاں نہ رہے

لو ہم مریض عشق کے تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

کہا جاتا ہے کہ مریض عشق کی تیمارداری کے لیے کوئی نہیں ہے تو ہم اسکی تیمارداری کے ذمہ دار ہوتے ہیں مسیحا اس کا علاج کریں مگر جو مسیحا کے علاج سے وہ اچھا نہ ہو تو پھر انکا کیا علاج کیا علاج ایک محاورہ ہے جسکے معنے یہ ہیں کہ انکو کیا سزا دیجا سکے جو یہاں بہت ہی برمحل صرف ہوا۔ ذوق مرحوم بھی کچھ ایسا ہی فرماتے ہیں ؎

بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

ردیف جیم فارسی (چ)

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

بزم آرزو سے باہر نہ جا اور آرزو کرنی نہ چھوڑ اگر شراب نہیں کھینچ سکتا یا کھینچنے کو نہیں ملتی تو ساغر شراب کا انتظار کر شراب کھینچنا محض فارسی کا محاورہ ہے اور انتظار کھینچنا اردو اور فارسی زبانوں میں مشترک ہے یعنی ؎

کچھ نہ کچھ چھیڑ چلی جائے اسد   گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کمال گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ   برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

میری سعی تلاش دید معشوق کی سرگرمی کی حالت نہ پوچھ گویا حسرت دیدار نے مجھے حیران کر کے آئینہ بنا دیا ہے اور اس آئینہ میں بجائے جوہر کے وہ کانٹے ہیں جو دوڑ دھوپ میں میرے تلوؤں میں چبھے ہیں تو بجائے حال پوچھنے کے انکو میرے تلوؤں سے کھینچ لے خود ہی تجھ پر میری سعی و کوشش کا حال آئینہ ہو جائیگا گویا صورت بین عالم میں اس کا مضمون ہے یا ؎

خود دیکھ لو فقیر کی صورت سوال ہے

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل   کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

اے دل تو جو پڑے پڑے انتظار کھینچ رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انتظار نہیں ہے بلکہ راحت طلبی کا ایک بہانہ ہے۔ لہذا اٹھ اس بستر کے ناز اٹھانے سے کنارہ کر کہ پڑے رہنے میں بستر کی ضرورت ہوگی اور یہ بستر کا ناز اور احسان سمجھا گیا تار بستر سے مصنف نے اسمیں مختلف معنی پیدا کیے ہیں یعنی اٹھ صحیح اور دیکھ یا اس بستر کا ناز کھینچنے سے ہر رہ کیونکہ انتظار موت سے بدتر ہے یا یہ کہ ایک آرام طلبی کی صورت ہے اسی ضرورت سے انتظار نہ کر تجھے انتظار یار ہی کافی ہے بستر وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس   بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

نرگس تجھکو حسرت سے دیکھ رہی ہے کہ تو شراب کیوں نہیں پیتا اور چونکہ تجھ میں حیا و شرم کا مادہ ہے اس لیے شاید حیا یا اسکے ہوتے شراب نہیں پی سکتا لیکن میں تجھے بتاتا ہوں کہ میرا رقیب یعنی نرگس کور دل اور کور چشم ہے اس واسطے تجھے مے نوشی میں تکلف نہ کرنا چاہیے

نرگس کو بوجہ اسکے حسرت سے معشوق کی طرف نظارہ کرنیکے رقیب قرار دیا گیا بوجہ آنکھ سے مشابہ ہونیکے اسکو کورچشم اور بے نور ہونے کے سبب سے کور دل بتایا گیا۔ صرف بددعا کے لیے یہ لفظ استعمال کیے گئے اس شعر مین دوسرا مصرعہ بہ استثنائے ردیف فارسی ہی آخری مصرعہ مین بسبب اسکے اور قسمیہ دونون صورتین پیدا ہوسکتی ہین اور یقیناً ایسے مصرعونکی یا شعرونکی اردو زبان متحمل نہین ہوسکتی مگر مصنف پر فارسی کا رنگ غالب تھا اِس لیے انکو مورد اعتراض ٹھہرانا بیجا ہے کیونکہ وہ خود فرماتے ہین ؎

فارسی بین تا ببینی نقش ہاے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من ست

بہ نیم غمزہ ادا کر حق ودیعت ناز　　نیام پردۂ زخم جگر سے خنجر کھینچ

تیرا خنجر ناز و ادا جو میرے پردۂ زخم جگر مین امانت ہی اُسکو اپنے نیم غمزہ سے کھینچ لے اور ودیعت ناز کا حق ادا کر۔ نیام مین سے جب خنجر یعنی الف نکالین گے تو نیم تنہا رہ جائیگا صاف یہ ہے کہ مین نے مدت تک اسکو نیام پردۂ زخم جگر مین امانت رکھا ہے۔ اب اپنا خنجر کو اس نیام سے نکال اور مجھے میری مزدوری۔ جو نیم نگاہ ہے حوالہ کر۔

مرے قدح مین ہی صہبائے آتش پنہان　　بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

میرے پیالے مین شراب نہین ہے بلکہ آتش پنہان ہی لہذا کباب بھی سمندر کے دل کے دسترخوان پر لگانے چاہیئین کہ سب سامان مناسب جمع ہوجائے ایک بعید از قیاس معنی یہ ہین کہ سمندر کا دل نون ہے جسکے معنے نفی کے ہین اس صورت مین یہ معنے ہوے میرے دسترخوان پر کباب نہ رکھ کیونکہ در اصل جسکو تو شراب سمجھا ہے وہ شراب نہین ہے شراب کی تشبیہ آگ سے بوجہ سُرخ ہونیکے مشہور ہے۔ سفرہ یعنے دسترخوان۔ سمندر وہ کیڑہ جو آگ مین پیدا ہوتا ہے۔ کباب کھینچنا محاورہ نہین ہے اگرچہ فارسی مین بھی تلنے کے لیے کشیدن ہی بولتے ہین مگر اردو مین اچھا نہین معلوم ہوتا اور قطعاً غیر مانوس ہے

حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　بارے آرام سے ہین اہل جفا میرے بعد

غمزہ ابرو و چشم سے معشوق کے اشارہ کرنیکو کہتے ہین۔ غمزہ ہر وقت حسن کیساتھ کام لیتا تھا

اور اُسے تکلیف مین رکھتا۔ جب اُس حُسن و غمزہ نے مجھے قتل کر دیا ہے تب حُسن اُسکی کشاکش سے چھوٹا ہے خیر غنیمت ہے کہ ظالمونکو میرے مرنے سے آرام ملا۔ اور اب کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہین رہی اسکا حاصل یہ ہے کہ ظالمون کے ظلم مجھ پر ختم ہو گئے۔ اور میرے عشق کا کمال یہ ہے کہ اگرچہ مین جان سے جاتا رہا مگر پھر بھی اُنکو چین اور آرام سے دیکھکر مجھے خوشی ہوتی ہے۔

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

میرے بعد دُنیا مین کوئی فرد عہدۂ عشق کے قابل نہین رہا اور انداز و ادا معزول ہو گئے کیونکہ جب کوئی عاشق ہی نہین تو پھر غمزہ و ادا کس کام کے ہین۔ اسی زمین مین آتش مرحوم نے بھی اسی مضمونکو ادا کیا ہے فرماتے ہین ؎

ہو گیا سلسلہ مہر و محبت برہم نازنین بھول گئے ناز و ادا میرے بعد

یہ ایک توارد ہے۔ کیونکہ مضمون بالکل پامال اور عام ہے مگر غالب نے مناسب الفاظ جمع کرکے شعر مین جان ڈالدی ہے اور یہ مانا ہوا مسئلہ ہے ع
لفظیکہ تازہ است بہ مضمون برابر است

شمع بجھتی ہے تو اُسمین سے دھوان اُٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

چونکہ مین آتشِ عشق کے سوز و گداز سے جل بجھا ہون تو شعلۂ عشق میرے غم مین سیہ پوش ہو گیا جیسے کہ جب شمع بجھ جاتی ہے تو اُسمین دُھوان اُٹھتا ہے تو گویا وہ دُھوان نہین ہے بلکہ وہی شعلہ ہے جو شمع کے جل بجھنے کے بعد سیہ پوش ہو گیا ہے۔ میرا ایک شعر ہے ؎

دلِ مرحوم کا غم کرتے ہین سب تیرے سوا شبِ غم تک نظر آتی ہے سیہ پوش مجھے

خون ہے دل خاک مین احوالِ بتان پر یعنی اُنکے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

میرا دل خاک مین ملنے کے بعد (یعنی قبر مین) معشوقون کا حال دیکھکر نہایت غمگین اور رنجیدہ ہے کہ اُنکے ناخنونکو میرے بعد حنا کی احتیاج ہوئی۔ یعنی جب تک مین زندہ تھا وہ میرے دل کے خون سے اپنے ناخن اور ہاتھ رنگتے تھے۔ اور معشوقون کا خون مین ناخن اور

ہاتھ وغیرہ رنگنا ایک مشہور مضمون ہے۔ اس شعر میں دل کا خون ہونا ایک مناسب ٹکڑا ہے جس سے یہ پہلو نکلتا ہے کہ مٹ جانے کے بعد بھی دل خود کو اس قابل بناتا ہے کہ لگنے ناخنوں کے کام آسکے۔ جناب نظم اور حسرت صاحب نے اس شعر کے معنے یہ بیان کیے ہیں کہ معشوقوں نے میرے سوگ میں مہندی لگانا چھوڑ دیا۔ مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہیں۔ ایک جگہ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

بہ خون عزیزان فرو بردہ چنگ　　سر انگشت ہا کردہ عناب رنگ

یہ شعر میرے خیال کی تائید کرتا ہے۔

درخور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا　　نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

عرض خود کو کسی پر ظاہر کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جوہر بیداد کو اب کوئی جگہ اپنے اظہار کے لیے مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ لہذا نگہ ناز نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا۔ کیونکہ میں جو تختۂ مشق ستم ناز تھا اب باقی نہیں رہا۔ اس شعر میں عرض اور جوہر رعایت لفظی کے سبب سے لائے گئے ہیں۔ مگر وہ عرض جو جوہر کی ضد ہے عرض بر وزن مرض بہ اے مفتوح ہے اور یہ بسکون را ہے۔

ہے جنون اہل جنوں کے لیے آغوش وداع　　چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

میرے ساتھ جنون عشق دنیا سے اٹھ رہا ہے چاک گریبان (یعنی گریبان کا پھٹنا) ایک آغوش واشدۂ وداعی ہے جو گریبان سے میرے بعد جدا ہوتا ہے۔ حاصل یہ رسم جنون اہل جنون میں میرے بعد باقی نہ رہے گی۔ اور اب کسی گریبان کو پھٹا ہوا نہ دیکھو گے۔ یہ مضمون تو نہیں ہے مگر ایک جگہ مصنف نے کھلے ہوئے پھول کو بھی آغوش وداع کہا ہے ؎

آغوش گل کشادہ برائے وداع ہے　　اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق　　ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

ساقی بار بار صلا دیتا ہے۔ اور پکارتا ہے کہ کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف بنے

مگر کون حریف ہوتا ہے ۔ کسی مین یہ ہمت باقی نہین ہے ۔ کہ شراب عشق پیئے ۔ یہ دونون معانی لفظ مکرر سے پیدا ہوتے ہین ۔ کہ ایکبار ساقی بطور سوال یہ مصرعہ پڑھتا ہے اور دوبارہ بطریق یایوسی ۔ اسی مضمون کا ایک شعر مرزا فاخر مکین کا ہے کہتے ہین کہ ؎

زن سیرتان دور جہان را خبر کنند ساقی گرفت ساغر مرد آزمائے ما

یعنی ساقی ساغر شراب مرد آزما کا ساغر لیے ہوئے کہتا ہے زمانہ کے نامردونکو خبر کردو کہ کوئی ایسا ہے جو اس شراب کو پیئے ۔ زن سیرت ۔ کہکر یہ فائدہ اُٹھایا ہے کہ زن سیرت مرد آزما ساغر کو نہین پی سکتے ۔ ایک جگہ علامہ فیضی فرماتے ہین ؎

گردفنا شدند حریفان بزم عشق بر خاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما

یعنی جو اس شراب مرد آزما کے پینے والے تھے وہ گرد فنا ہوگئے یعنی خاک مین مل گئے اب کون ہے جو اس شراب کو پی سکے ۔ لہذا کسی سے اسکے پینے کا متوقع نہ رہنا چاہیئے اسے زمین پر ڈالدو ۔ خاک پر ڈالنے سے یہ نزاکت پیدا کی گئی ہے کہ اسکے پینے والے بھی خاک مین ملے ہوئے ہین ۔ ایسا ہی اگر پیئے گی تو انکی خاک ہی اسکو پی سکے گی ۔ فیضی کا شعر نہایت بلیغ اور نازک ہے ۔

اگرچہ نظیری بھی اسی راستہ سے ہوکر نکل گئے ہین مگر ذرا پیچھے پیچھے فرماتے ہین ؎

کار نظیری در رضا غم خوردن وخوش بودنست دارم مئے مرد آزما خوش باد شیخ و شاب ما

انھون نے رضا کو شراب مرد آزما بتایا ہے ۔

غم سے مرتا ہون کہ اتنا نہین دنیا مین کوئی کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

مین اس غم سے مرا جاتا ہون کہ میرے مرنے پر جو مہر و وفا کو ایک صدمہ عظیم پہونچے گا ۔ کوئی انکا تعزیت کرنیوالا بھی نہیں ہے ۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائیگا سیلاب بلا میرے بعد

یہ شعر بھی قریب قریب پہلے شعر کے مضمون سے ملتا ہوا ہے ۔ کہ میرے بعد سیلاب بلا یعنی عشق کس کے گھر جائے گا اسمین بے کسی کے لفظ کی تعریف نہین ہو سکتی ۔ ان دونون شعرونکے مضمون سے ملتا ہوا ایک شعر مومن مرحوم کا ہے جسمین درد کے ساتھ انکی شوخی بیان قابل تعریف ہے ؎

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے

(ردیف راے مہملہ ر)

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار — نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

اگرچہ میری نظر کے سامنے در و دیوار ہیں اور بظاہر اسکی بینائی کو روک سکتے ہیں مگر کچھ پرواہ نہیں ہے میری نگاہ شوق کے لیے یہی در و دیوار بال و پر کا کام دینگے اور ضرور میری نگاہ وہاں پہونچ جائیگی بال و پر بننے کی یہ وجہ ہے کہ رکاوٹوں سے شوق میں اور ترقی ہوگی جناب بیخود دہلوی کا ایک شعر ہے خوب فرمایا ہے ؎

دیکھ لیتی ہیں پس پردہ سے تجھے — ہیں کچھ ایسی بھی نگاہیں خاص خاص

وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ — کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

یعنی طوفان اشک نے میرے گھر کو زیر و زبر اور درہم و برہم کر کے یہ رنگ کر دیا ہے کہ جہاں دیوار تھی اسکو توڑ کر در بنا دیے اور جہاں در تھے وہاں مٹی جمکر دیواریں بن گئیں

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نوید مقدم یار — گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

جسکو دیواروں کا سایہ سمجھے ہوئے ہو یہ دراصل سایہ نہیں ہے بلکہ یار کے آنے کی خوشخبری سنکر چند قدم در و دیوار استقبال کو گئے ہیں۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ — کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

مئے جلوہ کو تو نے کس قدر ارزاں کر دیا ہے کہ در و دیوار تیرے کوچہ میں مست ہو رہے ہیں بظاہر مستی کا کوئی ثبوت نہیں معلوم ہوتا محض ادعا ہے۔

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ — کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

اگر تجھے میرے سودائے انتظار کی خریداری کی خواہش ہے تو آ۔ کیونکہ میری نظر [illegible]

ڈھونڈھنے کے لیے ہر در و دیوار پر پڑ رہی ہین تو کثرت نظر سے در و دیوار دوکان متاع نظر بن گئی ہین۔

وہ آ رہا مرے ہمسایہ مین تو سایہ سے   ہوے فدا در و دیوار پر در و دیوار

وہ میرے قریب جو آ کر رہا ہے تو میرے مکان کا سایہ اُسکے مکان کے سایہ کی بلائین لیتا ہے (ہمسایہ مین آ رہا) اگرچہ زبان عوام ہے مگر صحیح نہین ہو سکتا مُصنّف محض دوسرے مصرع کے سبب سے لکھ گئے ہین۔

نظر مین کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی   ہمیشہ روتے ہین ہم دیکھکر در و دیوار

ہمیشہ بغیر تیرے گھر کی آبادی میری نظر مین کھٹکتی ہے اور اپنے در و دیوار کو دیکھکر میرے آنسو نکل آیا کرتے ہین کسی چیز کے آنکھ مین کھٹکنے سے آنسو نکلنا مسلم ہے معمولی شعر ہے۔

ہجوم گریہ کا سامان کب کیا مین نے   کہ گر پڑے نہ مرے پاؤن پر در و دیوار

کونسا ایسا دن ہوا ہے کہ مین رو یا اور در و دیوار نہین گر پڑے۔ عجب نہین کہ مُصنّف یہ کہنا چاہتا ہو کہ جب مین نے رونے کا سامان کیا در و دیوار نے خوشامد کی کہ نہ رو ورنہ ہماری خیریت نہین۔

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب   کہ ناچتے ہین پڑے سر بسر در و دیوار

عیشِ مقدمِ سیلاب سے میرے گھر کے در و دیوار بیخود ہو کر گر پڑے ہین اور ناچ رہے ہین ظاہر ہے کہ سیلاب مین کوئی چیز کہین کوئی چیز کہین تیرتی ہوئی پھرا کرتی ہے مُصنّف نے ایک شعر اس مضمون کا اور بھی کہا ہے؎

مقدمِ سیلاب سے کیا دل نشاط آہنگ ہے   خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مگر اسمین اور شعر اول الذکر مین یہ فرق ہے کہ وہان مُصنّف اپنے دل کی خوشی کا مقدمِ سیلاب سے اظہار کرتا ہے اور یہان در و دیوار کا لیکن صاحب نے اس شعر کے معنے بھی پہلے شعر کیطرح بیان کیے ہین اور خیال مین کوئی فرق نہین دکھایا۔

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں — حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

غالب اگرچہ تیرے رموز اور رازِ محبت کا سننے والا سوائے در و دیوار کے کوئی نہیں مگر پھر بھی یہ بات کسی سے نہ کہہ لوگ تجھے دیوانہ خیال کرینگے کہ در و دیوار بھی کہیں رازِ محبت سنتے ہیں یا در و دیوار سے باتیں کرنا یہ کوئی عقلمندی ہے یا تجھے اظہارِ رازِ محبت کا الزام دینگے۔

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تیرے دروازے پر بغیر تیرے اجازت کے بے حیا ہو کر میں نے گھر بنا لیا تو کیا تو اب بھی میرے گھر کو بتائے بغیر نہ سمجھے گا اور یہ الزام دیتا رہے گا کہ ہمیں تیرا گھر ہی نہیں ملتا۔

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

یعنی یہ ظلم دیکھئے کہ مجھ میں ضعف سے جب طاقتِ سخن باقی نہیں رہی ہے تب وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ میں اسکی تمنا پوری کروں تو کیونکر کروں مجھے کسی کے دل کا حال کیا معلوم ہے ایک جگہ نئے انداز سے مصنف اس مضمون کو یوں بیان کرتا ہے ؎

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال — کہ یوں کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہئے

عجب نہیں کہ زمانہ حال کا کوئی شاعر موہوم "سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ" میں ذم کا پہلو نکالے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیات اعمالنا۔

چھوڑونگا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

میں اس بت کافر کا پوجنا نہ چھوڑونگا چاہے خلق مجھے ہمیشہ کافر کہے جائے۔ خسرو علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند — آرے آرے میکنم با خلق و عالم کار نیست

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جسکا جہان میں — لیوے نہ نام کوئی ستمگر کہے بغیر

تقدیر سے ایسے شخص سے کام پڑا ہے جسکو دنیا میں سب ظالم کہتے ہیں۔ نظم صاحب لکھتے ہیں

کہ لیوے دیوے کہوے دلی کی زبان میں بہت ہے یہ بقاعدۂ صرف بھی غلط ہے اور متروک بھی لیکن لیوے دیوے ہووے بھی گو قیاساً صحیح ہو مگر ترک ہوتا جاتا ہے خدا جانے کیا مطلب ہے کہ اسی کو صحیح کہتے ہیں اُسی کو غلط فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ الفاظ داغ اور امیر کے زمانے سے متروک ہوئے ہیں۔ غالب کے زمانے تک بے تکلف نظم کئے جاتے تھے دوسرے یہ غلط العام فصیح تیسرے یہ کہ محاورہ میں قیاس اور صرف و نحو کا دخل نہیں ہے —

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ہم جو دشمنوں کو جواب نہیں دیتے ہیں اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ ہم کسی سے دبتے ہیں یا کسی کا ہمکو ڈر ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں کسی کی شکایت ہی نہیں ہے اور ہم صاف باطن ہیں اگر ایسا ہو تو بلا سے قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں مگر کہے بغیر نہ رہیں گے

مولانا ناطق گلاوٹھوی فرماتے ہیں ؎

آتی نہیں تو ایک وہی خوئے دشمنی
ہم ورنہ دشمنوں سے کسی طرح کم نہیں

دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ ہمکو معشوق کی صرف اک محبت ہے ہمارے دل میں کوئی تمنا نہیں ہے اگر کوئی تمنا ہو تو مریں یا جئیں ضرور کہہ گذریں —

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مقصود گو حسن ناز و غمزہ ہے مگر گفتگوئے شاعرانہ میں دشنہ اور خنجر کہے بغیر کام نہیں چلتا ہے یعنی بغیر استعارہ و تشبیہات کے شاعری کا کوئی لطف نہیں۔ ایسی حالت میں بس شاعری پھیکی لگتی ہے ؎

دندان تو جملہ در دہانند
دو چشم تو زیر ابروانند

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یعنی مشاہدۂ حق کی ہی گفتگو کیوں نہ ہو مگر شاعری میں انھیں بادہ و ساغر ہی کہنا پڑے گا یہ شعر بھی مثل شعر سابق کے ہے —

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

اگر میں بہرا ہوں تو آپکو دونا التفات چاہیئے کیونکہ جب تک بات مکرر نہیں کہی جاتی میں سنتا نہیں ہوں۔

اس شعر کی نسبت ایک بزرگ مجھ سے فرماتے تھے کہ آخر میں جب مرزا غالب دربار شاہی مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے تو بادشاہ انھیں سے شوری کرتے تھے اسکا دستور تھا کہ غزل خود ولیعہد بہادر سے سنا کرتے تھے اور جو شعر اچھا ہوتا تھا صرف اسپر داد دیتے تھے ایک مرتبہ بادشاہ کوئی غزل سنا رہے تھے کہ آپ میں ایک اچھا شعر پڑھا مگر ادھر سے نہ داد دی گئی نہ کوئی ہوں ہاں ہوئی کیونکہ مرزا شراب پیئے ہوئے تھے۔ بادشاہ خود سخن سنج اور سخن فہم تھے یہ بے محل سکوت ناگوار گذرا تیور پر بل پڑا۔ ادھر مرزا بھی ادا شناس تھے تاڑ گئے دربار میں یہ حکماً جو باتیں کرتے تھے وہ نظم میں ہوتی تھیں۔ لہذا فوراً نظم کرکے فرمایا ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

اہ عالم پناہ مسکرائے دوبارہ شعر پڑھا۔ اور حسب دلخواہ داد لی۔ خدا جانے کہانتک سچ کہانتک غلط ہے۔ ہاں البتہ مقطع یہ ضرور بتاتا ہے کہ یہ غزل دربار میں پڑھی

سن تو بار بار عرض — ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

ائی سے عرض کیا ہے۔ یہ بھی ایک معنوی خوبی ہے۔ ایسے پہلو ہیں ؎

شاہ کو دعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

تاب رخ یار دیکھکر — جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھکر

تا ہوتا کہ رخ یار کی تاب دیکھکر میں جل جاتا کہ مجھکو یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑتا میں اپنی طاقت دیدار سے جل رہا ہوں کہ اس نے اسکے جمال جہان سوز کا نظارہ کیا اور جل نہ گیا۔ یا یہ کہ انتہائے رشک کی حالت بیان کی گئی ہے۔ کہتے ہیں اور یہ بھی حرف

کیوں دیکھا میں جل کیوں نہ گیا۔ آخر اسی مضمون کو مرزا نے دو تین جگہ اعادہ کیا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

یا ؎ ۔ تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے سرگرم نالہائے شرر بار دیکھ کر

یعنی کہ میں رات دن آتشیں نالے کرتا ہوں اس لحاظ سے لوگ مجھے آتش پرست کہنے لگے حالانکہ میں آتش پرست نہیں ہوں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آپ بے سبب آزار ہیں اسواسطے میں اب اپنے آپکو آپکے عشق سے روکتا ہوں ۔ کیونکہ میں تو عاشق ہوں مجھ پر تو یوں جفائیں کرتے ہو۔ مگر رقیب جو عاشق نہیں ہے تم اُسپر بھی میری طرح ظلم کرتے ہو جو بالکل بے سبب ہے لہذا میں اجتناب کرتا ہوں کہ عاشق اور بوالہوس میں کسی طرح سے کوئی فرق باقی نہیں رہتا ۔ اور میرے عشق کی آبرو پر دھبہ آتا ہے ایک جگہ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ مرحوم بالکل یہی مضمون نہایت درد انگیز لہجہ میں فرماتے ہیں ؎

کس توقع پہ جئیں شیفتہ مایوس کرم غیر پہ بھی ستم یار کی افواہیں ہیں

نواب مرزا داغ فرماتے ہیں ؎

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہمکو حریص لذت آزار دیکھ کر

ہائے افسوس یار نے ظلم سے بھی ہاتھ اٹھا لیا ۔ کہ مجھکو حریص لذت آزار دیکھا اور اب جیسا کہ مشاہدہ ہے خوشی سے محروم ہوں ۔ ایک شعر پہلے اسی قسم کا لکھا جا چکا ہے ؎

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھکر

موج نے تیری رفتار مستانہ دیکھکر لرز رہی ہے کہ اس سے ایک عالم کے دل پامال ہونگے - اور یہ سب خون گردن مینا پر ثابت ہونگے - کیونکہ شراب پیکر تیری رفتار ایسی ہوئی ہے - اس شعر کا مطلب لکھنے کے ساتھ ہی ایک شعر مجھے یاد آیا - جسے شاید حافظ نے بچپن کے زمانہ سے جب یہ سنا ہوگا شاید آج ہی کے لیے امانت کیطرح رکھ چھوڑا تھا - شعر یہ ہے ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانہ کا ہوگا

یعنے شہد کی مکھی کو باغ میں نہ جانے دینا - وہان وہ چھتہ لگائیگی اس سے موم نکلے گا اور موم سے شمع بنے گی اور وہ جلے گی جسپر پروانہ اپنی جان نثار کرے گا -

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے مرتا ہون اُسکے ہاتھ مین تلوار دیکھ کر

میرے قتل کو نہایت جوش وخروش سے آتا ہے اور تلوار ہاتھ مین لیے ہے مگر مین رشک سے مرا جاتا ہون کہ تلوار کی اُسکے ہاتھ تک کیون رسائی ہوئی -

بک جاتے ہین ہم آپ متاع سخن کے ساتھ لیکن عیار طبع خریدار دیکھکر

ہم اپنے متاع سخن کے خریدار کے ساتھ خود بک جاتے ہین لیکن اُس حالت مین جب اُسکی طبیعت کا اندازہ کر لیتے ہین مطلب یہ کہ جو میری شاعری کی قدردانی کرتا ہے مین بھی اُسکی قدر کرتا ہون مگر اُسکی طبیعت کا اندازہ کرنے کے بعد - اور بک جانیکی وجہ یہ ہے کہ میرے کلام کا جو شخص خریدار ہے وہ یقیناً ذوق صحیح رکھتا ہے -

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

تسبیح اور زنار دونون ایک ہی منزل پر پہونچنے کے راستہ ہین مگر فرق یہ ہے کہ زنار کی راہ ہموار ہے اور تسبیح کی راہ مین نشیب و فراز ہونے کی وجہ سے ٹھوکرین کھانی پڑتی ہین لہذا زنار پہن لے اور تسبیح کو توڑ ڈال ہموار راستہ پر مسافر چلا کرتے ہین - شعرا عام طور پر زنار کو تسبیح پر ترجیح دیتے ہین کعبہ پر بتخانہ وغیرہ کو فوقیت دیجاتی ہے اور یہ صرف

اسوجہ سے ہے کہ انھون نے اپنی اصطلاح مین انھین چیزونکے جنکے مشہور نامونکی برائیان کرتے ہین یہ نام رکھ لیے ہین - ورنہ دراصل نہ کوئی کعبہ اور تسبیح و مصلے کے خلاف ہے نہ بتخانہ وغیرہ کا معتقد ہے انکے برعکس نام رکھنے کی وجہ معلوم نہین کیا ہے -

ان آبلون سے پانو کے گھبرا گیا تھا مین جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

ان (اسم اشارہ) عمداً لایا گیا ہے جسنے یہ فائدہ دیا ہے کہ گویا آبلونکی شکایت کرنے والا بجائے خود اپنے پانون کے آبلے دکھا رہا ہے اور کہتا ہے کہ ان سے گھبرا گیا تھا - مگر ذرا پرخار جنگل دیکھکر میرا جی خوش ہوا ہے - کہ یہ سب پھوٹ جائینگے

کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ مین مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

وہ مجھ سے کتنا بدگمان ہے کہ میرے آئینہ مین جو زنگ لگا ہوا ہے (یعنی میرا دل جو غمون سے مکدر ہے) اسکو زنگ نہین سمجھتا بلکہ طوطی کا عکس سمجھتا ہے (یعنی سمجھتا ہو کہ اسے کسی دوسری چیز کی بھی میرے سوا سے محبت ہے) ایک جگہ فرمایا ہے ؎

بدگمان ہوتا ہے وہ کافر نہوتا کاش کے اسقدر ذوق نوائے مرغ بستانی سے مجھے

مگر پہلے شعر مین اور اسمین فرق یہ ہے کہ وہان مصنف محض بدگمانی معشوق کا اظہار کرتا ہے اور خود کو طوطی پالنے سے بری الذمہ ثابت کرتا ہے - دوسرے مین اپنے شوق کو ظاہر کرتا ہے اسمین دوسرا پہلو معانی کا یہ بھی نکلتا ہے کہ زنگار آئینہ سے طوطی کے چھپا دینے کی بدگمانی کرتا ہے - اس لیے کہ طوطی کو آئینہ کے پیچھے رکھتے ہین اور پڑھاتے ہین تو یہان بھی معشوق بدگمان سمجھتا ہے کہ اسنے میری گفتگو کا جو یہ اتارنے اور سکھانے کے لیے طوطی کو آئینہ کے پیچھے چھپا رکھا ہے اور ظاہر ہے بدگمانی کی وجہ ظاہر ہے کہ طوطی وہی باتین جو آئینہ کے پیچھے بیٹھنے والا آدمی کہتا ہے کرنے لگتا ہو جیسے سکھانے والا اس شعر مین احکام مرقومہ ازل کے اظہار کی تشبیہ دیکر کہتا ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت ہمان میگویم

گرنی تھی ہمپہ برق تجلی نہ طور پر دیتے ہین بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

کہتا ہے کہ طور گویا ایک سبو اور تنک ظرف تھا جو نشۂ شرابِ برق تجلی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ایسا چاہیئے تھا کہ برق طور ہم پر گرتی۔ ہمارا ظرف ایسا تھا کہ ہم اسکو ضبط کر سکتے۔ غالب کا یہ شعر مقبول ہے اور فی الواقع تعریف سے مستغنی ہے۔ اس قوت اور شوق کا مطالبہ لگانا غالب ہی کا کام تھا۔ عرفی نے ایک جگہ اس مضمون کو اس سے بھی ایک درجہ بڑھا کر کہا ہے فرماتے ہیں ؎

ہر کوتہی ز عطا بود و عشق میداند ۔۔۔ کہ ہر کرشمۂ ما تنگ بود خلعت طور

یعنی عطا نے ہمارے ساتھ کوتاہی نہیں کی تھی جس نے اپنے نزدیک ہمکو خلعت موزوں دیا تھا مگر ہمارا عشق جانتا ہے اور اسبات کا گواہ ہے۔ کہ دربار عطا سے جو ہمکو خلعت طور عنایت ہوا وہ ہمارے کرشمہ اور ہمارے حال پر تنگ تھا۔ یعنی ہم پر برق طور سے بھی کچھ زیادہ کرنا چاہیئے تھا۔

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا ۔۔۔ یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

تیری دیوار دیکھکر غالب مجنوں کا سر پھوڑنا مجھے یاد آگیا۔ بہ لحاظ بندش کے یہ شعر بے مثل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے ؎

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے ۔۔۔ بیٹھنا اُسکا وہ آکر تری دیوار کے پاس

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر ۔۔۔ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خارِ بیاباں پر

میں وہ ایک قطرۂ شبنم ہوں جو نوک خار پر ہو۔ اور میرے جذب کرنے کو آفتاب نے زحمت کی ہے میرا دل اُسکی تکلیف پر کڑھتا ہے کہ ایسے ناچیز قطرہ کے لیے جسکا فنا ہو جانا آپ ہی یقینی تھا اُس نے ناحق تکلیف کی۔ دل کا لرزنا اسلیے کہا گیا کہ آفتاب بھی کھینچ کر لیجانا چاہتا ہے اُسکا ڈر ہے

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی ۔۔۔ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

یاں بھی سے پتہ چلتا ہے کہ قید میں اُنکو خانہ آرائی چھوڑ دینی چاہیئے تھی مگر حسن آرائی عادت سے کسی جگہ باز نہیں رہتا۔ قید خانے پر پھیرنے کے لیے دیدہ یعقوب کا نور سپید کیا ہے۔ پھرتی ہے ایک ذو معنے لفظ ہے جس سے گردش کرنے اور ذہن میں آجانے کے معنے بھی نمودار ہوتے ہیں

تلمیح ظاہر ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں روتے روتے بے نور ہوگئیں تھیں ۔

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اُس زمانہ سے — کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر

میں بیخودی عشق سے اُس زمانہ سے تعلیم فنا حاصل کرتا ہوں کہ مجنوں اُسوقت تک طفل مکتب تھا اور دیواروں پر لکیریں کھینچتا تھا ۔ لام الف لکھنے سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں یعنی وہ لا لکھتا تھا جسکا مفہوم یہ ہے کہ اُسوقت تک وہ نیستی کی مشق کرتا تھا یا یہ کہ وہ لیلا پورا نہ لکھ سکتا تھا یعنی ہنوز اُسکو لیلی کا عشق کامل نہ ہوا تھا ۔

فنا تعلیم درس بیخودی ۔ مصنف کی تراشی ہوئی ترکیب ہے ۔ اور یہ ایسی ہی ہے جیسے یک الف بیش وغیرہ یہ مرزا بیدل مرحوم کا اتباع ہے ۔ جنکی نسبت آزاد مرحوم نے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے میرزا در زبان فارسی چیزہا ے غریب اختراع نمودہ کہ اہل محاورہ قبول ندارند ۔ بلے قرآن کہ کلام خالق السنہ است سر رشتۂ موافقت زبان در دست دارد ۔ اگر اختراعی خلاف زبان پیداشت فصحا ے عرب قبول نمیکردند ۔ غیر فارسی کہ تقلید زبان فارسی کند بے تمود قدرت اصل چگونہ مقبول اہل محاورہ تواند شد ۔

اما خان آرزو در مجمع النفائس گوید کہ چون مرزا از راہ قدرت تصرفات نمایان در فارسی نمودہ مردم ولایت و کاسہ لیسان ایشان کہ از اہل ہند اند در کلام آن بزرگوار سخنہا دارند و فقیر در صحت تصرف صاحب قدرتان ہند ۔ ہیچ سخن ندارد ۔ بلکہ قائل است چنانچہ در رسالہ داد سخن بہ براہین ثابت نمودہ ہر چند خود تصرف نمی کند ۔

یہاں تک تو میں نے جو کچھ لکھا مرزا کی فارسی تراکیب کے لیے لکھا ۔ کہ انکی صحت میں کلام نہیں ہے ۔ کیونکہ یہ اظہر من الشمس ہے کہ غالب مرحوم فارسی زبان میں صاحب قدرت تھے اسکے ساتھ ہی میں یہ بھی ضرور کہونگا ۔ کہ آج جو اہل دہلی و لکھنؤ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے محاورات کے سوا ے دوسرے شہروں کے محاورات اور ہماری زبان کے سوا ے دوسری جگہ کی زبانیں نامقبول ہیں یہ کہاں تک صحیح ہے ۔ تعجب ہے کہ ایران کی زبان کے محاورات میں تصرف ایک ہندی قادر الکلام فارسی گو ہندی شاعر کے یہاں غیر مقبول نہو اور ہندوستان کے الفاظ ہندوستان ہی میں مردود ہو جائیں ۔ آج اگر غور کیا جائے تو لکھنؤ دہلی میرٹھ مراد آباد علیگڈھ بلند شہر آگرہ وغیرہ کی زبانوں میں بہت کم فرق باقی رہ گیا ہے اور اردو کی

ترقی نے ان سب شہروں کی زبانوں کو مماثل بنا دیا ہے۔ اور سوائے چند بیگمات کے محاوروں کے
(جو بیشتر غالباً شعرا کو کبھی کام نہیں پڑتا) کچھ دہلی اور لکھنؤ کے خزانہ میں باقی نہیں ہے تاہم
مگر پدرم سلطان بود پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور اب تک دنیا کی زبان کو غلط سمجھا جاتا ہے یہ اگر
ناانصافی نہیں ہے تو اسکو انصاف سے تعبیر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہو۔ حالانکہ اب تک
جتنے مستند شعرا اور ریختہ گو گزرے ہیں اون میں سے اکثر باہر کے رہنے والے تھے۔ مثلاً
غالب آگرہ۔ اور مصحفی امروہہ۔ میر تقی میر آگرہ۔ میرزا جان جان۔ مظہر دکھنی۔
مرزا رفیع السودا کے باپ کابلی۔ جرأت کے بزرگ اکبرآبادی۔ انشاء اللہ خان کشمیری الاصل
شیخ ناسخ کے والد کا وطن لاہور۔ آتش مصحفی امروہوی کے شاگرد۔ مولوی
عبدالغفور راسخ جھنجھانہ ضلع مظفرنگر کے۔ اسیر مرحوم امیٹھی کے بیان مرحوم میرٹھ۔ خواجہ
بقاء اللہ خان بقا اکبرآباد کے رہنے والے تھے۔ دیہات یا دوسرے شہروں سے
لکھنؤ اور دلی میں آئے سب نے انکی زبانوں کو مستند ہی نہیں سمجھا بلکہ انکا اتباع کیا۔ آتش جنکی
آتش بیانی کا آجتک شہرہ ہے۔ لکھنوی ہونے کی حیثیت سے ہم من دیگرے نیست پر عمل
کرتے تو کبھی ایک دیہاتی کے حلقہ تلامذہ میں داخل نہوتے۔ اسکے سوائے دہلی اور لکھنؤ دونوں
میں بہت سے الفاظ غلط بولے جاتے ہیں۔ اگر کوئی باہر کا رہنے والا انکے مقابلہ میں صحیح الفاظ
بولتا ہے تو اسکا مذاق کیا جاتا ہے اور وہ غلطی اور الٹی اسی کے سر رکھدی جاتی ہے۔ کیوں اسلیے
کہ دہلی اردو کی زاد بوم ہے اور لکھنؤ میں دہلی سے اجڑنے کے بعد اہل کمال کے جمگھٹے رہے
ادھر لکھنؤ اور دلی کی سرحد سے کوئی باہر نکلا ادھر اسپر زبان کی لاعلمی کا الزام لگا دیا گیا اس کے
ساتھ ہی ایک لطف اور دیکھئے کہ وہی دیہاتی جسپر آوازے کسے جاتے ہیں۔ جو کچھ لکھ گئے
ہیں انہیں سے سند پیش کیجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم مولانا حالی اور شبلی رح کی تصانیف کو پیش
کرتے ہیں حالی پانی پت کے رہنے والے تھے شبلی اعظم گڈھ کے باشندے تھے آزاد نے اپنی
عمر کا زیادہ حصہ لاہور میں گذارا مولانا نذیر احمد نے بجنور کے ضلع میں ہوش سنبھالا۔ پھر ان کی
زبان کو مستند کیوں مان لیا گیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ایران میں شیراز گویا دلی ہے اور وہاں کی زبان مستند ہے۔ مگر آجتک کسی نے یہ نہیں بتایا
کہ نظامی جو گنجہ کے خاقانی شروان کے ظہوری ترشیز کے فردوسی طوس کے مولانا جامی جام
کے نظیری نیشاپور کے رہنے والے تھے انکو استادی کا خطاب کس بنا پر دیا گیا اور ان کی زبان

مستند کیون مانی گئی دلان حالیکہ انکے مساکن اور انکی زاد بوم دیہات اور قصبون سے زیادہ وسیع نہ تھے۔

سعدی شیراز کے رہنے والے تھے۔ مگر جب سلطان محمد والی حاکم ملتان نے انکو ہندمین بلایا تو باوجود اہل زبان اور مستند ہونے کے اُنھون نے کیون لکھدیا کہ امیر خسرو کو میری جگہ دیکھ لو ظاہر کوئی بات انصاف کے سوا ایسی نہین تھی کہ سعدی کو اس جواب کے دینے پر مجبور کرتی خیال یہ تھا کہ زبان کسی خاص شہر اور جگہ کا حصہ نہین ہے بلکہ جسکو خدا دے ان لوگون کی زبان صاف دیکھی انصاف پسند دل نے مستند سارٹیفکٹ دینے پر مجبور کردیا عرب کو لیجیے وہان خانہ بدوش قومون کی زبان مستند مانی جاتی ہے شہریون کی زبان اس لیے مستند نہین سمجھی جاتی کہ باہر کے لوگ وہان تجارت کے لیے آتے جاتے ہین۔ اسی کلیہ کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہین کہ شاہی زمانے مین بہت سے اُمرا کو جاگیرین ملی ہین اور انھون نے پرگنہ اور قصبہ آباد کیے ہین اور شریف خاندان وہان رہتے ہین۔ انکے گھرانے آجتک موجود ہین انکی طرز معاشرت انکی زبان وہی نسلاً بعد نسلاً چلی آتی ہے۔ اُنکی تعلیم و تربیت شہریون سے اچھی۔ مگر جب شہر والے زبان کا ذکر سنتے ہین کہدیتے ہین کہ یہ تو ہمارا حصہ ہے۔ یہ آخر کیون کہا جاسکتا ہے کہ یہان یعنی اردو مین قضیہ منعکس ہے مگر اس سے دوسرونکی زبان غیر مستند نہین ہوتی۔

شاعری کے لحاظ سے دہلی مٹ چکی۔ لکھنؤ مین چند چراغ ہین جو ٹمٹماتے نظر آتے ہین چند آفتاب ہین جو لب بام ہین۔ الفاظ کی تراش خراش بند ہوگئی۔ ترقی تعلیم نے سب جگہ اپنا اثر دکھلا رکھا ہے پرانے محاورات جو لکھنؤ اور دلی کو متقدمین سے ملے تھے ہندوستان بھر کے شہرون مین پھیل چکے مشاعرے ہونے بند ہوگئے یا کم از کم ہوگئے۔ چھوٹے چھوٹے شہرون اور قصبون مین زبان اردو کی ترقی کے لیے مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ ہندوستان کے مشہور شاعرون سے اُنکے تبادلہ خیالات ہوتے ہین۔ ترقی زبان کے لیے انجمنین قائم ہین۔ مگر جب اُنھین قصباتی یا دیہاتی لوگون مین سے کوئی لکھنؤ یا دلی کے مشاعرون مین غزل پڑھنے جاتا ہے تو غزل کے مضامین کیسے ہی اعلیٰ اور جذبات کتنے ہی موثر اور دلکش ہون۔ مگر حسد سے اپنی وضع پر قائم رہنے کے لیے اسپر ہنسکر ڈالنا فرض سمجھ رکھا ہے یاد رہے کہ یہ انصاف کا خون کرنا ہے۔ ان ہر زہ سنجیون سے کام نہین چلتا زمانہ سمجھ چکا ہے کہ ان لوگونکے پاس جو زبان ہے زبان کا وظیفہ رٹ رہے ہین۔

سوائے اس زبان کے جس سے دنیا کو برا کہا جاتا ہے کچھ باقی نہیں ہے۔
اب شاعری کا موازنہ کیجئے تو ہنسی آتی ہے ادھر یہ لوگ فخر کے ساتھ کہتے ہین کہ شاعری ہمارا حصہ ہے زبان ہماری لونڈی ہے۔ ہمارے یہاں کے جاہل گنوار دیہاتی اور دوسرے شہر کے تعلیم یافتون سے کچھ اچھا کہہ لیتے ہین۔ ادھر وہ لوگ جب اُن کے خیالات کو سنتے ہین تو غریبونکو منھ مین رومال دیکر ہنسنے کے سوائے کچھ بن نہین پڑتا۔
دہلی کی حالت یہ ہے کہ وہان تو سادگی زبان کے سوائے نہ جذبات سے کام نہ مضمون آفرینی سے غرض۔ لکھنؤ کی کیفیت کہ رونے کے سوائے دوسرا کام ہی باقی نہین رہا۔ نہ زبان سے غرض نہ اصلی اور دلی جذبات سے مطلب وہی ہیر پھیر کر کرنے کے مضمون لکھے جاتے ہین۔ یا قید۔ آشیانے کا جلنا اجڑنا نزع کی سختیاں ہمیش نظر رہتی ہین۔
زبان کے اصول مین سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ کسی چیز کو کسی چیز سے مشابہ دیکھ کر نام رکھے گئے ہین۔ اور یہ قاعدہ عربی فارسی۔ اردو مین عام ہے۔ تو اسمین اگر ایک شہر کے باشندے کسی شئے کو کسی شئے سے مشابہ پاکر کوئی اُس کا نام رکھے سوائے دو جو اہل لکھنؤ یا دہلی نے رکھا ہے (دوسرا نام رکھے ہوئے ہین تو اسے اگر آپ اپنے یہان کا نام موجود ہونے کی وجہ سے زبان پر لانا گناہ سمجھین تو دوسرے کو وہ نام جو اُس نے کسی خاص مناسبت سے رکھا ہے اور اسمین کوئی قباحت نہین ہے زبان پر لاتے ہوئے دیکھکر اُنکو غلط کہنے کا کیا حق ہے مثال کے طریقہ پر لیجئے۔ بڑی جوار (مکئی) کی بالی کو لکھنؤ اور دلی مین بھٹا کہتے ہین اور یہ اسوجہ سے کہ بھٹا۔ گردن کو کہتے ہین چونکہ گردن اوپر ہوتی ہے اور بالی بھی درخت کے اوپر نکلتی ہے اسواسطے تشبیہ ادنے مناسبت کا قانون جاری کر کے اسکو اس نام سے مشابہ کیا گیا۔ مگر میرٹھ کے ضلع کے بعض قصبات مین اسکو گگڑی کہتے ہین اور گگڑی شہد کے چھتہ کو بھی کہتے ہین۔ چونکہ اسمین اسکی پوری مشابہت ہے اسواسطے انھون نے اس کا وہ نام رکھ لیا۔ اب اگر لکھنؤ مین بھٹے کو کوئی گگڑی کہے تو قائل کو غلط گو کا خطاب کیون دیا جائے۔ انھون نے بھٹا چھوٹی جوار کی بالی کا نام رکھا ہے اسلئے کہ اسمین پوری مشابہت گردن کی ہے۔
پانی کے ظرف کو گگرا کہتے ہین۔ اگر بعض لوگ اسکو تھال کہتے ہیں یہ اختلاف ہے لیکن اس صورت مین اگر ایسے لفظ کے معنی الٹ دئے ہین۔ بیجا ہے کہ غلط کیون کہا جائے۔

شہر کا محاورہ گلو اور نیم چڑھی ہے۔ مگر اکثر قصبات میں کریلا نیم چڑھا کہتے ہیں حالانکہ گلو اور کریلا دونوں کڑوے ہیں —

مرغے کی ایک ٹانگ شہر کا محاورہ ہے۔ مگر بعض جگہ اسی محل پر مرغے کی تین ٹانگ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ جو محاورہ کے وضع ہونے کا مقصد ہے وہ دونوں میں موجود ہے بعض الفاظ قصبات و دیہات میں ایسے مستعمل ہیں جو فارسی ہیں اور جانبین میں سے یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ یہ لفظ غیر زبان کا ہے۔ مگر جب کوئی قصبائی وہ لفظ استعمال کرتا ہے تو غلط سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً لیجئے۔ کنڈا۔ اسکو اکثر جگہ اُپلہ کہا جاتا ہے مگر بولنے والے اسکو ہندی سمجھکر بولتے ہیں اور غلط کہنے والے بے سوچے سمجھے غلط کہدیتے ہیں میرا مطلب اس سب فضول تحریر سے نہ دہلی پر اعتراض کرنا ہے نہ لکھنؤ پر بلکہ کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر کسی لفظ کو آپ اپنے نزدیک فصیح نہ سمجھیں تو خیر آپ کی خوشی مگر غلط کہدینیکا مجاز آپکو نہیں ہے — آج زبان اُردو کی اسقدر ترقی کے بعد یہ حق باقی نہیں رہا ہے کہ ہندوستان بھر کی زبان لکھنؤ اور دہلی کے محاورات اور زبان کی غلامی کرے —

فراغت کسقدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے　　بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکدان پر

مرہم کی تشویش سے میں آزاد اور فارغ البال رہتا اور اسکی جستجو میں دربدر ٹھوکریں کھاتا نہ پھرتا اگر میرے دل کے ٹکڑے نمک چھڑکنے کی ایذا پر راضی اور خوش رہتے گویا ایک عاشق کے لیے جستجوئے مرہم نمک کے ہوتے باعث ننگ ہے یہ بھی پہلو نکلتا ہے کہ میرا قاتل جو میرے پارہ ہائے دل پر نمک چھڑکتا ہے تو اُس سے دل کے ٹکڑوں کو وہ لذت حاصل ہوتی ہے کہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اسوجہ سے اب میں اس فتنے کے دبانے اور اس فساد کے مٹانے پر مجبور ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس پر مرہم لگا دوں تاکہ سب اس لذت سے محروم ہو جائیں کاش ان ٹکڑوں میں باہمی نفاق ہوتا جتنا جتنا نمک جسکے حصہ میں آیا تھا اسی پر راضی رہتے تو مجھے مرہم کے ڈھونڈھنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑتی —

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا　　کہ پشت چشم سے جسکی نہ ہووے مہر عنوان پر

طومار — و قلم۔ پشت چشم — اغماض۔ چشم پوشی۔ عنوان — سرنامہ یعنی محبت کی ولایت

اور قلمرو میں کوئی دوسرا اور کوئی فرمان ایسا نہیں ہے جس پر معشوق کی اغماض اور بے پروائی کی مہر ہو یعنی معشوق تو دل لیتے ہی ناز کے ساتھ ہی اغماض اور آنکھیں پھیر لینا بھی پایا جاتا ہے گویا ادھر عاشق کا ناز و ادا سے دل لیا اور ادھر آنکھیں پھیر لیں لفظ عنوان اس لئے صرف کیا گیا ہے کہ عنوان ابتدا ہی میں ہوتا ہے اور اس سے معشوق کی فوری بیوفائی کا اظہار مقصود ہے جیسی بندش سست ہے ویسا ہی مضمون و تشبیہ نئی اور چست ہے ۔

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا | کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

یعنی میں باغ میں گیا اور گھٹا لال رنگ شفق سے میں سمجھا کہ یہ زینت گلشن ہے مگر اب سمجھا کہ وہ شفق نہ تھی بلکہ تیری جدائی کے باعث باغ پر آگ برس رہی تھی ۔

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا | قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

سوائے پروازِ شوق یار کے شہیدان وفا کی خاک میں کچھ باقی نہیں رہا ہے قیامت جس کا کام مردوں کا زندہ کرنا ہے ۔ اور شہیدان وفا کو تو کیا اور کیونکر زندہ کرے گی کیونکہ وہاں شوق ناز معشوق کے سوائے کچھ باقی ہی نہیں ہے البتہ اسی پروازِ شوق کو برانگیختہ کر دیگی یا خاک کے معنے ۔ قبر کے لیجئے ۔ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے ۔ کہ شہیدان وفا میں شوق ناز یعنے عشق معشوق نے یہانتک اثر کیا تھا اور وہ اسقدر اس سے متاثر ہوئے تھے کہ سراپا عشق ہو چلے تھے تو اب قیامت جو انکے جلانے کے لیے آئی ہے یہ سوائے اسکے کہ اس شوق کو اور برانگیختہ کر دے اور ہوائے تند بنکر اس خاک کو جو امتداد زمانہ کی وجہ سے سراپا شوق بنی ہوئی ہے تیزی کے ساتھ اڑا لے اور کیا کرے گی ۔ باقی رہا ہوگا ایک احتمالی کلمہ ہے جس سے شعر میں پیدا ہوتے ہیں کہ وہ پہلے ہی ایسے تھے تو اب اس امتداد زمانہ سے تو انکی ضرور یہ کیفیت ہو گئی ہوگی ۔ لفظ پرواز نے شعر کو معنی دار بنا دیا ہے ۔

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی | ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

غالب ناصح کی شدت پر تو اس سے کیوں لڑتا ہے اس سے لڑ نہیں سکتا ناداں ۔ ہمارا بھی تو گریباں پر زور چلتا ہے اسکو پھاڑ ڈالو ۔ جو [illegible] ۔ تبھی اس سے سمجھتا ہے کہ ناصح کی [illegible] ۔ [illegible]

تے ہیں حالانکہ نگو

ہمارا جی چاہتا ہے کہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالیں —

ہے بسکہ ہر اک اُنکے اشارے میں نشان اور   کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گمان اور

چونکہ اُنکے ہر اک اشارے میں نئی نئی باتیں نکلتی ہیں تو وہ اگر محبت کرتے ہیں تو وہ بھی اُسکو بعض وقت دھوکا سمجھتے ہیں کہ سب ازراہِ فریب ہے اور وہیں بناوٹ میں سے یہ کوئی نیا نظام ظاہر کرتا ہے۔ اس قدر دھوکے کھا کر گذر گئے ہیں کہ وفا بھی جفا کا استعمال کرتا ہے تو دہلوی مذاق کا ہے جسمیں نہایت اچھی طرح سے زبانکے پیرایہ میں ادا کیا ہے مگر بولنے والے سے وہیں پیچھے رہو بس وہی سے بات کہتے ہیں

جفا کیجئے فلاں غلط کہدیتے ہیں میرا مطلب وہ یہ بلکہ کہنا صرف یہ چاہتا

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھینگے مری بات   دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھکو زبان اور

کی خوشی مگر غلط کہدینگا

میری زبان سے رُعبِ معشوق ۔ یا ضعف کی وجہ سے میرے دل کا مطلب ادا نہیں ہو سکتا اور وہ ایسا بے پروا ہے کہ میرے حال کو سمجھ نہیں سکتا ۔ تو اے خدا یا اُس سنگدل کو اور دل دیدے یا مجھے زبان اور دیدے کہ یا وہ میری حالت کا اندازہ کرے ۔ یا میں اپنا حال ظاہر کر سکوں ۔ ایک اور شعر ہے جسمیں محض ضعف کا اظہار مقصود ہے ۔

ادھر وہ بدگمانی ہے اُدھر یہ ناتوانی ہے   نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند   ہے تیر مقرر مگر اُسکی ہے کمان اور

نگہِ ناز ایک تیر ضرور ہے ۔ مگر یہ ابرو کی کمان سے نہیں نکلا ہے بلکہ اسکی کمان کوئی اور ہے یعنی یہ حُسن کی کمان کا تیر ہے ۔ ایک شعر اسی مضمون کا یہ ہے ۔

اُس نے جب دیکھا مجھے تو اُٹھا دی عشق نے   حُسن کی ترکش کا دیکھا اب دل یہ پہلا تیر ہے

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھینگے   لے آئینگے بازار سے جاکر دل و جان اور

تمھارے ستم زمانہ میں جان و دل سے ہر شخص تنگ ہے اور فروخت کرنا چاہتا ہے تو تم اگر ہو تو دل و جان سے بھی ارزاں لے آئینگے تو ہمکو کچھ پروا نہیں ہے ۔ جب بازار میں جائینگے اور جان و دل لے آئینگے ۔

اور قلمرو میں کوئی دست شکستی میں   ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گران اور

کی مہر ہو یعنی معشوق تو نہ ملا ہو گئے اور جو ان کو ہم نے توڑ دیا - مگر اگر ہمارے اندر
ادھر عاشق کا ناز و ادا [illegible] ہے - اور منزل عرفان کی راہ میں یہ بھی ایک سنگ
گرانِ ابتدا ہی میں ہے کہ تو پندار شکستی باقی است -

بندش سست ہے ویسا   کے روتا

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود   ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشان اور

ہے - کاش کئی آنکھیں ہوتیں تو دل کھول کر رو سکتا
یعنی میں باغ میں گیا اور کھلی ہوئی آنکھیں خون بہاتے لیے صرف دو ہیں کاش سبھی
شفق نہ تھی بلکہ تیری جدائی میں الفاظ کے ساتھ بیان کر چکے ہیں ہ

[illegible] مر واز بتہ [illegible] ہے   میری نظر میں ہے سب جمع و خرچ دریا کا

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے   جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

چاہے میرا سر اڑ جائے اسکی پرواہ نہیں ہے - میں تو اس آواز پہ مرتا ہوں کہ جس سے
وہ جلاد کو وار کرنے کی تاکید کر رہے ہیں -

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا   ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

میرے سینے سے جو ہر روز اک جدائی کا نیا داغ ظاہر ہوتا ہے لوگ اسکو خورشید جہاں تاب سمجھ کر
دھوکا کھا جاتے ہیں - ناسخ کا مطلع اسی مضمون کا ہے جو میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ
مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجران کا   طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریبان کا

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین   کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغان اور

اگر تمہیں دل نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا - اگر نہ مرتا تو کوئی دن آہ و فغان اور کرتا اس شعر کے
دونوں مصرعوں میں شرط و جزا ہے - اور بہت خوب شعر ہے - اس شعر میں ایجاز ہے
ایجاز مختصر کرنے کو کہتے ہیں - یعنی کوئی بات ایسے مختصر طریقہ سے ادا کریں جس سے تمام
واقعات سمجھ میں آجائیں - آخری شعر کو دیکھئے گویا معشوق کے اس سوال کے جواب میں کہا گیا ہے

کہ تو کوئی دم چین کیون نہین لیتا اور تو آہ و فغان کیون نہین کرتا - ایک جگہ اس مضمون کو برعکس یون کہا ہے -

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیون جیتے ہو غالب   قسمت مین ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے روان اور   پاتے نہین جب راہ تو چڑھ جاتے ہین نالے

نالے رک جاتے ہین اور اسکے بعد جب انکو راستہ ملتا ہے تو بہت زور سے چلتے ہین اسیطرح میری طبیعت جب رکتی ہے تو اور زیادہ روان ہوتی ہے - یعنی کچھ روز مین شاعری نہین کرتا ہون پھر جو کچھ لکھتا ہون تو طبیعت زیادہ روانی پر آجاتی ہے

ہین اور بھی دنیا مین سخنور بہت اچھے   کہتے ہین کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

اگرچہ دنیا مین اور بھی شاعر بہت اچھے اچھے ہین مگر لوگ کہتے ہین کہ غالب کا انداز بیان سب سے نرالا ہے - مولانا حالی نے مرزا غالب مرحوم کے مرثیہ مین لکھا ہے ؎

طالب و عرفی و نظیری و کلیم   لوگ جو چاہین انکو ٹھہرائین
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے   ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائین
غالب نکتہ دان سے کیا نسبت   خاک کو آسمان سے کیا نسبت

تمثال ہے ہر چہ ماندہ کا پاتا ہے زنگ آخر   صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر

صفائے آئینہ حیرت آئینہ ہے اور یہ زنگ کا سامان ہے یعنی آئینہ کی صفائی ہی سے زنگ پیدا ہوتا ہے جب پانی ایک جگہ رہتا ہے تو اسپر کائی جم جایا کرتی ہے - آئینہ کی صفائی کو پانی اور زنگ کو کائی سے تشبیہ دی ہے مرزا عبدالقادر بیدل مرحوم نے بھی قریب قریب ایسا ہی مضمون اس شعر مین ادا کیا ہے ؎

در طینت افسردہ صفا ہا کدورت است   آئینہ میکند ہمہ زنگار آب را

یعنی افسردہ طبیعتون مین صفائی سامان کدورت بنجاتی ہے - جیسے کہ آئینہ جو ایک افسردہ طبیعت ہے اپنے تمام پانی کو زنگار بنا دیتا ہے اور اسپر کائی پھیر دیتا ہے - بہت ممکن ہے کہ غالب مرحوم نے بجنسہ اس خیال کو ادا کیا ہو - اس صورت مین پہلا مصرعہ بطور دعویٰ اور دوسرا مصرع ثبوت مین ہوگا - اور یہ معنے ہونگے آئینہ جیسے

حیرت نے افسردہ دل بنا دیا ہے اُسکی صفائی اُسکے لیے سامان زنگ ہے اور اسی لیے اُسکے اب اکدیر زنگ جم جاتا ہے مجھے یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ بلکہ اگر شاعر کسی دوسری زبان کے خیال کو اپنی زبان مین اچھی طرح سے ادا کر سکے تو وہ کمال شاعری ہے۔ مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ سنہ ۱۹۵۳ء صفحہ ایک سو چوبیس مین اسکی نسبت لکھتے ہین۔

ہم دیکھتے ہین ہمارے شعرا نے جو کہین کہین فارسی اشعار کا اُردو مین ترجمہ کر دیا ہے ان پر لوگون نے اعتراض کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہین ہے۔ ایک زبان کے شعر کا دوسری زبان کے شعر مین ترجمہ کرنا کوئی آسان بات نہین ہے۔۔

جو شخص دوسری زبان کے شعر کو اپنی زبان مین ترجمہ کرتا ہے گو اُس سے اُسکی قوت متخیلہ کا کمال ثابت نہین ہوتا مگر وہ ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے۔۔۔

مولانا شبلی شعر العجم جلد ۴ مطبوعہ سنہ ۱۹۱۲ء صفحہ ۳۸ مین ترجمہ کے بارہ مین اپنے خیالات کا یون اظہار فرماتے ہین۔ کہ اول اول ایرانی شعرا عربی شاعری سامنے رکھکر شعر کہتے تھے۔ مشق کی ابتدا یہ تھی کہ عربی اشعار کا ترجمہ لفظی کرتے تھے۔ آج بہت سے فارسی قطعے قصیدہ فرد موجود ہین جنکو عام لوگ ایران کا سرمایۂ ناز سمجھتے ہین لیکن وہ عربی اشعار کے ترجمے ہین اور مترجمون نے دانستہ ترجمہ کیا ہے الخ مگر ہمارے لیے اسبارہ مین شعر العجم اور مقدمۂ حالی ہی رہبر نہین ہے۔ عربی فارسی انگریزی اُردو بھی زبانون مین دوسری زبانون سے ترجمے کیے گئے ہین۔ دوسری زبانون پر چونکہ اسوقت مین کچھ نہین لکھتا اسواسطے انکو چھوڑکر محض اُردو کے شعرا کی حالت دکھاتا ہون کہ انمین بڑے سے بڑے شعرا نے فارسی سے ترجمے کیے ہین۔ مگر غالب اسبارہ مین قابل تحسین ہین جنھون نے اگر ترجمے بھی کیے تو ایسے خیالات کے جنپر اُردو کے شعرا کا خیال بھی نہین پہونچا اور انھون ترجمے کے لیے ایسے شاعر ڈھونڈھے جنکے نام پر شاعری کو مدتون فخر رہے گا۔ چنانچہ ہم دکھاتے ہین کہ دیگر شعرا نے ترجمے بھی کیے تو ایسے کہ جن مضامین سے اُردو کی شاعری مین کوئی معقول اضافہ نہین ہوتا بخلاف مرزا کے کہ جو مضمون ہے ایسا ہے کہ اُسکی نظیر نہین ملتی۔ انھون نے کچھ دوسرے ہی باغون سے پھول چنکر ترجمے کے گلدستے تیار نہین کیے بلکہ اپنے فارسی دیوان مین بھی جو جذبات یا تخیل لطائف اور اور فقرے ادا ہوئے ہین اُسے اُردو مین بھی لائے ترجمونکی مثالین ملاحظہ فرمائیے۔

قدسی	آلودہ قطرات عرق کردہ جبین را	اختر ز فلک نگرد روئے زمین را
سودا	آلودہ قطرات عرق سے جبین کو	اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمین کو
لاعلم	بہارے سیر و جام و یارے گذرد	نسیم ہمچو خدنگ از کنارے گذرد
سودا	بہار سیر و جام و یار گذرے ہے	نسیم تیر سی سینہ کے پار گذرے ہے
نظیری	بوسے یار من ازین سست وفا می آید	گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم
سودا	گردش نگہ مست کی یاد آگئی سودا	ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا مین
سعدی	دوستان منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم	باید اول بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی
میر تقی	پیار کرنے کا جو خوبان ہم پہ رکھتے ہین گناہ	ان سے بھی تو پوچھے کوئی تم اتنے کیون پیارے ہوئے
لاعلم	در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را	افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
میر درد	نہ کہین عیش تمہارا بھی منغص ہووے	دوستو درد کو محفل مین نہ تم یاد کرو
ناصر علی	دست خواہم زد بدامان سکندر روز حشر	شور لیلے زادہ ام را شباب مجنون کردہ است
لاعلم	میری لیلے کو کر دیا مجنون	اے سکندر مین تجھکو کیا کہون
خاقانی	ہمسایہ شنید نالہ ام گفت	خاقانی را دگر شب آمد
میر حسن	پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ	بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
بیدل	مسی آلودہ بر لب رنگ پان است	تماشا کن کہ آتش در دخان است
ناسخ	مسی آلودہ لب پر رنگ پان ہے	تماشا ہے کہ آتش در دھوان ہے
ناصر علی	گویند کہ شب بر سر بیمار گرانست	گر سرمہ گران است بچشم تو ازان است
ناسخ	ناتوانی سے گران سرمہ ہے چشم یار کو	جسطرح ہو رات بھاری مردم بیمار کو
حزین	بعصاے خرد این رہ نشاید طے کرد	گردن شیشہ بدست من سرگردان دہ
ذوق	شوق مستی مین ہے گلگشت چمن کا ہمکو	چاہیئے چاہے عصا گردن مینا ہمکو
لاعلم	آسمانہا در شکست من کمر بستہ اند	چون نگہ دارم من از نہ آسیا یکدانہ را
منشی امیر اللہ تسلیم	آسمان گردش مین ہین میرے ستانے کے لیے	چکیان نو چل رہی ہین ایک دانہ کے لیے
نظیری	نہ تنگم دہ نہ برگے نہ گلے نہ سایہ دارم	ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت ما را
مرزا رجب علی بیگ سرور	نہ پھل پایا لگا کے نخل افسوس حسرت کے	مین نخل بے ثمر ہون کس تبہ کردہ دہقان ہون
حافظ	گوہر مخزن اسرار ہمانست کہ بود	حقہ مہر بدان مہر و نشانست کہ بود
آتش	گوہر عشق کا گنجینہ وہی سینہ ہے	داغ دل زخم جگر مہر و نشان ہے کہ جو تھا

نظیری: مجلس چو درشکست تماشا زما رسید — در بزم چون نماند کسے جا بہ ما رسید

آتش: آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

واہب صفاہانی: آتشے نسردہ از کاروان وا ماندہ ام — ہمرہان رفتند و خاکسترنشینم کردہ اند

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں — لگا کے آگ مجھے کاروان روانہ ہوا

غرض یہ کہ اردو شاعروں نے بہت سے ترجمے فارسی سے کیے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی ضرور ہے کہ یہی ترجمہ کبھی سرقہ کی حد پر پہونچ جاتا ہے۔ اُس حالت میں کہ شاعر اصل شعر میں کچھ رد و بدل کرے اور پھر بھی وہ اصل خیال سے بڑھ نہ جائے وہ ترجمہ نہیں ہے۔ ہم محض بہ خیال طوالت تمام بحث کو نہیں لکھتے ہیں۔

انھیں میں چند اقسام اور ہیں۔ تضمین التباس۔ اقتباس۔ استفادہ وغیرہ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ انکو ہم نے بالتفصیل سرقہ شعر میں ذکر کیا ہے۔

اب ہم یہ پھر کہنا چاہتے ہیں کہ اسقدر ترجموں میں شاید ایک دو خیال ایسے ہیں جو ترجمہ کرنے کے لایق تھے ورنہ وہی معمولی خیال ہیں ان سے ادب اُردو میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا برعکس اسکے غالب کے بہت سے شعر جو ہم جا بجا لکھ چکے اور لکھیں گے ان کو غور سے دیکھیے کہ وہ کس قدر قابل قدر ہیں۔ اور وہ خیال کسی دوسری جگہ سے ملتے ہیں یا نہیں۔

نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی — ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

سامان عیش سے میری وحشت کا علاج نہیں ہو سکا۔ بلکہ جام زمرد مجھے داغ پلنگ بن گیا جس سے میری وحشت میں اور اضافہ ہوا۔ یہ تشبیہ اردو میں غالبا بالکل نئی ہے مگر فارسی میں مرزا عبدالقادر بیدل کے یہاں پائی جاتی ہے فرماتے ہیں سے

منزل عیش تو وحشت کدۂ امکان نیست — چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است اینجا

سے در وحشت [illegible] نہ عشرت نتوان زیست — ہر چند چراغانش کنی پشت پلنگ است

یعنی وحشت کدۂ امکان کو منزل عیش نہ سمجھنا چاہیے چمن کو سایہ گل سے پشت پلنگ سمجھے اور اس سے دور بھاگے۔

دوسری جگہ یہ مضمون ہے کہ بزم کا چراغان پشت پلنگ ہے۔ اس سے عشرت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اور بھی یہ باعث وحشت ہے۔

مولانا علی حیدر صاحب نظم نے معلوم نہیں کس بنا پر غالب کے شعر کے مضمون کو مبتذل کہہ دیا ہے ۔

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

عریانی نشان و موید جنون ہے ۔ لہذا پھٹے ہوئے گریبان کا میری گردن پر حق ہے کہ اس نے میرے جنوں کی امداد کی ہے ۔ نظم صاحب نے گریبان کو منادی قرار دیا ہے ۔ مگر میں (گریبان چاک) کو ترکیب مقلوب سمجھتا ہوں ۔ یعنی چاک گریبان جیسے شبنم کہ دراصل نم شب ہے وغیرہ وغیرہ بالکل اسی مضمون کا ایک شعر ہے ۔

جنوں کا میرے ساتھی زندگی بھر تھا تو اک یہ تھا مری گردن پہ احساں رہ گیا میرے گریباں کا

بہ رنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

نیرنگ شعبدہ ۔ بال ۔ بازو یک تپیدن ایک دفعہ تڑپنا ۔ کاغذ آتش زدہ جو کاغذ جل گیا ہو میرا نیرنگ بیتابی کاغذ آتش زدہ کی مانند ۔ ایک بال تپیدن پر ہزاروں دل باندھتا ہے یعنی جس طرح جلتے ہوئے کاغذ میں سیکڑوں دل پیدا ہو جاتے ہیں ۔

(دل سے مراد وہ نقاط ہیں ۔ جو کاغذ کے جلنے میں درمیان میں پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح میرے دل کے جلنے میں سیکڑوں دل جو دل کے ٹکڑوں سے مراد ہے اس کے ساتھ جلتے ہیں ۔ یا یہ مطلب ہے بالقول مولانا نظم یہ مراد ہے کہ نیرنگ بیتابی مثل کاغذ آتش زدہ ہے کہ دل نے ایک بال تپیدن پر ہزار ہزار آئینہ باندھے ہیں ۔ اس شعر میں آئینہ متحرک کی تڑپ کو اس شعلہ سے تشبیہ دی ہے جو کاغذ آتش زدہ سے بلند ہو بہر حال شعر کے مضمون میں گنجلک پیدا ہو گئی ہے اور کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا نواب صدیق حسن خان سے تپیدن ہا بہ جان دلم در تب و تاب است ، چون کاغذ آتش زدہ یک شہر خراب ام یا یہ سمجھئے کہ میرا نیرنگ بیتابی ایک کاغذ آتش زدہ ہے جس کے ایک تڑپنے پر ہزار آئینہ دل بندھے ہوئے ہیں یعنی نوحہ ہیں ۔۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم آسمان سے اُس عیش کی جو اُس نے ہم سے چھین لی ہیں کیسی کیسی تمنائیں کرتے ہیں۔ عجب خفیف العقل ہیں کہ یہ نہیں جو نا اہل ہم سے چھین لے گیا ہے اسکو اس پر قرض سمجھے ہوئے ہیں حاصل یہ ہے کہ عیش وارفتہ کی اُمید فضول ہے نظیری اُس عیش رفتہ کی واپسی کی یون تمنا کرتا ہے

نقدے کہ دوران بردہ است از کیسۂ عمرِ من بادوید مستغنی شوم از صد دہد گر نیم را

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

ہم ہیں اور وہ بے سبب رنجیدہ ہونیوالا۔ آشنا کہ تھا دشمن ہے یعنی ہمارا اُس بے سبب رنج آشنا دشمن سے پالا پڑا ہے۔ جو اپنے روزن دیوار میں شعاع آفتاب دیکھکر میری نگاہ سمجھتا ہے اور مجھ پر روزن درست جھانکنے کی تہمت رکھتا ہے۔ بے سبب رنج آشنا۔ کو اگر پورا جملہ سمجھ لیا جائے تو اُس حالت میں صحیح ہے۔

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اگر اپنی حقیقت کے دیکھنے کا مشتاق ہے تو فنا ہو جا۔ کیونکہ کوڑے اور تنکے کے نصیبہ کا فروغ گلخن میں جانے کے اوپر موقوف ہے یعنے جب تنکا فنا ہونے کی نیت سے بھاڑ میں جاتا ہے اور جلتا ہے تب اُسمیں فروغ پیدا ہوتا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ فنا فی اللہ ہوکر انوار معرفت حاصل کر۔ حصول انوار معرفت بغیر فنا غیر ممکن ہے۔ یعنی تو جو قوت اپنی حقیقت کو کہ دراصل تو کیا چیز ہے معلوم کرسکتا ہے کہ فنا ہو جاے۔۔۔ اسی مضمون کو فارسی میں یون ادا کیا ہے

جلوہ در طالعِ خاشاک من افتاد زبون شد غلط بادۂ گلخن بہ گلستان رفتم

میں ایک تنکا ہوں جو اپنے طالع کی فروغ کی اُمید پر گلخن میں جانا چاہتا ہوں۔ مگر راستہ بھولکر گلشن میں چلا گیا۔ اور وہاں جانے کا نتیجہ اُسکے حق میں اچھا نہ ہوا۔

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

خدا جانے اسد کیسا بسمل ہے کہ قاتل سے کہتا ہے کہ تو خون ناحق کا خوف نکر۔ دونوں عالم کا خون میری گردن پر سہی تو مشق ناز کیے جا۔ اور مجھے اسی انداز سے قتل کرتا رہ

یہ شعر مقبول ہے۔ اسی انداز کا وہ شعر ہے جو پہلے لکھا جا چکا ہے ؎ مرتا ہوں اس آواز پہ
اس سے کمال عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ خسرو علیہ الرحمۃ کا ایک شعر ہے جس میں وہ اپنے کمال عشق کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

بروز حشر اگر پرسند خسرو را چرا کشتی　　چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہمان گویم

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں　　تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

میں تیرے ظلم اس وجہ سے نہیں سہتا ہوں بلکہ یوں کہ معشوق تیرے اوپر عاشق ہیں۔ آخر کار کوئی نہ کوئی رقیب مجھے ایسا مل جائیگا جس سے میں عشق کر سکوں گا۔ رقیب معشوق اس واسطے کہا کہ معشوق پر حسینان جہاں عاشق ہیں تو وہ متکلم کے رقیب ٹھہرے اس لیے ظلم سہنا عین مصلحت ہوا۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس غزل کے تمام اشعار زین العابدین عارف مرحوم کے مرثیہ میں کہے گئے ہیں۔ یہ مرزا کے عزیز۔ اور عزیز ترین ایک خوشگو خوش فکر پایہ ناز شاگرد تھے۔ اور مرزا کو ان کے ساتھ کمال محبت تھی دست گلچین ازل اس گل نوشگفتہ کو عین عالم شباب میں دراز ہوا جس کے غم میں غالب کو مدتوں اپنی آنکھوں سے خون بہانا پڑا اس غزل کے بعض دوسرے اشعار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سب جلے ہوئے دل سے نکلے ہیں اور جو کچھ کہا گیا ہے تصنع کو اسمیں ذرا دخل نہیں ہے۔ ہر شعر ایک سر تیز نشتر ہے جو دل کو مجروح کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں گویا عارف مرحوم کے تصور کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔ اور شکایت کرتے ہیں۔ کہ تمکو یہ چاہئے تھا کہ اگر تمکو مرنا ہی تھا تو ہمارے ساتھ مرتے مگر تم نے جلدی کی میرے مرنے کا انتظار نہ کیا۔ لہذا اب تم کوئی دن اور تنہا رہو کیوں تنہا گئے تھے نہ تنہا جاتے نہ تنہا رہتے۔

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا　　ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

میں تیری قبر کی لوح مزار پر ناصیہ فرسائی اس لیے کرتا ہوں کہ اگر یہ پتھر نہ گھسے گا تو میرا سر تو گھس جائیگا۔

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں　　مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

وفورِ غم کی بدحواسی نے عارف مرحوم کا نزع کا عالم پیشِ نظر کر دیا ہے اور وہ ہمیشہ کیلیے مرزا سے وداع ہوا چاہتے ہیں اور غالب جواب میں کہتے ہیں کہ کل کی بات ہے کہ تم مہمان سرائے عالم میں آئے تھے اور آج جانے کی اجازت چاہتے ہو یہ ہم بھی جانتے ہیں کہ جانا ضرور ہے ہمیشہ کوئی یہاں نہیں رہیگا مگر کوئی دن تو اور ٹھہرو۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے　　کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

تم جاتے ہوئے مجھ سے کہتے ہو کہ اب قیامت میں ملیں گے۔ کیا خوب کیا قیامت کا کوئی اور دن ہے کیا جس دن مجھ سے تم قیامت تک کے لیے جدا ہو وہ دن قیامت کا نہیں ہے بے مثل شعر کہا ہے۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف　　کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

یہاں مصنف آسمان سے شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عارف ابھی جوان تھا اگر وہ کوئی دن اور نہ مرتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے　　پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم میرے گھر کے لیے چودھویں کے چاند تھے۔ اور چودھویں کا چاند کچھ دن تک یکسان رہتا ہے پھر بتدریج گھٹ کر ہلال ہوتا ہے تب کہیں چھپتا ہے۔ مگر تم یکایک چھپ گئے اور میرے گھر کو سیہ خانۂ غم بنا گئے۔ ماہِ شبِ چاردہم جوانی کی رعایت سے کہا گیا ہے یہ شعر بھی خوب ہے۔

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے　　کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

تم ایسے لین دین کے کہاں کے کھرے تھے کہ ادھر ملک الموت نے تقاضا کیا اور ادھر تم نے اپنی جان اسکے حوالے کر دی کچھ دنوں اس کو تقاضا کرنے دیتے

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی   بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

مین نے مانا کہ تمکو مجھ سے نفرت تھی نیّر سے لڑائی تھی۔ مگر اس بنا پر تمکو جانا نہ چاہیے تھا کم از کم بچوں کا تو کوئی دن اور تماشا دیکھا ہوتا۔ نیّر مرزا غالب مرحوم کے شاگرد رشید تھے ممکن ہے کہ عارف اور نیّر میں کچھ باہم چشمک ہو۔ ورنہ ظاہر یہ معنے یہی ہین کہ اگر ہم دونوں کے ساتھ رہنے سے تمھیں تنفر تھا تو بچون کا تو تماشہ دیکھا ہوتا۔

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش   کرنا تھا جوانمرگ گذارا کوئی دن اور

اے جوانمرگ صحیح ہو کہ ہم لوگوں کی صحبت سے تم خوش نہ تھے۔ مگر بہر حال اتنی مدت جیسے تیسے خوش و ناخوش گذر رہی تھی اسی صورت سے کچھ دن اور گذارا کرتا تھا کہ تیرے سامنے ہمارا کام تمام ہو جاتا۔ اور پہلے ہم مر جاتے۔

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب   قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

تم لوگ جو یہ کہتے ہو کہ ایسا سخت صدمہ اٹھا کر بھی تم زندہ ہو حالانکہ زندہ نہ رہنا چاہیے تھا مگر یہ تمھاری نادانی ہے۔ مجھے اس جینے سے لذت حیات سے بہرہ ور ہونا مقصود نہین ہے بلکہ میری زندگی صرف اس لیے ہے کہ اتنے دن موت کی تمنا اور کرون۔

ردیف زے (ز)

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر   ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

تو نے مرنے پر مجھے تن آسانی کا الزام دیا ہے اور غم عشق سے فارغ سمجھ لیا۔ مگر یہ نادانی ہے مجھے غم عشق سے مرنے کے بعد بھی فراغت نصیب نہین ہوئی ہے۔ بلکہ داغ عشق اب تک میرے جیب کفن پر اس صورت سے چمکتا ہے جیسے چاک گریبان صبح میں مہر تاباں چمکتا ہے جیب کفن کو ہی داغ عشق کہہ سکتے ہین۔ کیونکہ اسکو گریبان دریدہ سے استعارہ کرتے ہین جو نشان جنون عشق ہے اور یہی داغ کو آفتاب کہا جا سکتا ہے مولانا نظم سحر کو شب عمر کے گذر جانیکا استعارہ ٹھہراتے ہین۔ میرا ایک شعر ہے ؎

زندگی مثل اجل از غم ہجران دارم　　عوض چاک کفن چاک گریبان دارم

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر　　ہون گلفروش شوخئ داغ کہن ہنوز

یعنی میرے دل مین داغ عشق تھا - اور اب دل کے مٹ جانے سے وہ داغ بھی مٹ گیا - جو کہ زر سے مشابہ تھا - اس صورت مین گویا مین وہ مفلس ہون جس کی دولت ضائع ہو چکی ہے تو اس حالت مین مین شوخی داغ کہن کو یاد کرکے ناز کیا کرتا ہون جسطرح سے کہ مفلس اپنی گذشتہ زائل شدہ دولت پر ناز کیا کرتے ہین - اسی قسم کا ایک مضمون ہے جسکو فارسی مین یون ادا کیا ہے

چہ غم ار بجد گرفتی ز من احتراز کردن　　نتوان گرفتن از من بہ گذشتہ ناز کردن

میخانۂ جگر مین یہان خاک بھی نہیں　　خمیازہ کھینچے ہے بت بیدادفن ہنوز

میرے میخانۂ جگر مین شراب خون ایک بوند بھی باقی نہین اور اس پر بھی معشوق خونخوار کو ابتک انگڑائیان آ رہی ہین - اور بدستور میرے خون کا پیاسا ہے -

حریف مطلب مشکل نہین فسون نیاز　　دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

میرے مشکل مطالب میری عاجزانہ دعاؤن سے پورے نہین کرتا تو اے خدا یہی دعا قبول کرے کہ خضر کی عمر دراز ہو - حصول مدعا کی نا امیدی کی انتہا کو تحصیل حاصل کی آرزو کرنے مین دکھایا گیا ہے - نعمت خان عالی ایک جگہ لکھتے ہین ؎

گفتن دعائے زلف تو تحصیل حاصل است　　یا خضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

تیری زلف کو درازی کی دعا دینا گویا تحصیل حاصل ہے کیونکہ خضر کو کوئی درازی عمر کی دعا نہین دیتا اسکی عمر خود دراز ہے -

نہ ہو بہرزہ بیابان نورد وہم وجود　　ہنوز تیرے تصور مین ہے نشیب و فراز

صوفیا وغیرہ پر طنز ہے مطلب ہے کہ تو اپنے وہم مین وحدت وجود یعنی توحید و عرفان کا رستہ طے کرنا چاہتا ہے - اور اس مین تو نے مراتب مقرر کیے ہین کہ پہلے فنا فی الشیخ ہو - پھر فنا فی الرسول اور پھر فنا فی اللہ و دیگر مقامات جبروت

ملکوت ناسوت وغیرہ وغیرہ کو طے کرے تو ان نشیب و فراز اور مقامات کا خیال اگر تیرے دل میں ہے اور تو ان خیالات میں محو ہے تو اس راستہ کا طے کرنا ایک فضول اور بیہودہ کام ہے اس صورت سے تو ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہونچ سکتا سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی   کین رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

یا دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ تو نے ماسوی اللہ کا کچھ وجود سمجھ رکھا ہے۔ اسی وہم سے جنگل کو تیرا خیال طے کر رہا ہے اور باوجود اسکے کہ سیکڑوں انقلاب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا مگر پھر بھی تیری نظر میں نشیب و فراز زمانہ کی وقعت ہے حالانکہ وجود ماسوی اللہ اور نشیب و فراز عالم کچھ نہیں ہیں اور یہ محض تیرا وہم ہی وہم ہے ہنوز کے لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سے پہلے تو نے بے وجودی وجود اور بے ثباتی نشیب و فراز کا معائنہ کیا ہے مگر پھر بھی اب تک تیرے وہی بیہودہ خیال اور وہم قائم ہیں۔ نشیب و فراز کے معنے آسمان و زمین کے بھی لیے جاسکتے ہیں اور یہ نشیب و فراز کا استعارہ آسمان و زمین سے کیا جاتا ہے جیسے کہ آتش مرحوم ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

پتلوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں نہیں   دھبہ مٹے زمین کے نشیب و فراز کا

نظم صاحب نے اس شعر کی شرح اسطرح کی کہ وجود سے وجود ماسوے اللہ مراد ہے اور نشیب و فراز کا یہی سبب ہے کہ تو وجود کے لیئے مراتب سمجھے ہوے ہے جسکا مرتبہ اعلیٰ وجوب ہے اور مرتبہ ادنے امکان ہے اور امکان میں بھی قیام بذاتہ و قیام بغیرہ جوہر و عرض کے لیے وجود میں پستی و بلندی رکھتا ہے یعنی جادۂ مستقیم یہ ہے کہ ہر شے کو موجود کو وجود واحد سمجھ اور وجود کے لیے اقسام نہ نکال کہ یہ راستہ بہتر کا ہے۔

حسرت صاحب فرماتے ہیں کہ بہرزہ یعنی بیکار۔ تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں یعنی تیرا تصور ناتمام اور قاصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وحدت وجود کا عقیدہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ وجود اشیاے عالم کے متعلق تمام اوہام سے نجات حاصل ہو جائے۔

وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں   کہ دیجئے آئینۂ انتظار کو پرواز

ہم سمجھتے تھے کہ وصال یار اپنے جلوے ضرور دکھائیگا مگر ہم میں انتظار کی طاقت کہاں ہے

جلوہ تماشا جلوہ کا تماشا دکھانے والا پرواز صیقل۔

جلوہ تماشہ کا آئینہ صاف انتظار میں صورت دکھاتا ایک ہی یا جاتا ہے ؎

جبتک وفا ہو وعدہ پیمان زندگی کہاں
مجھ سے زیادہ عہد ترا استوار ہے

اثر گریہ مسلم سہی لیکن اے دل
کل پہ منت کش فریاد ہوا یا نہوا

یک قلم کاغذ زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تپ گرمیٔ رفتار ہنوز

یکقلم یعنی سب سر۔ چونکہ میرے پاؤں میں ہنوز تپ گرمیٔ رفتار باقی ہے۔ اور میں صحرا نوردی کرتا ہوں تو صحرا اس اثر سے کاغذ آتش زدہ بن گیا ہے۔

یکقلم۔ کاغذ۔ صفحہ۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب الفاظ مناسب جمع کیے گئے ہیں۔ ہم رعایت لفظی کے وہاں تک قائل ہیں جہاں تک سامع کو یہ نہ معلوم ہو کہ مصنف نے بالارادہ کوئی لفظ کسی لفظ کی رعایت سے رکھا ہے اور بے تکلفی سے معنے پیدا ہوں اس سے زیادہ آورد ہے اور قابل تحسین نہیں ہے۔

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

میں اس بت سے جان کیونکر عزیز رکھوں وہ میرا ایمان ہے۔ اور ایمان پر جان قربان کر دینی چاہئے۔

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تیرے تیر کا پیکان جو دل میں تھا وہ دل سے نکل گیا۔ مگر یہ نہیں ہے کہ میں اس کے خیال کو بھول گیا ہوں اس کا خیال ابھی بدستور ہے۔ پہ بجائے پر۔ اور پہ بجائے مگر اب متروک الاستعمال ہیں۔ پیکان میں اس محل پر اعلان نون اچھا نہیں معلوم ہوتا اور یہ غیر فصیح ہے۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب صبر کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ واقعہ بہت سخت ہے اور اس قابل ہے کہ جان دیدیں مگر جان پیاری ہے اسواسطے مجبوراً اس سخت واقعہ اور صدمہ کی برداشت

گر گئے۔ اس شعر میں اور کا واؤ گر گیا ہے اور اس صورت میں یہ فع کے وزن پر رہ گیا ہے
مگر اور بروزن فع اساتذہ کے کلام میں اکثر ہے لفظ اور بروزن فاع اور فع کے مواقع
استعمال جدا جدا ہیں جنہیں اگر خلط ملط کیا جائے تو مفہوم غلط ہو جائے گا اور اسکو یقیناً
غیر فصیح سمجھا جائیگا۔ چنانچہ اور بمعنی دیگر اور بمعنی واؤ عاطفہ وغیرہ وغیرہ کا محل استعمال
جدا ہے۔ بلکہ واؤ عاطفہ کے بجائے اور کو بعض نے اسقدر تخفیف کیا ہے کہ واؤ اور رے
دونوں گر گئے اور وہ بھی صحیح ہے مگر روزمرہ میں زیادہ تر بروزن فع مستعمل ہے اسکی
صحت میں کوئی شبہہ نہیں اور یہاں اس قاعدہ کو کہ وسط سے کبھی کوئی حرف نہیں
گرتا۔ مقبول نہیں سمجھ سکتے۔ ۔

نے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

گلِ نغمہ مراد ہے گلبانگ سے۔ نہ میں گلبانگ ہوں نہ پردۂ ساز ہوں بلکہ اپنی
شکست کی آواز ہوں۔ جو سراپا درد ہے مجھے خوشی اور طرب سے کوئی واسطہ نہیں
ہے فارسی میں خود مرزا صاحب اس کو یوں فرماتے ہیں ؎

دیگر ز ساز بے خودی ما صدا مجوے — آوازے از شکستن تار خودیم ما

تو اور آرائشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

تجھے اپنے خمِ کاکل کی آرائش کی فکر ہے۔ اور مجھے دور دراز کے اندیشوں نے
کہ دیکھیے یہ آرائش میرے دل پر کیا کیا ستم کرے گی۔ یا یہ آرائش کرکے تو کہاں جائے
گا۔ یا یہ آرائش میرے طرح طرح کے اور سیکڑوں رقیب پیدا کر دے گی۔ پریشان کر رکھا
ہے۔ اندیشہائے دور و دراز نے شعر میں جان ڈال دی ہے اور بہت سے معنی پیدا کر دیے
ہیں۔ آرائش خمِ کاکل پر اندیشہائے دور و دراز پیدا ہونا۔ ایک لطیف مضمون ہے اگرچہ
محاورہ دور اندیشی ہے دور و دراز اندیشی نہیں ہے مگر رعایت لفظی اور ردیف کی
مجبوری نے مصنف کو خلاف محاورہ یا تصرف محاورہ پر مجبور کیا۔ مگر قادر الکلامی اور حسنِ بندش
کی معنی نے پردہ رکھ لیا اور کوئی حرف نہیں آنے دیا۔

لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی — ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

اے سادہ دلی تو ہم کو فریب دیتی ہے کہ ہماری لاف تمکین و وقار قائم رہے گی

یہ نہیں ہو سکتا ہماری تمکین و وقار قائم رہے کیونکہ ہمارے سینہ میں جو اسرار ہیں وہ ایسے نہیں کہ چھپائے سے چھپ جائیں کیونکہ وہ سینہ گداز ہیں۔ اگر میرا سینہ انکو چھپانا بھی چاہے تو وہ نہیں چھپ سکتے۔ حاصل یہ ہے کہ سوز عشق چھپائے سے چھپ نہیں سکتا۔

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

عشق اور مشک چھپائے سے کہیں چھپتے ہیں　　سر بازار ہی پتا ہے ڈھنڈورا ان کا

یا لاف تمکین فریب کو سادہ دلی کی صفت مانئے تو یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ اے سادہ دلی یہ تیری امداد کا وقت ہے جس صفت سے موصوف ہے اوسے کام میں لا اور ہمارے راز ظاہر کر دے۔

اگر لاف تمکین کو سادی کہئے تو یہ مفہوم ہے کہ اے لاف تمکین تو نے میری سادہ دلی کا فریب کھایا ہے۔ اور اپنی یہ طمانیت ہے کہ ہمارا حال کسی پر کھل نہیں سکتا حالانکہ ہمارے سینہ کے اندر جو راز ہیں وہ ہرگز چھپ نہیں سکتے اور وہ سینہ گداز ہیں۔

یہ مفہوم بھی بعید از قیاس نہیں ہو اگر کہا جائے کہ ہم کبھی تمکین کی شیخیاں مارتے ہیں اور کبھی اپنی سادہ لوحی کا لوگوں کو فریب دیتے ہیں حالانکہ یہ سب اُن اسرار سینہ کی اثر کا اثر ہے جو ہمارے سینہ میں ہیں وہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں یعنی لوگ ہمارے تمکین کی لاف اور سادہ دلی کے فریب کی وجہ ہٰت سے خوب واقف ہو گئے۔

اگر تمکین۔ لاف۔ اور فریب کو مضاف نہ کہا جائے تو یہ مفہوم ہو کہ ہماری تمکین کا دعویٰ لاف اور ہماری سادہ دلی کا ادعا فریب سمجھا گیا ہے اور اس کا سبب راز ہا۔ سینہ گداز ہیں۔

ہوں گرفتار الفت صیاد　　ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

مجھے الفت صیاد نے قبضہ کر رکھا ہے ورنہ طاقت پرواز ہنوز مجھ میں باقی ہے اور چاہوں تو اڑ سکتا ہوں۔ بہت ہی اچھا شعر ہے۔

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے　　ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

اب تک تو میں اُس کے ناز اٹھانے کی حسرتیں کرتا ہوں کاش وہ دن بھی آئے کہ بجائے اس حسرت ناز کے اس کے ناز اٹھاؤں۔

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون　　جس سے مژگان ہوئی نہ ہو گلباز

میرے دل میں کوئی ایسا قطرۂ خون نہیں تھا جو بہ کر میری پلکوں پر نہ آیا ہو اور پلکوں نے خوشی سے اس کو نہ بہایا ہو۔ گلبازی سے خوشی کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز　　اے ترا ظلم سر بسر انداز

اے حرف ندا۔ منادی محذوف ہے۔ یعنی اے نازنین تیرا غمزہ سراسر انگیز ہے اور تیرا ظلم سر بسر انداز ہے۔

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو　　ریزش سجدۂ جبین نیاز

تو آ گیا۔ اب مجھے تیرے لئے بہت سے سجدے کرنا مبارک ہو۔ یا میری جبین کے بہت سے سجدے مجھے مبارک ہوں۔

مجکو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا　　میں غریب اور تو غریب نواز

تو مجھ سے ناراض تھا۔ یا خیال کرتا تھا کہ اگر میں اس کی بات پوچھوں گا تو میری پریشان ہوگی یا دوسرے عشاق مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ مگر دیکھ یہ تیرے خیال فضول تھے۔ اگر تو نے مجکو پوچھا تو یہ کچھ غضب نہ ہوا مجکو پوچھنا۔ اور مجھ پر مہربانی کرنا ضرور تھا کیونکہ میں غریب ہوں اور تو غریب نواز ہے۔ غریب نوازی کی شان یہ ہے کہ غریب کو پوچھے اور اس پر مہربانی کرے۔ اس شعر میں گویا معشوق کی فہمایش مقصود ہے۔ اظہار شکر مراد نہیں ہے۔

اسد اللہ خان تمام ہوا　　اے دریغا وہ رند شاہد باز

اسد اللہ خان مر گیا ہائے افسوس۔ وہ رند شاہد باز۔ دوسرا مصرعہ بطور نوحہ اور

کے جس سے مراد مردہ پر رونا اور بیان کرنا ہے واقع ہوا ہے۔

مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے   دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس

ذوق اسیری کو مبارکباد دیتا ہے کہ لے اب تیری آرزو پوری ہو جائے گی مرغ گرفتار کے پاس ایک دام خالی نظر آتا ہے چل اور اسمین گرفتار ہو جا۔ قاعدہ ہے کہ جانورون کے شکار کرنے کے لئے جال کے پاس طائران گرفتار کے پنجرے رکھدیتے ہین کہ آزاد جانور گرفتار ہون اور دہوکہ کھائین۔

جگر تشنۂ آزار تسلی نہوا   جوئے خون ہمنے بہائی بن ہر خار کے پاس

میرا جگر میرے خون کا پیاسا ہے اور مجھے آزار دینے مین اس کو خوشی ہوتی رہی ہے اس کی خاطر سے ہم نے ہر ایک خار صحرا کے پاس صحرا گردی جنون کی حالت مین تلوون مین کانٹے چبھنے کی وجہ سے تلوون سے اور اس کی تکلیف محسوس ہونے سے آنکھون سے جوئے خون بہائی مگر پھر بھی جگر کو تسکین نہوئی۔ اور اسی طرح ہماری ایذا دہی پر تلا ہوا (ہے) تسلی ہوا اگرچہ محاورہ نہین ہے مگر جیسے خبر نہوا یعنی مجھے خبر نہوئی ہے اسی قبیل سے تسلی نہوا کو بھی سمجھ لیجئے تو غلط کہنے کی جرارت نہین ہوتی اور اسے غالب کا تصرف ماننا پڑتا ہے۔

یہان یہ لکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ محاورہ مین عوام اور خواص تصرف نہین کرسکتے مگر مقتدر اہل قلم اور مستند شعرا اگر کوئی خاص محاورہ قرار دین تو عوام اس کو نا جائز نہین کہہ سکتے۔

مند گئین کھولتے ہی کھولتے آنکھین ہے ہے   خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

تم نزع کی حالت مین میرے پاس آئے میری حسرت دیدار نے اگرچہ میری آنکھین کھولین مگر کھولتے ہی کھولتے میری آنکھین بند ہو گئین۔ اس آنے سے نہ آنا اچھا تھا۔ غالب کا ایک شعر اس قسم کا پہلے لکھا جا چکا ہے ؎

مند گئین کھولتے ہی کھولتے آنکھین غالب   یار لائے مرے بالین پہ اسے پر کس وقت

مگر شیخ ابراہیم ذوق نے اس مضمون کو نہایت اچھے انداز سے بیان کیا ہے جس کا جواب نہیں ہو سکتا

دیکھا دم نزع دلارام کو   عید ہوئی ذوق مگر شام کو

مندنا بند ہونے کے محل پر اب متروک الاستعمال ہے۔ اور عوام کی زبان سمجھا جاتا ہے اگرچہ ظاہر پیارا معلوم ہوتا ہے۔ مگر در مع الدہر کیف دار کا کیا علاج۔

میں بھی گھٹ گھٹ کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے   دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

میرا غمخوار جو مجھے نصیحت اور ملامت کرکے عشق سے روکتا ہے ان کو سنکر میرا دل دمبدم زخمی ہوتا ہے کاش اس زبان کے بدلے جس سے وہ مجھے نصیحت کرتا ہے میرے غمخوار کے پاس ایک تیز چھری ہوتی جس سے وہ میرا گلا کاٹ دیتا اور دم بھر میں میرا کام تمام ہو جاتا یہاں یہ نکتہ قابل بیان ہے کہ غمخوار کو بوجہ غمخوار ہونے کے جان دینا پسند کیا ہے اگر نصیحت و ملامت جو معشوق کے عشق سے باز رہنے کا باعث ہے وہ سننا پسند نہیں ہے اور یہ شان کمال عشق ہے۔

دہن شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل   نہ کھڑے ہوجیے خوبان دل آزار کے پاس

اے دل شیر کے منہ میں جا بیٹھنا دل آزار معشوقوں کے پاس کھڑے ہونے سے اچھا ہے بیٹھنے اور کھڑے ہونے میں تقابل لطف انگیز ہے۔ دہن شیر میں [illegible] نہیں یہ ایک غیر مانوس مضمون ہے۔

دیکھ کر تجھکو چمن بسکہ نمو کرتا ہے   خود بخود پہونچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

چمن کا جوش نمو تجھے دیکھ کر ترقی کرتا ہے اور پھول اپنے آپ گوشۂ دستار کے پاس پہونچ جاتا ہے کہ وہاں پہونچکر تجھے زینت دے اور خود فخر حاصل کرے۔

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے   بیٹھنا اسکا وہ آکر تری دیوار کے پاس

غالب وحشی سر پھوڑ کر مر گیا۔ ہائے ہائے اسکا وہ تیری دیوار کے پاس سر پھوٹنے

کی نیت سے آکر بیٹھتا یاد آتا ہے یا وہ جب تجھے دیکھنے کے لیے بیتاب ہوتا تھا تو قریب دیوار کے پاس آکر بیٹھا کرتا تھا۔ دوسرا مصرع ایسا واقع ہوا ہے کہ جسے اگر دوسرے الفاظ کے ساتھ ادا کیا جاتا تو ہرگز یہ لطف نہ آتا اور شعر کا رتبہ کم ہو جاتا جیسے۔

یہی بیٹھا تھا جو آکر تری دیوار کے پاس   یا

بیٹھا کرتا تھا جو آکر تری دیوار کے پاس (یا) بیٹھا رہتا تھا جو اکثر تری دیوار کے پاس

اس صورت کو انشا کہتے ہیں اور اکثر انشائیہ جملہ بمقابلہ خبریہ کے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں دوسرے مصرعوں میں خبر کی صورت ہے جو ایسا اثر نہیں رکھتے۔ غالب کے یہاں یہ انداز بیان زیادہ ہے جیسے ایک جگہ پہلے کہا ہے ؎

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے   وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

ایک جگہ قریب ایسا ہی مضمون اسی صورت سے لکھ چکے ہیں۔

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا   یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ردیف (ش)

نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے   لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

خس جوہر کو آئینہ جوہر سے استعارہ کر کے کہتا ہے کہ میرے معشوق کے روئے روشن کی چمک دمک آئینہ دیکھتے وقت آئینہ میں آگ لگا دے اگر جوہر آئینہ کو سبزۂ خط سے طراوت نہ پہونچے شعلۂ حسن عالم سوز کا اثر محض طراوت سبزۂ خط کی وجہ سے آئینہ پر نہیں پڑتا۔ شیخ علی حزین کے یہاں ایسا ہی مضمون اس صورت سے ادا کیا گیا ہے ؎

کتان طاقتم را پردہ داری میکند حسنش   رخش در شام خط ماہ سحاب آلودہ را ماند

یعنی میرا کتان طاقت ابتک پارہ پارہ ہو جاتا مگر سبزۂ خط عارض پر ایسا ہے جیسے چاند پر سحاب اور چونکہ وہ اس میں چھپا ہوا ہے اس واسطے اسکا اثر نہیں پڑا ہے بہت خوب کہا ہے۔

اس صورت کو بھی سرقہ نہیں کہتے بلکہ یہ ایک اقتباس ہے جسمیں صرف طرز بیان کو لے لیا ہے اور ایسے شعر بہت سے شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں طرز بیان کے

سوائے مضمون بالکل نیا ہے مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ بغیر دوسرے خیال دیکھے ہوئے یہ خیالات پیدا نہیں ہوتے۔

چنانچہ یہ چند اشعار دیکھئے اور قیاس کر لیجئے کہ متاخرین نے متقدمین کے خیالات کو لیے بغیر یہ شعر نہیں کہے جنکی گواہی اشعار خود باواز بلند دے رہے ہیں۔

نظیری — مرا بہ سادہ دلی ہائے من توان بخشید
خطا نمودہ ام و چشم عافیت دارم

حزنی — مرا بہ سادہ لوحیہائے حزنی خندہ می آید
کہ دارد چشم لطف از دلبری نامہربانی ہم

قائم — ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

داغ — عشق میں اک بلند قامت سے
ہم گلے مل گئے قیامت سے

امیر — سایہ میں اک بلند قامت کے
فتنے سب سو گئے قیامت کے

غالب — انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آسی — دیکھتے ہی تجھے کیوں آگئی منہ پر رونق
کیا مرا رنگ پریدہ تری تصویر میں تھا

سعدی — رسم است کہ مالکان تحریر
آزاد کنند بندہ پیر

علامہ آزاد بلگرامی — نازم بہ صاحبے کہ سراپا مروت است
آزاد کرد پیر غلام خریدہ را

سعدی — اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

حیرتی — ہمچو پروانہ بہ شمعے سر و کار است مرا
کہ اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

مندرجہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ ایک ایک خیال اور ایک انداز بیان پر شعر کی بنا رکھی گئی ہے اور باقی مضامین بالکل جدا ہیں۔

نظیری۔ حزنی۔ قائم کے یہان سادہ دلی۔ داغ و امیر کے یہان قافیے۔ میر اور غالب کے یہان معشوق کے دیکھنے سے عاشق کی خوشحالی۔ سعدیؒ اور آزاد کے یہان آزادی۔ سعدیؒ اور حیرتی کے یہان فروغ تجلی کے خیالات ایک ہین۔ باقی مضمون بالکل علیحدہ ہین۔ لیوے۔ لے کے بجاے صحیح تو ضرور ہے مگر متروک الاستعمال ہے۔ اب دہلی مین لیوے بولتے ہین نہ لکھنؤ مین۔

فروغ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق
نہ نکلے شمع کے پاسے نکالے گر نہ خار آتش

حسن کے جلوے اور فروغ پر عاشق کی مشکل کے حل ہونے کا انحصار ہے گویا

ایک عاشق ہے جس کے پاؤں میں بتی سے کانٹا چبھا ہوا ہے اگر شعلۂ شمع کا جلوہ نہ ہو تو وہ کانٹا نکل نہیں سکتا اور یہ ظاہر ہے کہ شعلہ ہی بتی کو جلاتا ہے۔ حل مذکر لکھا جاتا ہے مگر مصنف نے بتانیث باندھا ہے۔ اور یہ غالباً مشکل کی وجہ سے یا دھوکا ہو گیا ہے کیونکہ ترکیب کے بغیر یوں لکھا جاتا (نثر) فروغ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے اور بصورت ترکیب یوں (فروغ حسن سے حل مشکل عاشق ہوتا ہے) مگر غالب کا ایسی معمولی بات میں دھوکا کھانا ایک تعجب انگیز امر ہے اس لیے یہ قیاس غلط ہوگا کہ شاید مصرع اس صورت سے ہو

فروغ حسن سے ہوتی ہے حل ہر مشکل عاشق

ورنہ شعر میں ایک غلطی مانی جائے گی۔

ردیف شین

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

وقت شام آفتاب جو آسمان سے رخصت ہوتا ہوا اور سپر لال نمودار ہوتا ہے تو وہی تار شعاع شمس اس کے واسطے جادۂ راہ ہیں اور ماہ نو وہ آغوش کشادہ ہے جو آسمان نے سورج کے رخصت کرنے کے لئے کھولی ہے حاصل یہ کہ شام کے وقت آسمان آفتاب کو رخصت کر دیتا ہے مولانا نظم اس شعر کی شرح میں شعاع کے معنی ان سفید خطوں کے لیتے ہیں جو قبل طلوع آفتاب اور بعد غروب آفتاب افق میں نمایاں ہوتے ہیں جنکو قرن الشمس بھی کہتے ہیں۔ اور خط ابیض بھی مگر یہ معنی خلاف قیاس ہیں شعاع کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں

رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع ہوئی ہے آتش گل آب زندگانی شمع

رخ نگار کو گل تصور کیا اور شمع کے سوز جاودانی کو حیات جاودانی مانا اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ میرے معشوق کے گل رخسار کے رشک سے ہمیشہ شمع جلتی ہے تو گویا آتش گل زندگانی شمع کے لیے آب بقا ہے یعنی اگر آتش رخسار معشوق اس قدر روشن نہ ہوتی تو شمع کو یہ سوز جاودانی نصیب نہ ہوتا۔ یہ مضمون محض آتش کو آب بنانے کے لیے لکھا گیا ہے نہایت نازک اور اچھا مضمون ہے۔ اگرچہ یہ مصرع دوسرا شاعرانہ ہے مگر آورد سے خالی

نہین ہو یہان یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ آمد سے زیادہ اچھا آورد کا مضمون ہو سکتا ہو بشرطیکہ سلاست کے ساتھ باندھا جاے اور نشست الفاظ درست ہو۔

زبان اہل زبان مین ہو مرگ خاموشی — یہ بات بزم مین روشن ہوئی زبانی شمع

اہل زبان کا خاموش ہو جانا بمنزلہ مرجانے کے ہے اور یہ بات شمع کی زبانی معلوم ہوئی ہے جیسے کہ جب وہ خاموش ہو جاتی ہے یعنی بجھ جاتی ہے تو اس کو شمع کشتہ اور شمع مردہ کہتے ہین۔

کرے ہو صرف بہ ایماے شعلہ قصہ تمام — بطرز اہل فنا ہو فسانہ خوانی شمع

شمع کی فسانہ خوانی اور اپنا قصہ سنانا اس طرح ہو جیسے کہ عارف اپنا حال اشارون مین ظاہر کرتے ہین شمع کے شعلہ کی جنبش کو اشارہ مانا گیا اور جل بجھنے کو قصہ کا تمام کرنا فرض کیا گیا۔ دوسرا پہلو جو مولانا نظم کے یہان ہو وہ یہ ہو کہ شمع صرف اشارے سے سارا قصہ تمام کرتی ہے یعنی شعلہ سے لو لگا کر سر سے پاؤن تک فنا ہو جاتی ہے جس طرح صوفیان اہل فنا شعلہ عشق سے لو لگا کر فانی الذات ہو جاتے ہین اور اپنی ہستی سے گذر جاتے ہین مگر غور کیجیے تو دوسرے معنی پہنانے سے لفظ فسانہ خوانی بیکار ٹھہرتا ہو کیونکہ اہل فنا کے جل بجھنے کو فسانہ خوانی نہین کہہ سکتے اگرچہ جل بجھنے سے قصہ تمام ضرور ہو جاتا ہے۔

شمع کا قصہ صرف اس قدر سمجھ لیجیے کہ مجھے جلایا اور مین نے بے تکلف جل گئی۔

غم اس کو حسرت پروانہ کا ہو اے شعلہ — ترے لرزنے سے ظاہر ہو ناتوانی شمع

اے شعلہ تیرے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمع کو پروانے کے جل جانے کا غم ہو اور وہ ناتوانی ظاہر ہو رہی ہے۔

اتفاق سے حکیم مومن خان صاحب کی غزل بھی اسی ردیف مین ہو جسکے کئی ایک شعر غالب سے ملتے جلتے ہین آپ بھی غالبًا دو اُستادون کے موازنہ سے لطف اٹھائین گے اور معلوم کرینگے کہ دو اُستاد جب ایک ہی بحث ایک ہی مضمون پر قلم اٹھاتے ہین تو

کیونکہ توارد و سرقہ وغیرہ کے الزام سے خود کو بچا لیتے ہیں یہ بھی نہیں تو کم از کم یہ ضرور ہوگا کہ حکیم مومن خان ایک مشاق شاعر تھے سمجھ لیجئے کہ غالب اور مومن مرحوم ایک مجلس مشاعرہ میں غزل پڑھ کر اپنی استادی کا سکہ جما رہے ہیں۔

غالب — رخ نگار سے ہے سوز جاودانی شمع | ہوئی ہے آتش گل آب زندگانی شمع
مومن — داغ جدائی دُر دندان و روئے و زلف | ہے رشک شمع و شعلہ شمع و دخان شمع
غالب — غم اُس کو حسرت پروانہ کا ہے اے شعلہ | ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع
مومن — آتا ہے بیکسوں پہ تو جلاد کو بھی رحم | روتی ہے شمع آپ سر کشتگان شمع
غالب — جلی ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھکو | نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغ بدگمانی شمع
مومن — اسکو بھی کوئی پردہ نشین ہی جلائے ہے | فانوس سے سنا ہے یہ راز نہان شمع
غالب — کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام | بطرز اہل فنا ہے فسانہ خوانی شمع
مومن — روشن ہے اہل بزم پہ شکوہ نسیم کا | اس پھیلتی[1] زبانپہ دیکھو بیان شمع

غالباً توارد کردہ شعروں میں خیال ایک ہے اور اس کو متفرق طریقہ سے ادا کیا ہے۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے | بجلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

تیرے خیال سے روح کو جنبش ہوتی ہے جس طرح شمع کے لرزنے اور ہوا کے چلنے کی۔ یا تیرے خیال سے روح کو ہوا کی طرح جنبش ہوتی ہے اور شمع کی طرح سے پرفشانی کرتی ہے۔ بجلوہ کی (ب) کو تشبیہ کے لیے ٹھہرانے میں اتنا لطف نہیں ہے جتنا کہ قسمیہ ٹھہرانے میں عبارت میں بلاغت اور فصاحت کی جھلک نظر آتی ہے اور جس میں کہ وہی تشبیہ کے معنی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

اہتزاز ہوا کے چلنے کو کہتے ہیں اور چونکہ بعض حکمائے روح کو بھی ہوا قرار دیا ہے اسوا [illegible] کو (ب) کو اگر قسمیہ ٹھہرائیں گے تو یہ معنی پیدا ہوں گے۔ تیرے خیال سے روح اس طرح تڑپتی ہے جس وقت ہوا چلتی ہے یا شمع پرفشانی کرتی ہے گویا اس کے سبب سے میری روح کو بھی ایک امنگ پیدا ہوتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جس طرح یہ چل کر اپنے معشوق سے ملتی ہیں میں اسی طرح اپنے مبدا حقیقی سے ملجاؤں۔

[1] پھیلتی میں ہائے ہوز بسکون صحیح نہیں ہے بلکہ بکسر ہ و سکون کا تھا۔

نشاط داغ غم عشق کی بہار نہ پوچھ ۔۔۔ شگفتگی ہے شہید گل خزانی شمع

داغ غم عشق کی خوشی اور بہار کی کیفیت کو نہ پوچھ اگرچہ یہ داغ مثل گل شمع کے ہے جو اس کی بہار کو خزان بنا دیتا ہے مگر وہ گل خزانی شمع ایسا ہوتا ہے کہ بہار بھی اسیر شیفتہ اور نثار ہے کیونکہ اس گل خزانی کی بہار اور اس کا انجام فنا ہے اور وہ عین بقا ہے اور گل گلشن کی بہار کا انجام خزان ہے اور وہ فنا ہے یہی صورت گل داغ عشق کی ہے۔

جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھکو ۔۔۔ نہ کیون ہو دل پہ مرے داغ بدگمانی شمع

شمع بالین یار پر مجھکو دیکھکر جلتی ہے اور چاہتی ہے کہ سوائے میرے اور کوئی وہان نہ رہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری رقیب ہے تو پھر اس کی بدگمانی کا میرے دل پہ داغ کیون نہو۔

ردیف ف

بیم رقیب سے نہین کرتے وداع ہوش ۔۔۔ مجبور یان تلک ہوئے اے اختیار حیف

معشوق کی بزم مین اس کے جلوے یا اس کی بے اعتنائیون کو دیکھ کر بیہوش بھی نہین ہو سکتے کیونکہ رقیب ہمارا راز عشق فاش کریگا۔ یا وہ معشوق سے بے تکلف ہو جائیگا۔ یا وہ ہمارا برا حال دیکھکر خوش ہوگا۔ اے اختیار افسوس ہے کہ ہم اس قدر مجبور ہو گئے ہین کہ اپنے ہوش و بیہوشی کا بھی ہمکو اختیار نہین رہا۔ اس صورت مین یون فرض کر لیجئے کہ اختیار کو مخاطب کر کے مصنف کہتا ہے کہ اے اختیار افسوس ہے کہ تو ہماری یہ حالت دیکھتا ہے اور کچھ نہین کرتا۔ اقبال کا ایک شعر یاد آیا ہے مرے خیال مین وہ زندگی نہین ساقی جو ہوشیاری و مستی مین امتیاز کرے

جلتا ہے دل کہ کیون نہ ہم اک بار جل گئے ۔۔۔ اے نا تمامی نفس شعلہ بار حیف

اے آہ شعلہ بار تو ہم کو بتدریج جلا رہی ہے لیکن ہم اس بات سے جل رہے ہین کہ ہم یکدم کیون نہ جل گئے یا یہ کہ دمبدم ہماری عمر کا حصہ گھٹتا جاتا ہے اور ہم آہستہ آہستہ گویا جل رہے

رہتے ہیں مگر ہم کو اس کا کمال رنج ہے کہ ایک دم نہیں جل جاتے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ہر سانس کے ساتھ جو ہوا جسم میں جاتی ہے وہ ترویح قلب کرتی ہے جس سے حرارت غریزی کو اشتعال دیتی ہے اور وہی حرارت باعث بقا و فنا ہے تو گویا وہ ایک آگ ہے جو مدام جلا رہی ہے
رشید سلمہ۔ روح کی بیتابیاں آخر مرے کام آگئیں ہر نفس کہتا ہوں میں چلتی ہوئی شمشیر ہوں

ردیف ک

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

میرے زخموں پر بے پروا لڑکے کہاں نمک چھڑکتے پھرتے۔ اگر نہیں پتھروں میں جو وہ دیوانہ سمجھکر مجھکو مارتے ہیں نمک بھی پیدا ہوا کرتا تو بڑا مزا ہوتا۔ تاکہ جب وہ پتھر مارتے تو زخم بھی ہوتا اور نمک بھی چھڑکا جاتا تو مجھ ایذا دوست کو دونی لذت حاصل ہوتی۔

گرد راہ یار ہے سامان ناز زخم دل ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

میرے زخم دل کا سامان ناز راہ یار کی گرد ہے ورنہ نمک تو دنیا میں بہت پیدا ہوتا ہے اسکا میرے زخموں پر چھڑکا جانا کچھ دشوار نہیں ہے۔ وہ میسر ہو سکتا ہے کاش وہ خاک چھڑکی جائے۔ نازک بات اس میں یہ ہے کہ نمک اگرچہ ابتدا میں تکلیف رساں ہے مگر آخر میں وہ زخم کو بھر دیتا ہے اور مٹی زخم کو بڑھاتی ہے بھرنے نہیں دیتی۔
یا یہ کہ میرے زخموں پر چھڑکنے کے لئے نمک کی پیدائش ناکافی ہے کس قدر تحقیر کے لیے تیسری یہ صورت بھی نکلتی ہے کہ میرے زخموں پر نمک تو چھڑکا ہوا ہے مگر میرے زخموں کے لئے نمک کا چھڑکا جانا باعث ناز نہیں ہے۔ باعث فخر تو صرف گرد راہ یار ہے جو انہیں بھرتی ہوئی ہے جو ہر ایک کو میسر نہیں ہوتی ہے۔ نمک تو ایک معمولی اور ارزاں

مجھکو ارزانی رہے تجھکو مبارک ہو جیو نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے۔ تجھکو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو اور مجھے نالۂ بلبل کا درد یعنی تجھے حسن چونکہ گل کی طرح خندۂ نمکین عطا کیا ہے اور اس خندۂ نمکین سے تجھے

نا ئبرِ دردِ بلبل دیا ہو اسلئے دونوں قابل مبارکباد ہیں - وہ نمک تیرے لیئے باعث فخر ہے اور یہ درد میرے لیے مایۂ ناز ہے - ہوجیو جو اس شعر میں مستعمل ہے وہ اگرچہ اب متروک ہے مگر مولانا نظم نے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ہوجیو نہایت مکروہ لفظ ہے مجھے اس میں کوئی کراہت نہیں معلوم ہوتی اور صیغۂ امر کا اس صورت میں غالب کے زمانے تک عام استعمال ہوتا تھا آیئو جایئو - کھائیو - دیکھیو سب الفاظ صحیح ہیں سند کے لیے غالب ہی کا ایک شعر ہے

دیکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

لیجئے اور شعر غالب ہی کا یاد آیا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اسی طرح غالب کے معاصرین میں آزردہ - ذوق - مومن شیفتہ سب کے یہاں یہ الفاظ مستعمل ہیں -

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

آج کس شہسوار نے کنارِ دریا پر اپنے توسن کو تیزی کے ساتھ دوڑایا ہے کہ جس کے شورِ جولاں کے رشک سے دریا کے دل زخموں میں (جو موجیں ہیں) گردِ ساحل کا رشک نمک چھڑکا گیا اور اس شورِ جولاں کے سامنے دریا کو اپنا زور و شور ہیچ معلوم ہوا مصرعِ ثانی میں صرف ایک لفظ (ہے) اردو ہے - اور باقی فارسی اردو میں اس قدر فارسیت اچھی نہیں (بزخم موجۂ دریا) سوا فارسی زبان کے اردو میں آ سکتے بجز کا رنگ دکھاتا ہے - اگرچہ غالب کو بوجہ فارسیت غالب ہونے کے معذور رکھ سکتے ہیں مگر اب ایسا نہ لکھنا چاہیئے -

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

میرا معشوق میرے زخموں کی قدر کرتا ہے جہاں کہیں نمک دیکھتا ہے وہ مجھ کو یاد کرتا ہے کہ اچھا ہوتا یہ اس کے زخموں پر چھڑکا جاتا یاد کرتا ہے بلانے کے معنی میں ہے کہ نمک کے دیکھتے ہی وہ مجھے بلاتا ہے اور میرے زخموں پر چھڑکتا ہے یہ مبالغہ ہے - آجکل دیکھے ہے متروک ہے اور دیکھتا ہے یا دیکھتا ہے مستعمل ہے -

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

عاشق کے جسم کو زخمی کر کے چلا جانا ایک افسوسناک بات ہے کہ دل جس کی وجہ سے جسم پر زخم لگے ہیں ابھی زخموں کی دولت سے محروم ہے اور اعضائے زخم رسیدہ نمک کے خواہشمند ہیں ابھی کام بالکل ادھورا ہے اس صورت میں تیرا چلا جانا اچھا نہیں یہ ایک اچھا حیلہ ہے جس سے دم بھر معشوق کو اور ٹھہرانا چاہتا ہے۔ مانگے ہے بجائے مانگتا ہے اب غیر فصیح ہے۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

میں درد و زخم زیادہ کرنے کے لئے غیر کا احسان اپنے سر لونگا کہ اس سے نمک چھڑکنے کی التجا کروں جیسے خندۂ قاتل نمکین ہے اسی طرح میرا زخم بھی خنداں ہے اور وہ سرتاپا نمک بنا ہوا ہے منت کھینچنا محاورہ فارسی کا ترجمہ ہے (منت کشیدن) مگر اردو میں اگر لکھتے ہیں تو منت کشی ہی لکھتے ہیں یا منت اٹھانا وغیرہ۔ منت کھینچنا اب نہیں لکھتے غلط نہیں ہے مگر جب مترادف الفاظ ہمارے یہاں موجود ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ محاورہ فارسی کا ترجمہ کیا جائے۔

یاد ہیں وہ دن مجھے غالب کہ وجدِ شوق میں زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

غالب مجھے وہ دن یاد ہیں کہ وجد شوق یعنی ایذا طلبی کی حالت میں اگر میرے زخم سے نمک گر جاتا تھا تو میں اس کو پلکوں سے چنتا تھا۔ نمک کا پلکوں سے چننا ایک عجوبہ مسئلہ ہے کہتے ہیں کہ نمک کا اتنا ادب کرنا چاہئے کہ زمین پر گر جائے تو اسے پلکوں سے چنئے۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

سر ہونا ایک محاورہ ہے جس کے معنی حال کے معلوم کرنے میں اصرار اور زیادتی کے ہیں دوسرے معنی سر ہونا کسی بات کا انجام کو پہنچنا یہاں دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں اول یہ کہ یہ ضرور ہے کہ ہماری آہ میں اثر ہوگا مگر بہت دیر میں ہوگا اور دیر میں

تیری زلف پیچیدہ کے اسیر رہتے ہم باخبر ہونگے اس وقت تک ہم کو اپنی زندگی کی بھی امید نہیں ہے دوسرے یہ کہ جب تک ہماری آہ اثر کریگی اور تیری زلف کی مہم کو فتح کریں گے اتنے میں ہمارا کام تمام ہوجائے گا۔ حاصل یہ کہ تیری زلف دراز ایسی ہے کہ میری عمر اسکے حال معلوم کرنے یا اسپر قبضہ کرنے میں تمام ہوجائے گی۔

اگرچہ بادی النظر میں یہ گمان ہوتا ہے کہ محض قافیہ و محاورہ کی غرض اور مناسبت لفظی کے لیے زلف کا مضمون اس شعر میں ادا کیا گیا ہے مگر ایک نازک بات یہ ہے کہ دلبر تو قبضہ ہونا اور اس کے اسرار معلوم کرنا تو بہت ہی دشوار اور ناممکن ہے ہماری عمر ایک ابتدائی مدارج ہی کام میں ختم ہوجائے گی اسی طرح تمام اعضا کو کہہ سکتے ہیں کہ تمام پر قبضہ پانا تو بہت ہی محال ہے۔

واضح ہو کہ اکثر نسخوں میں ردیف میں بجائے ہوتے تک کے ہونے تک دیکھنے میں آئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہوتے تک بھی مصدری معنی پیدا کرتا ہے حکیم مومن خاں کے یہاں بھی اسی ردیف میں ایک غزل پائی جاتی ہے انھوں نے بھی بجائے تون اسکے ردیف میں (ت) رکھی ہے۔

مولانا نظم اور حسرت صاحب کے یہاں ہوتے تک ہے میں بھی اسی کو اچھا سمجھتا ہوں خدا جانے غالب نے کیا لکھا تھا یا یہ کہ تیری زلف جب تک رسا ہوگی ہمارا کام تمام ہوجائے گا۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ۔۔۔ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

دریا کی ہر موج کے جال میں صد کام نہنگ کے حلقہ ہیں معلوم نہیں قطرہ جب تک موتی ہو اسپر کیا کیا آفتیں آتی ہیں۔ کام نہنگ کو حلقۂ دام سے استعارہ کیا ہے۔ حاصل یہ کہ کمال کے حاصل کرنے میں اہل کمال پر ہزاروں آفتیں آتی ہیں بہت خوب شعر کہا ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ۔۔۔ دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

عاشقی کے معاملات میں صبر کرنے کی ضرورت ہے اور تمنا جلد باز ہے تو مجھے اس کشمکش اور متضاد حالت سے یہ فکر پیدا ہوئی ہے کہ جب تک جگر کا خون ہو اور قصہ اختتام کو پہونچے میں اپنے دل کا کیا حال کروں اور کیونکر ضبط کروں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یعنی یہ بھی مانا کہ آپ ہمارا حال دل سنکر غفلت نہ کرینگے اور جلد سے جلد خبر لینگے مگر ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ صبر کریں اور زندہ رہیں ہم کو سوز دل اس وقت تک خاک کر دیگا۔

اسی طرح کا بالکل ایک شعر میر درد کا ہے ؎

کی تو بھی تاثیر آہ آتشیں نے اسپہ بھی — جب تلک پہنچی ہی پہنچے ادھر کا پانی ڈھیر تھا

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

بعض حکما کا قول ہے کہ شبنم آفتاب سے پیدا ہوتی ہے اور آفتاب ہی کی حرارت اس کو جذب کر دیتی ہے اسی صورت کا مصنف اظہار کرتا ہے کہ دھوپ شبنم کو فنا کی تعلیم دیتی ہے یعنی اس کو فنا کرتی ہے مجھے بھی اگر آپ عنایت کی نظر کرتے تو ابتک میں بھی فنا ہو جاتا یا جب آپ نظر کرینگے فنا ہو جاؤنگا بالکل یہی مضمون شیخ علی حزین کے یہاں پایا جاتا ہے ؎

گر امان ہز ز شبنم نیست جسم ناتوان من — اگر نبود با من سرگرمی آفتابش را

مثلاً صائب فرماتے ہیں۔

باندک سرگرمی پشت بر گل میکند شبنم — چہ دارد آشنائی این قدر کس بیوفا باشد

صائب کے یہاں اسی مضمون کو نہایت اچھے پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے کہ باوجود اس کے کہ پھول شبنم کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے مگر جہاں ذرا آفتاب کا سایہ پڑتا ہے شبنم غائب ہو جاتی ہے اور یہ اس کی پھول کے ساتھ ایک سخت بیوفائی ہے۔

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

دنیا کے رہنے کی فرصت صرف اسیقدر ہے کہ ایک نظر اس کو دیکھ سکے محفل کی گرمی اسیوقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ شعلہ رقص کرتا ہے گویا وہ رقص شرر اس کی ہستی اور عمر کی مدت ہے جس کے بعد وہ ختم ہو کر فنا ہو جاتا ہے ایک جگہ ذوق کہتے ہیں ؎

کیا اعتبار ہستیِ ناپائیدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

دوسرا پہلو یہ ہے کہ بزم اک شعلہ ہے جو رقص کر رہا ہے جس وقت یہ ختم ہوا بزم ختم ہو گئی یکنظر

سے مراد بہت ہی کم نیز یہی طب کا مسئلہ ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اے اسدؔ غم ہستی کا سوائے موت کون علاج کر سکتا ہے شمع کو بہر صورت جبراً و قہراً صبح تک جلنا پڑتا ہے اور پھر جب وہ فنا ہوتی ہے تو اس کو آرام ہوتا ہے۔ غالبؔ نے ایک جگہ اسی مضمون کو اور بھی کہا ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

ذوقؔ مرحوم فرماتے ہیں ؎

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے — تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

یہ دونوں شعر ایک ہی مشاعرے میں پڑھے گئے تھے غالبؔ مرحوم ذوقؔ سے توارد دیکھ کر اور ان کے شعر کو اپنے شعر سے چست پا کر اس شعر کو پڑھنا نہ چاہتے تھے مگر مجبوراً پڑھا۔

ردیف گ

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

اگر تجھ کو دعا کے قبول ہو جانے کی بھی امید ہے تب بھی دعا نہ کر اپنے دل کو بے مدعا رکھ اور ہمیشہ اسی خواہش میں رہ کہ دل میں کوئی مدعا پیدا نہ ہو نہ دل میں کوئی خواہش ہوگی نہ دعا مانگنے کی ضرورت پڑے گی۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اے خدا تو میرے گناہوں کا حساب کرتا ہے تو مجھے یاد آتا ہے کہ مجھے کس کس گناہ کے کرنے کی حسرت باقی رہ گئی ہے اس سے بہتر ہے کہ تو مجھ سے میرے گناہ کا حساب نہ کر دوسری جگہ فرماتے ہیں اور گویا وہی شعر کی شرح ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اسی خیال کو فارسی میں بھی جگہ اعادہ کیا ہے۔ رباعی ؎

ای آنکہ دہی مایۂ کم و خواہش بیش — آنروز کہ وقت باز پرسش آید پیش
بگذار مرا کہ من خیال دارم — با حسرت عیش ہائے ناکردۂ خویش

ردیف ل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بلبل اس قدر فریب وفائے گل پر مٹی ہوئی ہے اور اس کے رنگ کو پائدار سمجھتی ہے مگر بلبل کے اس خلل دماغ پر پھول ہنس رہے ہیں ایک جگہ پہلے فرما چکے ہیں ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف — ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

نسیم خوشبو لی ہوئی ہوا اور خوشبو اسی کو مصنف کہتا ہے کہ نسیم کو مبارک ہو اور وہ آزادی سے گشت لگائے۔ گل شگفتہ گویا پھول کی محبت کے جال کے حلقے ہیں جنکو ہوا نے توڑ دیا ظاہر ہے کہ نسیم ہی پھولوں کو شگفتہ کرتی ہے اس میں نسیم کی آزادی کی نسیم ہی کو مبارکباد دی گئی مگر دوسرا پہلو یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عاشق بطریق طنز معشوق سے کہتا ہے کہ اپنے نسیم دام ہوائے گل میں گرفتار تھی مگر وہ اس دام کے حلقوں کو توڑ آئی اب آپ کو ایک نیا عاشق ملا۔ آپ کا حسن گل کے حسن سے زیادہ ہے آپ اس کو ضرور اپنے دام محبت میں اسیر کر لیں گے۔ یا عام آدمیوں کو مبارکباد دی گئی کہ نسیم دام محبت گل سے آزاد ہو گئی ہے اب پھولوں کی خوشبو کو منتشر کرے گی۔

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا — اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

لوگ پھول کے نالۂ خونیں نوا کو رنگ سمجھ کر اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔ ہائے پھول کا گریۂ خونیں کس قدر بے اثر ہے بہت خوب شعر کہا ہے۔

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

وہ حریف سیہ مست بہت اچھا ہے جو سایۂ گل کی طرح گل کے پاؤں پر بیہوش پڑا ہوا

عرض حال کر رہا ہو - ایک جگہ مرزا داغ مرحوم فرماتے ہیں ؎

غش کھا کے داغ یار کے قدموں پہ گر پڑا | بیہوشش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار | میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

بہار پھولوں کو اس لیے کھلاتی ہے کہ تو انکی خوشبو سونگھے یا انکی سیر کرے - انکا ہار پہنے یا تیرے بستر پر بچھائے جائیں تو گویا پھول میرے رقیب ہیں کیونکہ تجھے انکی خواہش اور محبت ہوگی یا وہ تیرے ہم بستر ہوں گے -

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے | مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

جب زمانۂ بہار میں میرا شیشہ شراب سے اور دل ہوائے سیر گل سے خالی ہوتا ہے تو مجھے بہار سے شرمندگی ہوتی ہے -

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی | خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

چونکہ تیرا حسن غیرت مند ہے اور یہ نہیں چاہتا کہ میرا عاشق میرے سوا کسی دوسری شئے کو نظر محبت سے دیکھے اسی بنا پر پھولوں کی دلفریب ادائیں میری نگاہ میں خون ہیں اور میں انکو اچھا نہیں سمجھتا بلکہ بری معلوم ہوتی ہیں -

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک | بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

پھول جو یکے بعد دیگرے کھلتے ہیں یہ کسی اور سبب سے نہیں ہے بلکہ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ایک پھول کو کھلا دیکھکر دوسرا گل ناشگفتہ یہ سمجھتا ہے کہ حسن چمن میں جلوہ گر ہوا اور یہ سمجھ کر دوسرا پھول بھی کھل آتا ہے اسیطرح اس دھوکہ میں عدم سے یکے بعد دیگرے پھول دوڑے ہوئے چلے آتے ہیں فارسی میں کہا ہے تا گل برنگ و بوئے کہ ماند کہ در چمن شاگل دیپس گل آمدہ در جستجوئے گل

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو | جسکا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

اس میں حرف ندا محذوف ہے یعنی اے غالب مجھے اس سے ہم آغوشی کی تمنا ہے جسکے

خیال نے گل سے اپنے گریبان کو زینت دے رکھی ہے۔

آغوشی کی (ے) دبتی ہے اور یہ باتباع فارسی مصنف کے یہاں جائز سمجھا گیا ہے کیونکہ اہل فارس بے تکلف حروف علت کو گرا دیتے ہیں۔ یا اس جگہ یہ سمجھ لیجئے کہ دو حروف علت جمع ہونے سے ایک حرف گرا دیا گیا ہے جو صحیح ہے۔ اہل لکھنؤ (ے) کا گرنا صحیح نہیں سمجھتے۔

ردیف میم

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس　　برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

آزادوں کو ایک دم سے زیادہ غم نہیں ہوتا ہے ہم اپنے گھر میں تجلی کی روشنی سے چراغ جلاتے ہیں کہ دم بھر چمک کر وہ ہمارے تمام غموں کا خاتمہ کر جاتی ہے یعنی دم بھر ہم نے اندھیرے کا غم کیا اور بجلی کی چراغ جلا اور غم تاریکی کا فیصلہ ہو گیا۔

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال　　ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بتخانہ ہم

تمہارا خیال ہر وقت محفلیں برہم کیا کرتا ہے یعنی گذشتہ صحبتوں کو جو درہم و برہم ہو چکیں ہماری نظر کے سامنے لایا کرتا ہے۔ اس صورت میں ہم اُن اگلی صحبتوں کے بتخانہ اور گنجفے کے ورق گردان ہیں گنجفہ چونکہ ایک تفریح کا سامان ہے اس لیے اسکی ورق گردانی سے اُن خفا ہا برہم شدہ فسادا کا پتہ ملتا ہے نہ کہ مجالس ماتم و عزا کا۔ ورق گردانی میں بادی النظر میں یاے مصدری کا دھوکہ ہوتا ہے مگر دراصل یہ یاے فاعلی ہے۔

باوجودیکہ جہان ہنگامہ پیدائی نہیں　　ہیں چراغان شبستان دل پروانہ ہم

باوجود اس کے کہ ہنگامہ بہت ہے اور شور و شورش اس قدر زیادہ ہے مگر پھر بھی کچھ نہیں ہماری ہستی ہماری شور و شورش اُن چراغوں سے مشابہ ہے جو پروانہ کے دل میں جلتے ہیں اور جس سے پروانہ میں یہ اضطراب اور انتشار ہے جنکا دیکھئے تو دراصل کوئی وجود نہیں ہے۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترک جستجو　　ہیں وبال تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم

لوگ سمجھتے ہون سگے کہ ہم جو ترک دنیا کیے ہوے ہین یہ قناعت کے سبب سے ہی مگر واقعہ یہ نہین ہی کہ ہم جستجو کرتے کرتے تہک گئے ہین تو اس سے ہم پڑ رہے ہین لہذا ہم تکیہ گاہ ہمت مردانہ (یعنی قناعت کے لیے جو دراصل بر بناے ضعف ہی) وبال اپنی یعنی ہمت مردانہ قناعت پر تکیہ کرتی ہی اور ہمارا قناعت پر تکیہ ضعف سے ہے نہ کہ ہمت مردانہ سے۔ جو لوگون کو قناعت کا فریب دیتا ہی اسلیے تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم سے شرم کرتی ہے۔

دائم الحبس اسمین ہین لاکھون تمنائین اسد
جانتے ہین اس دل پرخون کو زندانخانہ ہم

میرا دل پرخون ایک ایسا قید خانہ ہے جس مین لاکھون حسرتین ہمیشہ کے لیے مقید کر دی گئی ہین یعنی میرے دل کے ارمان کبھی پورے نہین ہوتے۔

بنالہ حاصل دلبستگی فراہم کر
متاع خانہ زنجیر جز صدا معلوم

اگر تو دلبستہ ہے تو رونا بھی اختیار کر۔ کیونکہ زنجیر جو ایک دلبستہ ہے اسکے گھر مین سوائے نالہ و فریاد کے کچھ نہین ہے۔ گویا حاصل دلبستگی رونا ہے۔ ایک میرا شعر ہے ؎

گل داغ جنون ہین دلمین اب رونا ہی لازم ہے
ہمین اب ننھے کی کرنی پڑیگی باغبانی بھی

مارا دیار غیر مین مجکو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مجکو خدا نے غریب الوطن مارا اور پردیس مین موت دی۔ اس صورت مین گویا اسنے میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ کہ جیسا مین بیکس تھا اس کے لیے غریب الوطنی کی موت بھی ضرور چاہیے تھی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر مین وطن مین بھی مرتا تو بھی بسبب اسکے کہ مین ایک بیکس تھا کوئی مجھے رونے نہ آتا یا میرا کوئی غم نہ کرتا اور یہ امر میرے لیے باعث رنج اور دوسرون کے لیے ہنسنے کا موجب ہوتا۔ لیکن اب جو پردیس مین میری لاش بے دفن و کفن پڑی ہوئی ہے اور کوئی رونے والا نہین ہے تو کم از کم لوگ یہ تو کہتے ہین کہ یہ ایک بیکس تھا غریب الوطن تھا۔ بخلاف وطن کے کہ یہی واقعہ وہان بھی

ہوتا اگر وہاں باعث شماتت ہمسایہ ہو جاتا۔ آتش مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر　　ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

مولانا ناطق صاحب فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

رونے والے نہ تھے غربت کی اجل پر نہ سہی　　ہنسنے والا تو وہاں کوئی دل زار نہ تھا

وہ حلقہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا　　رکھ لیجیو مرے دعوئے وارستگی کی شرم

اے خدا اس کے دام زلف کے حلقہ میرے پھانسنے کی گھات میں لگے ہوئے ہیں اور میں ہنوز خود کو آزاد ظاہر کرتا ہوں اور در اصل آزاد ہوں تو اس صورت میں اگر وہ میرے اسیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میری آزادی پر حرف آجائے گا لہذا اے خدا مجھے ان سے بچانا اور میری وارستگی اور آزادی کے دعوے کی شرم رکھ لینا۔

ردیف نون (ن)

لوں وام بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے　+　غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

میرا نصیبہ سو رہا ہے۔ اور میں بے خواب ہوں۔ تو اس حالت میں اپنی رفع تکلیف کے لیے ایک میٹھی نیند میں اپنے بخت خفتہ سے قرض ضرور لے سکتا ہوں۔ مگر اس کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ مجھے تو کبھی خود نیند آتی ہی نہیں ہے۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

یہ تمام غزل ایک ہی رنگ میں کہی گئی ہے جس میں گذشتہ زمانہ کو یاد کیا گیا ہے کہتا ہے کہ دل میں وہ ذوق و شوق ہی باقی نہیں رہا جس کی بدولت وصل کی خوشی اور ہجر کا غم ہوتا تھا۔ وہ زمانہ اسکی راتیں۔ اس کے ماہ و سال خواب و خیال ہو گئے۔

فرصت کاروبار شوق کسے　　ذوق نظارۂ جمال کہاں

اب نہ دل میں عشق باقی ہے نہ تمنائے دیدار معشوق کا کہیں پتہ ہے۔

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا   شور سودائے خط و خال کہاں

دل تو اپنی جگہ ہے وہ تو خیر گیا ہی اب وہ دماغ بھی باقی نہیں رہا خیال خط و خال کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

تھا وہ اک شخص کے تصور سے   اب وہ رعنائی خیال کہاں

صرف ایک شخص کے تصور کا کرشمہ تھا کہ ہم کو جمال وغیرہ اچھا معلوم ہوتا تھا اب تصور ہی باقی نہیں رہا کہ جمال کی رعنائیاں ہم کو فریفتہ کریں۔ یہاں ایک شخص کی جگہ کوئی دوسرا لفظ شوخ وغیرہ کہہ دیا جاتا تو خلاف مقام ہو جاتا اور معلوم ہوتا کہ ابھی ذوق معشوق اور حسن کی پرکھ اور چسکا دلمیں باقی ہے کہ اس کو شوخ کہا گیا لہذا ایک سادہ لفظ شخص کہا۔

ایسا آسان نہیں لہو رونا   دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

جیسا کہ آنکھوں سے لہو بہانا پہلے آسان معلوم ہوتا تھا اب کہ تمام طاقت سلب ہو چکی ہے وہ خونفشانیاں آسان نہیں معلوم ہوتیں نہ جگر میں وہ طاقت ہے نہ دلمیں وہ توانائی ہے۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق   واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

قمار خانۂ عشق ہم سے چھوٹ گیا کیونکہ وہاں جائیں تو کس برتے پر جائیں اب نہ اپنے پہلے نقد دل ہے نہ زر داغ جنوں ہے۔

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں   میں کہاں اور یہ وبال کہاں

اب افکار دنیوی سے پریشان ہوں اور شب و روز اسی میں سرگرداں رہتا ہوں ایک زمانہ تھا کہ مجھے اس وبال سے کوئی سروکار اور تعلق ہی نہ تھا۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب   وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اب تمام قوائے جسمانی ضعیف و نحیف ہو گئے - وہ جوانی کا سا اعتدال مزاج مین باقی نہ رہا -

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہین | ہوتی آئی ہے کہ اچھون کو برا کہتے ہین

ہم سے معشوق نے وفا کی تو دشمن اس کو جفا اور معشوق کو ظالم کا خطاب دیتے ہین مگر یہ کوئی نئی بات نہین ہے یہی قاعدہ ہے اچھون کو برا کہا ہی کرتے ہین - اس مین معشوق کو اچھا کہکر اپنے ساتھ وفا کرنے پر تحریص دلائی گئی ہے -

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے | کہنے جاتے تو ہین پر دیکھئے کیا کہتے ہین

آج ہم اس ارادے سے اُنکے پاس جاتے ہین کہ اپنی پریشانی دل کا ان سے کہین مگر دیکھئے یہ تو سب ارادہ ہی ارادہ ہے اس کو دیکھکر ہمارے منہ سے کیا نکلتا ہے یا وہ یہ حال سنکر کیا کہتے ہین کسی کا مشہور مصرع ہے -

خدا جانے وہ کیا پوچھین زبان سے میری کیا نکلے

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ فرماتے ہین کہ ع

اُس سے مین شکوہ کی جا شکر ستم کر آیا | کیا کرون تھا مرے دل مین سو زبان پر آیا

اگلے وقتون کے ہین یہ لوگ انہین کچھ نہ کہو | جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہین

مے و نغمہ کو بُرا جاننے آدمی کہتے ہین کہ اندوہ ربا اور غم غلط ہے - اور آجکل کے زمانہ مین اس مین یہ صفت باقی نہین رہی ہے کہ اندوہ و غم اس سے کم ہو جائے سو ان لوگون سے اس بنا پر جھگڑا کرنے کی ضرورت نہین ہے شراب اور نغمہ مین پہلے یہ خاصیت ہو گی جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہین اگرچہ آج نہین ہے -

دل مین آجاے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے | اور پھر کونسے نالہ کو رسا کہتے ہین

یہ شعر نہایت ہی اچھا کہا ہے جس مین اپنی محرومی کا نقشہ کھینچ دیا ہے گویا کہ شاعر نے نالۂ رسا کا نام سنا ہے مگر اس کو کبھی دیکھا نہین ہے یعنی اس کے نالہ کو کبھی

آخر تک رسائی نصیب نہیں ہوئی ہے اسی بنا پر وہ ایک سوال مقدر کا جواب دیتا ہے کہ نالہ رسا
اور کیا ہوتا ہے یہی ہے کہ غش سے فرصت ملی تو نالہ دل میں موجود ہو گیا اس صورت میں
گویا وہ یہ جانتا ہی نہیں ہے کہ نالۂ نارسا اس کو کہتے ہیں جس کی پہونچ آخر تک نہ ہو۔

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود　　قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہم قبلہ کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ قبلہ کو محض قبلہ نما سمجھتے ہیں کہ وہ ایک جہت معین ہے ہمارا مسجود وہ ہے جو ادراک کی حد سے باہر ہے اور جہات وغیرہ سے منزہ اور مبرا ہے۔ ع

بسوئے کعبہ سجدہ ہے مگر مسجود تو ہی ہے

پاے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے　　خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

مہر گیا ایک بوٹی ہے جس کا خواص یہ ہے کہ جو اس کو اپنے پاس رکھتا ہے اس پر لوگ مہربان ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر مصنف کہتا ہے کہ تجکو ہمارے زخمی پاؤں پر جو ہمیں کانٹے چبھے ہوئے ہیں جب سے رحم آیا ہے تو راہ کے کانٹوں کو ہم کانٹا نہیں سمجھتے بلکہ مہر گیا کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے تجکو ہمپر رحم آیا۔

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائیگا کیا　　آگ مطلوب ہے ہمکو جو ہوا کہتے ہیں

روح حیوانی دل میں اک شرارہ ہے اس سے ہم کیا گھبرائینگے حاصل یہ ہے کہ ہم دل کی آگ بھڑکانے کے لئے ہوا کھاتے ہیں یعنی ہمارا سانس لینا محض اشتعال حرارت غریزی کی غرض سے ہے اس مسئلہ کو مصنف نے کسی جگہ نظم کیا ہے۔

دوسرا پہلو اسمیں یہ بھی ہے کہ لوگ ہمکو طعنہ دیتے ہیں کہ دل کی آتش غم سے گھبرا کر ہمکو ہوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم گھبرا کر اسی کے مٹانے کے واسطے ہوا نہیں کھاتے ہیں بلکہ آگ کے بھڑکانے کے لئے ہوا کھاتے ہیں یعنی سانس لیتے ہیں اسی طرح مصنف ایک جگہ کہتا ہے ؎

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

پاس

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی سمجھنا مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

دیکھئے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ اسکی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہین

دیکھئے اب اُس کا غرور کس حد تک تجاوز کرتا ہے کیونکہ ہم کو عادت ہو گئی ہے کہ اسکی ہر بات سنکر ہم تعریف و توصیف کرتے ہین ؎

جو کچھ لیا وہ سب ستم دل نے کیا قصور سہتے کے ظلم تجھکو ستمگر بنا دیا

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہوین شاید مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہین

وحشت سے یا غلام علیخان وحشت یا جنون - اور شیفتہ سے یا نواب مصطفی خان شیفتہ یا تمام عاشق دونون مراد ہوتے ہین یعنی یا تو دونون صاحب میرا مرثیہ کہینگے یا وحشت دل جو میری کمال رفیق ہے میرا گریگی یا عشاق جو میرے ہم مشرب ہین میرا غم کرینگے - وحشت صاحب حکیم مومن خان کے شاگرد تھے اور نواب مصطفی خان صاحب فارسی مین مرزا سے اور اردو مین حکیم مومن سے تلمذ رکھتے تھے مرزا غالب انکے کلام کے نہایت مداح تھے اور اکثر انکی قابلیت کا اعتراف کرتے تھے شیفتہ مرحوم فارسی مین حسرتی تخلص کرتے تھے چنانچہ مرزا صاحب فرماتے ہین ؎

غالب زحسرتی چہ سرائیم کہ در غزل چون او تلاش معنی و مضمون نکردہ است

ایک جگہ یون کہتے ہین ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بدین ارزش کہ او ننوشت در دیوان غزل تا مصطفی خان خوش نکرد

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن مین نہین ہے گریبان ننگ پیراہن جو دامن مین نہین

اس گل کی کیا آبرو ہے جو گلشن مین نہو وہ گریبان ننگ پیراہن ہے جو دامن مین نہو ظاہر ہے کہ گریبان دامن مین جبھی پہنچیگا جب چاک ہو جائے گا - اور چاک ہوا تو [illegible] گل سے مشابہت پیدا ہو جائے گی -

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن مین نہین رنگ ہو کر اڑ گیا جو خون کہ دامن مین نہین

اے گریہ ضعف سے کچھ میرے بدن میں باقی نہیں رہا۔ جو خون آنکھوں کی راہ سے نہیں نکلا ہے وہ رنگ ہو کر اڑ گیا ہے ضعف میں رنگ کا اڑ جانا ایک ایسی بات ہے جو محتاج بیان نہیں ہے۔

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب ذرّے اُسکے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

جن ذروں کو اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں دیکھتے ہو یہ دراصل ذرّے نہیں ہیں بلکہ نگاہ آفتاب کے اجزائے پریشان ہیں جو یہاں آ کر جمع ہو گئے ہیں یعنی آفتاب بھی اس کو روزن دیوار سے تاکا جھانکتا ہے ایسا ہی شعر گذر چکا ہے ذرہ ذرہ ساغر میخانہ نیرنگ ہے گردش مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

عشق خانۂ ویران ساز سے دنیا کی رونق ہے اگر یہ برق خرمن ہستی میں نہ چمکے تو وہ انجمن بے شمع سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

زخم میں ٹانکے دلوانے سے بے شک یہ طعنہ ملتا ہے کہ میں اپنے علاج میں مصروف ہوں لیکن غیر کو یہ خبر نہیں کہ میرے ایذا پسند دل کو جو زخم میں ٹانکے دیئے جانے کے وقت ہوتے ہیں ایک لذت آتی ہے یہ شعر اور اسکا ہم مضمون شعر ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

کیا کہوں تاریکی زندان غم اندھیر ہے پنبہ نور صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں

مجھ سے میرے زندان غم کا حال کیا پوچھتا ہے یہاں عجب ظلمت ہے جس کی دیواروں کے اندر اگر روشنی جائے تو صبح کی طرح اُس سے روشنی ہے حالانکہ مصنف نے کسی جگہ کو صبح سے کم کہا ہے کہ لوگ جگہ کو طعنہ دے بند کر دینے اور اندھیرا کرنے کا سامان اندھیرا ہو گا وہاں ایسی معمولی چیز ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس جگہ بہت ہی زبردستی ہو گی۔ ایک جگہ اور بھی فرماتے ہیں۔ بیان اس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستان کی شب مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

زنت دود دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانہ میں　　شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ اس کاشانہ میں

بسکہ ہم ہیں اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے　　جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

چونکہ ہم کو ایک بہارِ ناز نے قتل کیا ہے۔ اسی وجہ سے اور اسی اثر سے ہماری قبر میں گرد کا نام نہیں ہے۔ بس ہر طرف گل ہی گل ہیں۔ اس میں دو پہلو نکلتے ہیں ایک یہ کہ اسکا تصور ہم کو اب تک باقی ہے یا اب تک ہمارے جگر میں داغ موجود ہیں جو گل سے مشابہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم شہید ہوئے تھے اور اس کے ثواب میں ہماری قبر میں جنت موجود ہے پہلے معنی زیادہ چسپاں ہیں۔

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا　　خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

میرے جسم میں ہر ایک قطرۂ خون ایک نئے ناسور کا مادہ ہے یعنی جہاں جہاں کوئی قطرہ خون گرے گا وہ وہاں ناسور ڈالدیگا۔ اور نکلجائے گا۔ کیونکہ میرا خون بھی درد کا جویا ہے۔ اور ذوقِ درد اس میں بھی موجود ہے یہ ایسا ہی شعر ہے جیسا مصنف نے ایک جگہ کہا ہے ؎

دکھاؤنگا تماشہ دی اگر فرصت زمانہ نے　　مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

لیگئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری　　موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

رگِ گردن اکثر غرور کے محل پر استعمال کرتے ہیں جیسے کہ خود مرزا صاحب مرحوم ایک جگہ کہتے ہیں ؎

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے　　غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

اسی بنا پر شعر کے یہ معنی ٹھہرتے ہیں کہ ساقی کے پاس جو مینائے مے تھا اسکی موجِ شراب سے اس میں رگِ گردن پیدا ہو گئی تھی یعنی شیشہ اپنے پُر ہونے پر مغرور تھا اور ساقی اترایا ہوا تھا کہ اتنی شراب کون پی سکتا ہے مگر میں ایک قلزم آشام میرے سامنے ایک شیشہ شراب کی کیا ہستی تھی سب چٹ کر گیا اب نہ ساقی کی وہ نخوت نہ شیشہ کو وہ غرور ہے۔

ہو فشار ضعف مین کیا ناتوانی کی نمود — قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن مین نہین

ضعف مجکو چارون طرف سے دبائے ہوئے ہے اور جھکنے بیٹھنے کی اجازت نہین دیتا پھر ایسی حالت مین میرا قد کیونکر جھکے اور میری ناتوانی کا اظہار کیونکر ہو۔

تھی وطن مین شان کیا غالب کہ غربت مین ہو قدر — بے تکلف ہون وہ مشت خس کہ گلخن مین نہین

غالب میری وطن ہی مین کیا شان تھی کہ غربت مین کچھ قدر ہو مین ایک مشت خاشاک ہون جو بہار مین نہین جکا ہون میرے لئے اگر آرام ہے تو گلخن ہی مین ہے کیونکہ جب تک وطن مین تھا خار زار اور خس و خاشاک مین ملا ہوا تھا اور وطن سے جدا ہوا تو خاک روبون نے جھاڑ دیکر شہر بدر کر دیا غرض وہان آرام تھا نہ یہان آرام ہے میرے لیے گلخن ہی مناسب ہے اس سے پہلے ایک جگہ فرما چکے ہین ؎

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا — فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اس شعر مین تصوفانہ رنگ کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے یعنی فنا ہو جانا بھی عین بقا ہے۔

عہدہ سے مدح ناز کے باہر نہ آ سکا — گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہون

مین اُسکے ناز کی تعریف نہین کر سکتا اگر سمین ایک ادا ہو تو یہ کہکر فراغت پا جاونگا کہ اسی پر میری جان جاتی ہے مگر یہان تو ہزارون ادائین ہین گویا ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

حلقہ ہین چشم ہائے کشادہ بسوئے دل — ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہون

تیرے گھونگھر والے بالون مین جو حلقہ پڑے ہوئے ہین وہ گویا آنکھون کے حلقہ ہین جو میرا دل پھنسنے کے لیے تیار ہین اور اس کو دیکھ رہے ہین لہذا مناسب ہے کہ تیرے ہر تار زلف کو نگاہ سرمہ سا کا خطاب دون اور ہر ایک تار زلف کو اش

چشم عاشق کی نگاہ کہوں ۔ نگاہ اور چشم میں بڑا فرق ہے اور تمثیل بھی دونوں نہایت ہی خوب ہیں تعریف نہیں ہو سکتی ۔

ہیں اور بھی دنیا میں نواہائے جاں خراش　　تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ذوقؔ مرحوم نے گویا اس کی شرح میں یہ شعر لکھا ہے ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں　　واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

لفظ کیا کہوں کی تعریف نہیں ہو سکتی جس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ مجبوراً جب تو نہیں سنتا تو تجھے خاموش ہونا پڑتا ہے ۔ اور یوں کیا کہوں ایک عام محاورہ ہے ۔ نہیں نشنیدن ایک ایسا لفظ ہے جیسے نا سمجھ اردو سے فارسی غلط ملط کا غالب پر الزام لگائے گا مگر پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اگر مصنف اسی لفظ کو اردو میں کہتا ؏

تو اور ایک تیرا نہ سننا کہ کیا کہوں

تو شعر فلک الافلاک سے تحت الثریٰ میں پہونچ جاتا بلکہ صرف تفنن عبارت کے لئے اکثر جگہ ایسا کرنا پڑتا ہے ۔ لے لیجئے مجھے یاد آیا نقاد کلام اسد اللہ خاں غالب جناب مرزا یاس آتش پرست نے اس شعر پر اعتراض بھی کیا ہے جو درج ذیل ہے ۔

"سبحان اللہ سبحان اللہ نشنیدن کہ کیا کہوں کی ایک ہی کہی" اردو کی پھوٹی ہوئی قسمت جہاں تک ناز کرے کم ہے جس کا جواب رسالہ خیال میں اس صورت سے دیا گیا ہے "اعتراض ایک فارسی لفظ کے متعلق ہے اور محض بیہودہ سے شعر پر نزاقی کا نمونہ بن گیا ہے ۔ سبحان اللہ سبحان یاس کی اس بیہودہ علمی دنیا اور خیالی خیالی کی پھوٹی ہوئی قسمت جہاں تک ناز کرے کم ہے لطف یہ ہے کہ یہ بیچارہ خود دوسرے پہلے شعر میں لفظ نشنیدن کو ایک انوکھی ترکیب کے ساتھ استعمال کر گئے ہیں اور فرماتے ہیں ۔ ؎ یاس

آنکھ کا مارا مرے نزدیک آزاری نہیں　　جو سچ پوچھو تو اچھی کوئی بیماری نہیں

خدا جانے یہ آزاری کہاں کا لفظ ہے اور نشنیدن پر اس کو کیا فوقیت حاصل ہے ۔ اور رسالہ خیال فروری ۱۹۲۶ء میں مولینا علی حیدر صاحب نظم اس شعر کی بابت یوں فرماتے ہیں ۔ اس شعر سے یہ دہوکا نہ کھانا چاہئے کہ غالب سا شخص اس طرح اردو اور فارسی کا خلط ملط کرتے جیسے ایک بندی سا بندہ ہی اور گنوار سا گنوار بھی صحیح نہیں سمجھتا مقام طنز میں

تفنن الفاظ اچھا معلوم ہوتا ہے یہ سمجھ کر مصنف نے یہان شنیدن کہا ہے لیکن تاویل مستبعد ہے اسمین شک نہین لیکن مین کہتا ہون کہ اگر کوئی تاویل نہ کیجائے تب بھی یہ صحیح ہے غالب سے پہلے اور غالب کے زمانہ تک بے تکلف مصادر فارسی کا استعمال بجائے اردو کے کرتے تھے میر کہتے ہین ؎

دل کے طپیدن روز و شب سے خوب جگر کا لوہو ہوا آنسو کی بوند آنکھون سے دونون اتنو نکلتی یکسان نہین

اسکے سواے مردن - رفتن - وغیرہ ابتک اردو مین بلا تکلف مستعمل ہین لہذا ایسے الفاظ اعتراض نادانی سے خالی نہین -

ظالم مرے گمان سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے خدا نکردہ تجھے بیوفا کہون

کہتا ہے کہ میرا گمان اور میری عقل مجھے تیرے بارے مین راے دیتی ہے کہ تو بیوفا ہے لیکن مین برابر تجھے باوفا کہے جاتا ہون اور انکی ایک نہین سنتا خدا کے لیے تو اسقدر بیوفائی پر کمر نہ باندھ کہ مجھے اپنے خیال سے شرمندہ ہونا پڑے اور خدانخواستہ مجھے وہ دن دیکھنا پڑے کہ مین بھی تجھے بیوفا کہون "ہے ہے خدا نکردہ سے" یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ دن دیکھنا مصنف کو پسند نہین -

مہربان ہوکے بلا لو مجھے چاہو جسوقت مین گیا وقت نہین ہون کہ پھر آ بھی نہ سکون

اس غزل کے تینون شعر ایک ہی رنگ مین کہے گئے ہین اور اسمین ایک صنعت رکھی گئی ہے کہ قافیہ دو معنون پر مشترک ہے اور اسیوجہ سے یہ شعر نہایت بدیہہ ہے - مجھے مہربان ہوکے جسوقت چاہو بلا لو مین گیا وقت نہین ہون کہ جا کر پھر نہ آسکون -

ضعف مین طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہین ہے کہ اٹھا بھی نہ سکون

یعنی حالت ضعف مین غیر مجھے طرح طرح کے طعنے دیتے ہین مگر مین اٹھاتا ہون بات کا اٹھانا میرے لئے ایسا دشوار نہین ہے جیسے سر کا اٹھانا - یعنی اس وقت سب گوارا ہے -

زہر ملتا ہی نہین مجھکو ستمگر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکون

افسوس ہے کہ مجکو کہین زہر نہین ملتا ورنہ جیسے تیرے ملنے کی قسم کھانا میرے لئے غیر ممکن ہے اسی صورت سے زہر کھانا مشکل نہین ہے حکیم مومن خان کے یہان اس صورت کے بہت اشعار پائے جاتے ہین جیسے ایک جگہ فرماتے ہین ؎

دل آگ ہے اور لگائین گے ہم — کیا جانئے کیسے جلائین گے ہم
ایسی وحشت نہین دلکو کہ سنبھل جاؤنگا — صورت پیرہن تنگ نکل جاؤنگا

اسی زمین مین اسی صنعت مین ذوق مرحوم فرماتے ہین۔

سرد مہرون سے فلک ڈال نہ پالا کہ بن آگ — نخل سرمازدہ کی طرح سے جل جاؤنگا
دیکھنا حشر مین جب تم پہ مچل جاؤنگا — داغ — مین بھی کیا آپکا وعدہ ہون کہ ٹل جاؤنگا
شمع سان بر سر محفل نہ جلا دیکھ مجھے — بیان — پھیل جاؤنگا ستمگر کہ جو جل جاؤنگا

مرزا غالب کے آخری شعر کے مصرع ثانی مین تین کاف ایک جگہ جمع ہونے سے تنافر پیدا ہو گیا ہے۔

ہم سے کھلجاؤ بوقت مے پرستی ایکدن — ورنہ ہم چھیڑینگے رکھکر عذر مستی ایکدن

مضمون رکیک سہی مگر اس سے مرزا کی شوخ طبعی کا پتہ چلتا ہے۔ تغزل کا گہرا رنگ اس مین بھرا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے ہم سے شراب پیتے وقت کسی روز بے تکلف ہو جائیے ورنہ ایک نہ ایک دن ہم آپ کو چھیڑین گے اور اگر آپ شکایت کرینگے تو ہمارے پاس معقول عذر مستی کا جواب موجود ہوگا۔

غرۂ اوج بنائے عالم امکان نہو — اس بلندی کے نصیبون مین ہے پستی ایکدن

یعنی دنیوی بلند عمارات کی بنا پر مغرور نہو ایکدن اس عروج کو زوال ضرور ہوگا۔ ایکدن سے مراد روز قیامت بھی ہو سکتا ہے اور انقلاب زمانہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔

قرض کی پیتے تھے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ ہان — رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن

مولانا آزاد نے آب حیات مین لکھا ہے ایکدفعہ مرزا بہت قرضدار ہو گئے

قرضخواہوں نے نالش کردی جوابدہی میں طلب ہوئے مفتی صدرالدین آزردہ کی عدالت تھی جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا۔ دوسرے تذکرے میں مین نے یہ دیکھا ہے کہ مفتی صاحب نے ازراہ قدردانی سارا قرضہ ادا کردیا۔ اس شعر کی بنا پر یہ تمام شعر کہے گئے تھے ایک جگہ میر تقی صاحب میر فرماتے ہیں ؎

مے کشی صبح و شام کرتا ہوں فاقہ مستی مدام کرتا ہوں

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایکدن

اے دل اگر نغمہ ہائے شادی نہیں ہیں تو نغمہ ہائے غم ہی کو غنیمت سمجھ کیونکہ ایکدن ایسا آئیگا کہ یہ ساز ہستی بیکار ہو جائیگا کہ اس سے نہ نوحہ غم کی صدا نکلیگی نہ شادی کی۔ مجھے اپنا ایک شعر یاد آیا ؎

کشتی غم کی روانی بھی ہے اے دل مغتنم یہ بھی اکدن نذر گرداب فنا ہو جائیگی

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

یعنی وہ ظلم وستم اور ہاتھا پائی کا عادی نہیں ہے غالب یہ سب ہماری ہی خطا ہے کہ ہم نے ایکدن دراز دستی کی تھی جس کی اُسنے ہم کو سزا دی۔ میرزا رفیع السودا فرماتے ہیں ؎

سودا کسیکو وہ تو ستائے نہ بے سبب کیا جانیے کہ تجھسے یہ کیا بات ہو گئی

لفظ میں تجا سے مجھ سے ہی کے تجھی سے بولتے ہیں اور دلی میں دونوں صورتیں مروج ہیں اس صورت سے دوسرے الفاظ اسی قسم کے قیاس کر لیجیے۔

ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

وہ ہمپر جو جفائیں کرتے ہیں یہ امتحان وفا کے لئے نہیں ہیں یعنی انھیں یہ خیال نہیں ہے کہ دیکھیں یہ جفا کرنے پر وفا کو ترک تو نہ کرے گا نہیں یہ تو ہماری طرف سے انہیں گمان بھی نہیں کیونکہ ع

سمجھ رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کب نکلتا ہے

بلکہ یہ محض ایک چھیڑ ہے۔ بقول مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق مدظلہ ؎

مذاق ہے یہ جفا کچھ جفا نہیں ہمدم
یونہی وہ دیکھ رہے ہیں ذرا ستا کے مجھے

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیان نہیں

غالباً یہ شعر حمد میں کہا گیا ہے کہ میں خدائے پاک کی حمد کس زبان سے ادا کروں کہ موقع ہے۔ میری خبر لیتا ہے اور ہمیشہ امداد کرتا ہے۔ اور پھر مجھ سے نہ گفتگو ہے نہ بول چال ہے۔ اگر تاویل کیجئے تو تغزل کے رنگ سے بھی باہر نہیں ہے کہ وہ اغیار سے میری حالت معلوم کرتا رہتا ہے مگر مجھ سے کبھی بات نہیں کرتا ہے گویا یہ انداز خاص میرے لئے ہے۔ اسی مضمون کے کئی شعر مصنف کے فارسی دیوان میں پائے جاتے ہیں اور اردو میں بھی کئی شعر ہیں جن میں سے ایک شعر مجھے اس وقت یاد ہے ؎

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محو پرسشہائے پنہانی مجھے

یعنی وہ مجھ سے بے التفاتی کیوں نہ کرے وہ اس سے مطمئن ہے کہ ہم یوں جو کسی کسی سے اس کا حال پوچھ لیا کرتے ہیں وہ اسی میں خوش اور محو ہے۔

ہمکو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ہمکو اس کا ستم عزیز ہے اور تختہ مشق جفا بنانے کے لئے وہ ہمکو عزیز رکھتا ہے بہرحال اس نامہربانی سے اس کی مہربانی کا ایک پہلو نکلتا ہے۔

یا یوں کہئے کہ وہ ہمکو پیارا ہے کہ ہمپر ظلم کرتا ہے اور ہم اس کو پیارے ہیں کہ ہم ستم سہتے ہیں اس کا ہم سے کام نکلتا ہے اور ہمارا اس سے۔ تو اگر وہ مہرباں نہیں ہے تو نامہرباں بھی نہیں ہے تیسرے یہ کہ ہم اس کے ظلم کو عزیز رکھتے ہیں اور وہ ہمپر ظلم کرتا ہے اس سے اس کی مہربانی کا پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ ہمپر مہربان نہوتا تو وہ چیز جو کہ مرغوب ہے ہمپر کیوں صرف کرتا۔ یہ انداز بیان مومن کے یہاں زیادہ پایا جاتا ہے چنانچہ اسی زمین میں اُن کی بھی غزل ہے جس کا یہ شعر ہے ؎

باتیں تری وہ ہوشربا ہیں کہ کیا کہوں
جو کوئی رازداں کہ مرا رازداں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہم آپ سے بوسۂ دہن کا سوال کر رہے ہین اگر آپ بوسہ نہین دیتے تو نہ دیجئے گالیان تو دیجئے کیونکہ خیر اس مین تو آپ کو یہ معقول عذر ہاتھ آگیا ہے کہ دہن نہین ہے مگر زبان تو ہے اُس سے آپ گالیان تو دے سکتے ہین ؎ مولینا ناطق مدظلہٗ

نہ دے بوسہ تو اچھا گالیان دیکر دعا لے لے   غرض لے دے کے رخصت کر دے جو تجھکو میسر ہو

شعرائے ماضی نے زیادہ اور حال کے خوش گویون نے کم دہن و کمر معشوق کے چھوٹی اور پتلی مین اتنا مبالغہ کیا ہے کہ بالکل غائب ہی کر دیا۔ آجکل یہ باتین واجب الترک ہین اسلئے کہ آپ ہی خیال فرمائیے کہ جس کے منہ نہین ہے کمر نہین ہے آخر وہ آدمی کیونکر ہے اور اگر فرضی آدمی بھی مان لیجئے تو غالبًا کسی شریف طبیعت آدمی کا تو یہ جی ہرگز نہ چاہیگا کہ اُسے اپنا معشوق بنائے۔ بقول ناسخ ؎

بھلا پھر کونسا انداز بتون کا ناسخ   نہ کمر رکھتے ہین کافر نہ دہان رکھتے ہین

اسی سے اردو فارسی شاعری بدنام ہوگئی ہے۔ طوالت تو ضرور ہے مگر مین اس جگہ ایک نظم مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق کی نقل کرتا ہون۔ حق یہ ہے کہ بہت خوب لکھی ہے۔

تشبیہات حسن

الفت کی جستجو ہو دل دردمند کو   سوجھی ہو اک نئی مرے جدت پسند کو
بیتاب ہے بتون کی زیارت کیواسطے   ہے حسن کی تلاش محبت کے واسطے
کیون اسکو اضطراب مین تسکین نہ دیجئے   جو بات ہاتھ کی ہو اُسے کیون نہ کیجئے
خود سر ہین بت کبھی نہ نگہ اُنپہ ڈالئے   قابو کی اپنے جو ہو وہ صورت نکالئے
دنیا کی اچھی اچھی جو چیزین ہین لائیے   معشوق اپنا ہاتھ سے اپنے بنائیے
چند افعیون سے کاکل و گیسو بنائیے   کچھ کالے کالے سانپ پکڑ کر لگائیے
پیشانی نصف چاند کو لاکر بنائیے   اور یہ نہو تو لوح زمرد منگائیے
محراب کی غرض سے نہ کعبہ کو جائیے   ابرو کی چاہ ہو تو کمانین لگائیے
آنکھین اگر لگائیے مژگان بنائیے   نرگس کے پھول لائیے کانٹے لگائیے
دیوار کا تو کام نہین ناک کے لئے   طوطی سے اسکی چونچ ذرا مانگ لیجئے
کانون کو دو گلاب کے پھولون کا کام ہے   اُس چیز کا دہن ہو کلی جس کا نام ہے

عناب سا کہ لبوں کے لئے کیوں خیال ہو ہونٹ تو جب کہ لعل بدخشاں کا کال ہو

دانتوں کی آرزو ہو تو موتی منگائیے اک سیپ لا کے اس کو رکھو اور ان میں سجائیے

دو سیپ جھک گئے سے مطلب نکل گیا گردن کا کام آب صراحی سے چل گیا

ہو دست و پا کی فکر تو بلور دیکھئے پنجوں کا کام پنجۂ مرجاں سے لیجئے

چاقو سے ایک سیب کے دو ٹکڑے کیجئے جو عضو بن گئے وہ بنا اس سے لیجئے

ذب سب اس میں جو کاٹ کے ٹکڑا ایک رہ گیا چاندی کی ایک لوح سے ناف ان پہ جڑ لگا

من مانی آپ کی اب نے بنائی ہر ایک چیز اچھی سے اچھی لا کے دنیا کی ہر ایک چیز

اب دیکھئے جو ان میں تو بت بن گیا بنا نکھرے ہوئے تھے ہم اس سے کیا اور کیا بنا

کیا اس کو کہیں گے کہ حالت بھی کوئی ہو یہ شکل بھی تو عجب ہو کہ صورت بھی کوئی ہے

جلدی سے تو دو دیکھو کوئی دیکھ پائے گا سچ کہہ دو ہم ان سے ہی احمق بنائے گا

انسان کے سوال سے کبھی وہ ہو گا نہ کیا ہے

اپنا نظیر آپ ہی اس کو بنائیے

واقعی یہ ہے کہ آپ تھوڑی دیر تصور کیجئے اور ایسی بے سر و پا صورت اپنی خیالی نظر کے سامنے کھڑی کیجئے اگر آپ کو ڈر نہ معلوم ہو تو میرا ذمہ —

ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں

جاں مطرب ترانۂ ہل من مزید ہے لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

اگرچہ اس کا قہر و عتاب جان کو گھلا رہا ہے اگرچہ تاب و طاقت نے بھی جواب دے دیا مگر پھر بھی عاشق زار کی جان خوشی سے ابھی ہل من مزید کا ترانہ گا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ مجھ پر ظلم و ستم اور زیادہ کر لب پر اب تک الاماں کا لفظ نہیں آیا ہے — اور نہ وہ اس کا ہونٹ شکست نہیں سہے کہ ظلم و ستم چلا جائے —

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

اگرچہ میرا گھر اجڑتا اور خراب ہوتا ہے۔ مگر دراصل میرے جنون سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہونچتا ہے گھر میں بہت ہو گی تو سو گز زمین ہو گی اب جنون اسے ہم سے چھڑاتا ہے اور ایک جنگل اس کے بدلے میں ہم کو دیتا ہے تو یہ کیا کچھ کم ہے۔ ایک شعر عارف مرحوم کا مجھے اسی زمین میں یاد ہے جو اسی قسم کا ہے اگرچہ مضمون یہ نہیں ہے۔ مگر خیال کی بنا ایک ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

میری تقدیر کا حال مجھ سے ایسے پوچھتے ہو جیسے کہ سجدۂ بت کا نشان میرے ماتھے پر نہیں ہے۔ بس اسی سے قیاس کر لو۔ گویا میری تقدیر میں بت پرستی ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

اگرچہ روح القدس بھی میری طرح فصیح نہیں ہیں (نعوذ باللہ) لیکن پھر بھی اپنے کلام کی داد مجھے اُن سے ملجاتی ہے۔

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی — غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

اُس کے ایک بوسہ کی قیمت جان ہے مگر وہ ابھی مجھ سے یہ نہیں کہتا کہ اگر اپنی جان دیدو تو ایک بوسہ لو کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ابھی غالب نیم جان نہیں ہے جب میں نیم جان ہو جاؤنگا تب وہ مجھ سے یہ کہیگا کہ جان دو اور بوسہ لو میں جان دینے پر تیار ہو جاؤنگا تو اُس وقت یہ کہے گا کہ نیم جان اُسکی قیمت نہیں ہے بلکہ پوری جان اُسکی قیمت ہے۔ اس مفہوم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جان سے مراد روح کا جسم میں ہونا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک روح جسم میں ہے آدمی میں جان ہے۔ وہ نصف اور ثلث باقی نہیں رہتی۔ ہوتی ہے تو پوری ہوتی ہے اور نہیں ہوتی تو بالکل نہیں ہوتی۔ مگر شاعر نے معشوق کی ستم ظریفی کا ایک نقشہ کھینچکر دکھایا ہے۔ اور شعر مرا بہ کتب کے گرد پر نظر ڈالئے تو ایک اچھا شعر ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جان بوسہ کی عوض مانگے گا مگر جب میں نیم جان ہو جاؤنگا تو مجھے

اس لذت کا کوئی لطف و احساس باقی نہ رہے گا۔

مولانا نظم نے بیجان کے معنی مردہ کے لئے ہیں اور یہ شرح لکھتے ہیں کہ ابھی وہ کیون کہنے لگا کہ جان دیکر بوسہ لیلو۔ ابھی تو مجھ مین جان باقی ہے جب مجھ مین جان نہ رہے گی اُس وقت کہیگا کہ جان دو تو بوسہ لو۔ مگر طبیعت کچھ قبول نہین کرتی کہ بیجان کو بیجان کے معنی مین استعمال کیا جائے۔

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہین
ایک چکر ہے مرے پاؤن مین زنجیر نہین

یعنی زنجیر ڈالنے سے بھی جوش جنون کم نہین ہوا اور صحرا نوردی نہ گئی بلکہ وہ بھی آگ پر تیل کا کام دیگئی۔ وہ اور بھی میرے پاؤن کا چکر ثابت ہوئی ایسا ہی ایک شعر پہلے لکھ چکے ہین جسے دوسرے الفاظ مین ادا کیا ہے۔

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زندان مین بھی خیال بیابان نورد تھا

شوق اس دشت مین دوڑائے ہے مجھکو کہ جہان
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہین

مجھے میرا شوق جنون اس جنگل مین دشت نوردی کے لئے لئے جاتا ہے جہان جادہ دیدۂ تصویر کی نگاہ ہے یعنی معدوم ہے۔
یا جیسے کہ دیدۂ تصویر حیرت مین ہے اسیطرح وہان اگر کوئی جادہ ہے تو جادۂ حیرت ہے اور کچھ نہین۔

رنج نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو
خوش ہون گر نالہ زبونی کش تاثیر نہین

رہیو دعائیہ ہے یعنی خدا کرے یہ یاس و ناامیدی مجھے ہمیشہ گوارا رہے مین اس سے بہت خوش ہون میرے نالے پر تاثیر کا تو احسان نہین ہوتا اور اس سے اس کو ندامت تو نہین ہے ایسے مضامین جس مین احسان کی مختلف صورتون مین برائی کی گئی ہے مصنف کے بیان مین دو شعر ہم پہلے لکھ چکے ہین۔ ایک میر شعر ہے ۔

بلائے جان ہے سایل کو منت تاثیر
جسے کوئی نہ سنے اُس صدا کا کیا کہنا

غالب کے شعر مین یہ (رہیو) بالکل دیا ہی ہے جیسے

مجھکو ارزانی رہے تجھکو مبارک ہو جیو

مین ہو جیو جس کی مولانا نظم نے مذمت فرمائی ہے اور گریہ بتایا ہے

حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے — جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہین

راہ وفا مین جادۂ دم شمشیر پر چلنا پڑتا ہے اور وہ بہت جلد فیصلہ کر دیتی ہے کاش کوئی رستہ ہوتا کہ حسرت آزار دل مین نہ رہ جاتی یا یہ کہ جادۂ دم شمشیر کے سوا ہے اور کسی جادہ کو طے کرنا نہین پڑتا۔ کاش کوئی اور بھی جادہ ہوتا جسے طے کرے۔

سر کھجاتا ہے جہان زخم سر اچھا ہو جا — لذت سنگ بہ اندازۂ تقریر نہین

جب میرا زخم سر اچھا ہو جاتا ہے تو سر کھجاتا ہے (سر کھجانا محاورہ ہے بیٹھے بٹھائے کسی آفت مین مبتلا ہونے کی خواہش پیدا ہونا) اور ایک عام معنی یہاں دونون بھی مراد لیے جا سکتے ہین یعنی خواہش زخم یا ایک طفلان پیدا ہوتی ہے کیا کہا جا سکے زخم کی لذت بیان نہین ہو سکتی جس کے اسا سے حیرت سے پوچھنا برا معلوم ہوتا ہے۔

جب کرم رخصت بیباکی و گستاخی دے — کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہین

جب کرم گناہ کرنے پر بیباک اور گستاخ کرے تو سوا ہے گناہ سے شرمندہ ہونے کے کوئی دوسرا گناہ گناہ نہین کیونکہ کرم خود ہی گناہون پر گستاخ و بیباک کرتا ہے میرا شعر ہے۔

خدا نخواستہ ہے فکر جرم اسرار نہ کرے — خدا کرے مگر ایسی کبھی خطا نہ کرے

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہین

غالب بقول ناسخ ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جو میر کو استاد نہین مانتا وہ خود کلام و سخن سے کچھ نہین آتا میر کے ماننے مین اکثر مشہور اردو کے اساتذہ متفق ہیں اکثر ناسخ سودا مصحفی نے میر کی استادی کو مانا ہے۔ ذوق مرحوم نے بھی انکو مانا ہے جیسے ایک جگہ کہتے ہین۔

نہوا پر نہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یوں تو خوش عقیدتی کے جوش میں جس کے جو جی میں آیا ہے وہ میر صاحب کی شان میں کہا گیا ہے مگر ذوق مرحوم نے اس شعر میں نہایت محققانہ راے قائم کی ہے۔ میر مرحوم صرف غزل کہنے کے استاد تھے قصیدہ ان کو کہنا نہیں آتا تھا۔ اس میں سودا اور ذوق استاد تھے۔ نظم صاحب نے میر و سودا کے کچھ اغلاط جمع کر کے اپنی شرح میں لکھے ہیں اور جہاں تک قیاس کیا جا سکتا ہے وہ غلط بھی نہیں ہیں سب اعتراض صحیح اور صحیح ہیں مگر میر کی شاعری اور ان کی غزلوں کا پایہ اعلیٰ ہونے کا یہ سبب نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں اغلاط بھی ہیں بندش بھی سست ہے محاوروں میں تصرفات نامقبول بھی ہیں یہ سب کچھ ہے مگر درد کا پہلو اُن کے اشعار کا عنصر غالب ہے اس کو وہ کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور جو کچھ کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں جس کا دل پر اثر پڑنا ضروری ہے جن لوگوں کے یہاں صرف قال ہے حال سے کچھ غرض نہیں رکھی گئی ہے اور جذبات کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کی جاتی۔ وہ لوگ تشبیہات و استعارات برتنے مضامین جدید صنائع و بدائع شعری۔ زبان وغیرہ کی طرف جھک جاتے ہیں۔ مگر بغیر دلی جذبات کے اگر آپ عرش سے تارے بھی توڑ لائیں گے تو اُن کو کچھ مقبولیت نہیں ہو سکتی ہے اور اس سے کوئی متاثر نہیں ہو سکتا۔

یہاں یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ لوگوں نے درد کے کچھ مضامین مقرر کر لیے ہیں موت۔ نزع کا عالم۔ گور غریباں کا منظر۔ اندھیری رات۔ ہو کا سناٹا۔ زندان۔ زندان میں مر جانا۔ زندان سے ہڈیاں نکلنا۔ وغیرہ وغیرہ اور یہ زیادہ تر لکھنؤ میں ہیں۔ ان مضامین میں اثر ضرور ہوتا ہے مگر وہ اس کثرت سے نظم ہونے لگے ہیں کہ موت ایک کھیل اور نزع کا عالم ایک تماشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

ہم کہتے ہیں کہ درد کسی خاص واقعہ میں نہیں ہوتا۔ بلکہ جو بات دکھے ہوئے دل سے نکلے گی اس کا درد آگیں اور موثر ہونا امر لابدی ہے۔ انھیں میر صاحب نے بعض ہزل کے مضامین اس درد سے کہے ہیں جن کا جواب غیر ممکن ہے۔ مثلاً

یوں پکاریں ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے — ادھر آ بے ابے او چاک گریباں والے
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

چلا نہ اُٹھ کے وہین پھر تو چپکے چپکے میر　　　ابھی تو اُس کی گلی سے پکار لایا تھا
تجھی سے ہین سلے میر یہ خواریان　　　نبھائی ہماری تو طاقت نہین ہے

موت تو کیا ان مین کہین رونے کا بھی ذکر نہین ہے مگر درد جیسا ہے شعرون سے ظاہر ہے درد کا کوئی مضمون مقرر کرنا فضول ہے بلکہ جو کچھ کہئے وہ درد سے کہئے۔

غرض میر کو سب نے درد کی بنا پر تغزل وغیرہ کا استاد مان لیا ہے۔ اور تغزل کا یہ رنگ اُن کے معاصرین مین کسی دوسرے کو نصیب نہین ہوا۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے یہان بھی حال ہے قال نہین مگر فرق صرف یہی ہے کہ میر نے ہر مضمون کو درد کے لہجہ مین ادا کیا ہے اور میر درد کے یہان یہ بات کوسون نہین ہے۔ اسپر بھی میر تقی میر کا کلیات ایک طومار درد اور خواجہ صاحب کے یہان چند غزلین۔

ہمت مردمک دیدہ مین سمجھو یہ نگاہین　　　ہین جمع سویدائے دل چشم مین آہین

میری آنکھ کی پتلی مین نگاہین نہین ہین بلکہ آنکھ کے دل مین (جو پتلی ہے) آہین جمع ہو گئی ہین۔ سویدا اُس نقطہ سیاہ کو کہتے ہین جو دل مین پڑ جاتا ہے۔

برشگال دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہئے　　　کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوار چمن

یہ گریہ عاشق کی برسات ہے دیکھا چاہئے دیوار چمن اب قائم رہتی ہے یا نہین سو جگہ سے گل صد برگ کی طرح شق ہو گئی ہے۔

الفت گل سے غلط ہے دعوی وارستگی　　　سرو ہے باوصف آزادی گرفتار چمن

الفت گل سے کوئی وارستہ نہین ہے یہ دعوی وارستگی بالکل غلط ہے سرو کو دیکھو کہ آزاد ہے لیکن یہ بھی محبت چمن مین گرفتار ہے۔ سرو کو چمن مین رہنے کی وجہ سے گرفتار چمن کہا ہے۔ آزاد اس لئے کہتے ہین کہ وہ موسم خزان و بہار مین یکسان رہتا ہے اور دونون سے آزاد ہے یہ مضمون بالکل عام ہے اور متقدمین کے یہان بہت پائے جاتے ہین۔

عشق تاثیر سے نومید نہین　　　جان سپاری شجر بید نہین

عشق میں جذب اور کشش ضرور ہے اور وہ تاثیر سے نا امید نہیں ہے جان دینا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور رکھتا ہے یہ بید کا درخت نہیں ہے جسمیں کوئی پھل نہیں آتا۔

سلطنت دست بدست آئی ہے — جام مے خاتم جمشید نہیں

جام مے گویا ایک سلطنت ہے جو جمشید کے وقت سے اب تک منتقل ہوتی رہی ہے یعنی اس سے منتقل ہو کر دست بدست ہمارے پاس آئی ہے۔ نہ کہ یون آتی یہ جام مے تھا کچھ نگین جمشید نہ تھا جس پر اسی کا نام کھدا ہوا تھا اور اسی کے لیے مخصوص تھا۔

دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ ایک رند قدح کش حلقہ رندان میں بیٹھ کر اپنے حریف سے کہتا ہے کہ ہاں ذرا جلد جام مجھے عنایت فرمایئے۔ جمشید کے وقت سے تو یہ سلطنت دست بدست چلی آئی ہے کچھ کسی کی میراث اور ملکیت نہیں ہے بقول شخصیکہ

حقہ یکدم و دو دم سہ دم باشد — نہ کہ میراث جد و عم باشد

ہے تجلی تری سامان وجود — ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

تیری تجلی سامان وجود ہے یعنی تو جوہر ہے اور ہستی عرض ہے بغیر خالق کے مخلوق کا ظہور میں آنا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے ذرہ کی جلوہ گری بغیر خورشید کے۔

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

لوگ سمجھتے ہوں گے کہ مر جانا دشوار ہے اور اس میں کچھ بھید ہے مگر نہ کچھ مشکل ہے نہ کوئی بھید ہے ہے تو صرف اتنا بھید ہے کہ معشوق بدنام ہو جائیگا اور راز عشق افشا ہو جائے گا۔

گردش رنگ طرب سے ڈر ہے — غم محرومی جاوید نہیں

مجھے محرومی جاوید کا غم نہیں ہے بلکہ ڈر اس کا ہے کہ زمانہ طرب کے زوال ہونا سخت جانکاہ ہے اتنا محرومی جاوید کا اندیشہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی غم تو نہ رہے گا۔

یا یہ کہ اب وہ شخص کہ جس کو زوال زمانۂ عیش کا ڈر لگا ہوا ہے اور یہ کھٹکا تجھے کھائے جاتا ہے تو اس سے نہیں ڈرتا اور ان لوگوں کا تجھے خیال نہیں آتا جو محروم جاوید ہیں جنہیں کبھی خوشی نصیب ہی نہیں ہوئی۔ یا یہ غم نہیں کہ ایک وہ زمانہ بھی آنے والا ہے جب تو ہمیشہ کے لئے عیش و عشرت سے محروم کر دیا جائے گا اور اس خیال زوال عیش تک سے بھی محروم ہو جائے گا۔ مراد ہے زمانہ اجل سے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

مثل مشہور ہے کہ دنیا امید پر قائم ہے اور آدمی اسی پر جیتا ہے مگر ہم اس سے مستثنیٰ ہیں ہم کو جینے کی بھی امید نہیں ہے یا یہ کہ ہماری امید ایسی ہے کہ وہ ہم کو مار ڈالے گی۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

تیرے نقش قدم میں وہ بہار ہے کہ ہم جہاں اسے دیکھتے ہیں تو گویا باغ ارم کی کیاریاں نظر پڑتی ہیں۔

دل آشفتگاں خال کنج دہن کے سویدا میں سیر عدم دیکھتے ہیں

جو تیرے دہن بے نشان کے خال پر مرتے ہیں وہ گویا عدم کو سویدا میں دیکھتے ہیں سیر عدم کا لطف آتا ہے۔ خال کو سویدائے دل بتاتا ہے اور دہن کو عدم فرض کیا ہے۔ [illegible] یہ خیال انتہائی تصنع کا نمونہ ہے اور یقیناً ایسی شاعری پر دلیر کوئی اثر ڈال سکتی ہے [illegible] لفظ فارسی ہے اسی لئے اس کی اضافت صحیح ہے۔

ترے سرو قامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

[illegible] قامت سے فتنۂ قیامت کم ہے۔ یوں تو قیامت سے قامت کو شعرا نے تشبیہ دی ہے مگر [illegible] ایک قد آدم کے لفظ سے شعر میں جو لطف اور زور پیدا ہو گیا ہے وہ محتاج بیان و تشریح نہیں ہے۔

میر ممنون سے

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا مومن　　وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری　　تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اے محوِ آئینہ داری دیکھ کہ تجھکو ہم کس تمنا سے دیکھ رہے ہیں۔ اس شعر کے صاف معنی تو یہی ہیں جو لکھے گئے مگر ایک نہایت لطیف پہلو بھی اس سے نکلتا ہے جو یہ ہے کہ اے محوِ آئینہ داری آئینہ کو چھوڑ ہم کو دیکھ کہ تیری اس حالتِ آئینہ داری کے دیکھنے سے ہم آئینہ سے بھی کچھ زیادہ بن گئے ہیں چونکہ تجھکو آئینہ داری کا شوق ہے لہٰذا تو ہم کو دیکھ یعنی یہ کہ تو ہم کو بجنسہ حیران یا آئینہ سمجھ کر دیکھ رہا ہے مگر اس حیرانی سے دیکھنے اور آئینہ داری کے علاوہ یہ بھی خیال کر کہ ہم تجھکو کس حسرت اور تمنا کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ ہماری یہ کیفیت ہو گئی ہے۔

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے　　کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اگر تجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ میرے نالے کس قدر گرم ہیں تو میرے داغ کو دیکھ اور اس کی تپش اور حدت سے نالہ کی گرمی کا اندازہ معلوم کر کیونکہ چور کا نقشِ قدم اس کا پتہ دیتا ہے چونکہ میرا نالہ بھی شب گیر ہے اس واسطے اس کے نقشِ قدم یعنی داغِ دل سے اس کا سراغ لگا نالہ شب گیر کی تشبیہ ہے ایک بدیع تشبیہ ہے اور اس میں لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں موجود ہیں۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ہم فقیروں کا بھیس بدل کر اہلِ کرم کے اندازِ کرم کا تماشا دیکھتے ہیں سے مرزا کی شعر سے [illegible] لطف آ گیا ہے۔

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی　　سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں　　کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

چونکہ میرے معشوق کی عادت بھی بھڑک جانے اور برافروختہ ہونے کی ہے اور آگ مین بھی یہی صفات ہین اس واسطے آگ کے عذاب مین مجھے راحت ملتی ہو آتش

آسمان شوق سے تلوار کا مینہ برسائے ۔ ماہ نو نے کیا ابرو کا ترے خم پیدا

کب ہون کیا بتاؤن جہان خراب مین ۔ شبہائے ہجر کو بھی رکھون گر حساب مین

اگر مین اپنی زندگی کا حساب کرون اور عمر کو دیکھون اور ساتھ ہی جدائی کی راتون کو بھی جوڑتا جاؤن تو مین اپنی عمر کا حساب نہین کر سکتا کیونکہ جدائی کی ایک ایک رات ہزار ہزار برس کے برابر گذری خسرو علیہ الرحمۃ اس مضمون کو یون ادا فرماتے ہین ؎

زہے عمر دراز عاشقان گر ۔ شب ہجران حساب عمر گیرند

ایک شاعر اسی مضمون کو یون ادا کرتا ہے ؎

کیا کیا درازئ شب غم جان نواز ہے ۔ عاشق کی عمر خضر سے بھی کچھ دراز ہے

تا پھر نہ انتظار مین نیند آئے عمر بھر ۔ آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب مین

تاکہ پھر انتظار مین مجھے عمر بھر نیند ہی نہ آئے اور خواب مین بھی دیدار سے سیراب ہونے کا موقع نہ حاصل ہو۔ انھون نے یہ شوخی کی ہے کہ خواب مین مجھ سے تشریف آوری کا وعدہ کر گئے ہین خوب شعر کہا ہے۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھون ۔ مین جانتا ہون جو وہ لکھینگے جواب مین

جب تک کہ قاصد واپس آئے اُس وقت تک مین ایک خط اور لکھ رکھون کیونکہ وہ جو کچھ لکھینگے وہ مجھے معلوم ہے ۔ دوسرا مصرع نہایت بلیغ واقع ہوا ہے ۔ اور مجھ (جو وہ لکھین گے جواب مین) نے بہت سے معانی بھر دیئے ہین جس سے اتنے پہلو نکلتے ہین کہ وہی انکار وصل جو اُن کی عادت ہے اس مرتبہ بھی لکھین گے یا وہ مجھے صاف جواب دینگے کہ آیندہ سے ہمکو خط نہ لکھنا یا وہ مجھے سرے سے جواب ہی نہ لکھین گے پہلے مصرع سے دوسرے مصرع کو بہت ربط ہے۔

اسی مضمون کو میر حسن فرماتے ہین مگر انھون نے ایسے الفاظ رکھے ہین جنسے

معانی محدود ہو گئے ہیں ؎

گرچہ دل کو ہے یقین خط تو نہیں لکھنے کے وہ
پر تقاضۂ شوق کا لکھنے سے کب رہتا ہے باز

مرزا بیدل عظیم آبادی ؎

آنجا جواب نامۂ عاشق تغافل است
بیہودہ انتظار خبر می کشیم ما

شعر میں ایسے الفاظ لانا جنسے بہت سے معانی نکلیں کچھ آسان کام نہیں ہے ہمارے نزدیک سب سے زیادہ دشوار یہی کام ہے مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اگر غیر مانوس الفاظ لکھے جائیں گے تو وہ بجائے اس کے کہ شعر کو بلند کریں اور بھی پست کر دیں اس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہئے۔ جہاں تک الفاظ عام فہم ہوں وہ صرف کرے ورنہ ضرورت نہیں ہے۔ دیکھئے خاقانی ایک جگہ کہتا ہے ؎

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت
خاقانی را دگر شب آمد

اس میں اتنے پہلو نکلتے ہیں کہ جب میرے ہمسایہ نے آہ و نالہ سنا تو کہا اوہ خاقانی کو پھر رات آگئی اب پھر رات بھر شور کرے گا اور ہماری نیند اڑا دے گا یا تعجب سے کہتا ہے کہ پرسوں کل اس کی ایسی بری حالت ہوئی تھی کیا یہ بچ گیا کہ آج اس کی آواز پھر سنی گئی یا کہتا ہے کہ شکر ہے غریب نے دوسری رات پکڑی ممکن ہے کہ اچھا ہو جائے یا یہ کہ آج رات کو دیکھئے اس کی کیا حالت ہو گی یا یہ کہ کل ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ مر نہیں سکتا جیسا آج روتا ہے کل بھی روئے گا چنانچہ دیکھو پھر رات آگئی یا از راہ افسوس کہتا ہے کہ اسے تڑپتے ہوئے دوسری رات ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اسی کا میر حسن دہلوی نے ترجمہ کیا ہے مگر ان کو وہ الفاظ نہیں مل سکے ہیں جنسے خاقانی کا ایک شعر ایک دیوان سے بھی کچھ زیادہ ہے اور نتیجہ نہیں ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس میں صرف دو پہلو ہیں کہ اس کا افسانہ ہم کو سونے نہ دیگا یا یہ کہ اپنی داستان کہتے کہتے مر جائے گا تو ہمارے راحت و آرام پر پانی پھر جائے گا۔

میں نے بھی خاقانی کے شعر کا ترجمہ کیا تھا جس میں میری یہ کوشش ضرور تھی کہ خاقانی ہی کی طرح الفاظ ہوں کامیابی ناکامیابی کی تو خبر نہیں شعر یہ ہے ؎

نالۂ غم پہ دل زار کی بات آئی
لوگ چلائے کہ اس نے کہا پھر رات آئی

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

آج یہ خلافِ معمول ساقی نے مجھے شراب کیوں دیتا ہے۔ چونکہ یہ بھی انکی بزم میں ہونے کی وجہ سے میرا رقیب ہے تو بہت ممکن ہے کہ اسنے شراب میں کچھ زہر وغیرہ ملا دیا ہو۔ مرزا آتش مرحوم فرماتے ہیں ؎

غیر دیتا ہے کیوں مجھے ساغر — سانپ ہو زیرِ آستین نہ کہیں

ہے منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے — کیوں بدگمان ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میرا معشوق منکرِ وفا ہے اس پر غیر کا یا کسی کا فریب کیا چلیگا۔ دوست سے میری یہ بدگمانی کہ وہ دشمن کا دوست ہے بالکل فضول ہے کیونکہ وہ جانتا ہی نہیں کہ دوستی کیسے کہتے ہیں۔

رشک کہتا ہے کہ اسکا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے — ڈالا ہے تمکو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں تو شبِ وصل میں اس سے گھبرا رہا ہوں کہ کہیں کمبخت رقیب نہ آ جائے یا اس کو میری شبِ وصل کی خبر ہو جائے تمکو وہم نے کس پیچ و تاب میں ڈال رکھا ہے کہ مجھسے زیادہ مضطرب الحال ہو اس میں اور از راہِ شوخِ طبعی معشوق سے یہ کہلانے کا ارادہ کیا گیا ہے کہ مجھے بھی رقیب ہی کا خوف ہے یا یہ کہ میرا تو وہ رقیب ہے مجھے اس کا خوف ہے مجھے اس سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے مگر تمکو اس کمبخت کی کیا فکر ہے۔ تم کیوں وہم کر رہے ہو۔ اگر وہ آ بھی جائیگا یا اس کو خبر بھی ہو جائے گی تو تمھارا کیا بنا بگاڑیگا تمھارے نزدیک جیسا میں ویسا وہ۔ تم فضول نقصان پہونچنے کے وہم میں پڑے۔ مجھ تک اسے تو جواب دیجئے اور راستہ بتائیے۔

دوسری شرح میں مصرعِ ثانی کے یہ معنی لیے گئے کہ شاید تمھارا وہم اسلئے ہو کہ میں اپنے کسی معشوق سے چھپ کر یہاں آیا ہوں اس وجہ سے پریشان ہوں۔ یہ صرف وہم ہی وہم ہے باقی کچھ نہیں۔

مگر پہلے معانی اس سے اچھے ہیں کہ اگر معشوق کہے کہ [illegible] مجھے رقیب کا خوف ہے دیتے ہی مجھے بھی [illegible] تو اس سے کہا جائے کہ آپ تو کہتے تھے کہ مجھے کسی کا خوف و خیال ہی نہیں میں کسی سے ڈرتا ہی نہیں۔ پھر کس بات کا وہم ہے معلوم ہوا کہ آپ کی وہ شیخیاں غلط تھیں۔

معانی نمبر ۲ میں خوف اور وہم کے لفظ پر خیال کیجئے۔ خصوصیت سے قابل [illegible] ہیں کہ مصنف نے خوف کا لفظ اپنے لیے [illegible] پہونچا سکتا ہے اور معشوق کے لئے وہم اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ [illegible] نقصان کا اندیشہ [illegible] سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے ۔۔۔ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

میں اور مجھے حظ وصل حاصل ہو [illegible] شکریہ میں اپنی جان دیدوں مگر اضطراب میں جان دینی بھول گیا۔ [illegible] واضح ہو [illegible] اور [illegible] [illegible]

[illegible]

نقاب میں [illegible] معشوق کا [illegible] شکوہ [illegible] میں [illegible]

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۔۔۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

[illegible] لاکھوں [illegible] بگڑنا [illegible] اس سے [illegible] اور [illegible] ترکیب [illegible] میں [illegible] گیا ہے۔

وہ نالہ دل مین خس کی برابر جگہ نہ پائے — جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب مین

یہ شعر تعجب اور افسوس کے مقام پر کہا گیا ہے کہ میرا ایسا نالہ جس سے آفتاب مین شگاف پڑے وہ اس کے دل مین کچھ بھی جگہ نہ پاے۔ دوسرا شعر بھی ایسا ہی ہے

وہ سحر مدعا طلبی مین نہ کام آے — جس سحر سے سفینہ روان ہو شراب مین

تعجب ہے کہ وہ سحر جس سے سفینہ شراب مین روان ہو۔ مدعا طلبی مین کوئی کام اُس سے نہ نکلے سفینہ شراب مین روان ہونا وقوع امر خلاف عادت سے مراد ہے۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہون روز ابر و شب ماہتاب مین

غالب شراب مجھ سے چھٹی مگر اب بھی کبھی کبھی چاندنی رات یا برسات مین پی بھی لیتا ہون لفظ چھٹی سے پتہ چلتا ہے کہ خود نہین چھوڑی مفلسی یا زمانے کی گردش یا بڑھاپے وغیرہ نے چھڑا دی ہے۔

غالبًا یہ کوئی بڑا مشاعرہ ہوا تھا کہ جس مین غالب مرحوم کا دو غزلہ اور مومن خان نواب مصطفٰے خان شیفتہ۔ مولینا آزردہ۔ شیخ ابراہیم ذوق۔ عارف وغیرہ سبھی کی غزلین ہین چنانچہ اس دوسری غزل کے مطلع کے ساتھ تفریح طبع ناظرین کے لئے دو تین صاحبون کے مطلع ہم لکھین گے۔ اور قافیون کے ساتھ بھی اچھے اچھے شعر دیے جائین گے تاکہ اندازہ ہو کہ یہ سب لوگ معانی آفرینی کو شاعری سمجھے ہوے تھے نہ یہ کہ جو آجکل مشاعرون کا رنگ ہے کہ مشاعرے بھر مین ہر قافیہ مین ادنی تغیر کے ساتھ سب کے یہان وہی مضمون ہوتا ہے چنانچہ ایک مشاعرہ ہوا تھا کہ جس مین پیمانہ ہمین ردیف و قافیہ تھا سب کے یہان پیمانہ کے ساتھ وہی آنکھون اور شراب کا مضمون تھا۔ بخلاف اس کے اہل فارس کو دیکھئے کہ ایک ہی مضمون کو ایسے مختلف طریقون سے لکھتے ہین کہ دیکھنے والے کو اندازہ مشکل ہے کہ یہ وہی مضمون ہے یا کوئی دوسرا۔ مثلًا چند اشعار ذیل مین درج ہین۔ صبر و رضا و قناعت و توکل کے مضامین مین۔ عینیت

صائب: شکوۂ رزق مکن پیش تنگ حوصلگان — در گلو گریہ گرہ چون شود دانہ شمر — قناعت

صائب	اگر وطن بہ مقام رضا توانی کرد	غبار حادثہ را طوطیا توانی کرد	رضا
"	شکایت ستم چرخ کج ناجوانمردی است	کہ گوشمال پدر خیر خواہی پسر است	صبر
"	حکایتے کہ ز گردون کنند بے ہنران	شکایتے است کہ تیر کج از کمان دارد	صبر
"	سر از دریچہ گوہر برآوردی فرد ا	اگر چو رشتہ بسازی بہ پیچ و تاب اینجا	قناعت و صبر
حافظ	بر آستانہ تسلیم سر بنہ حافظ	کہ گر ستیزہ کنی روزگار بستیزد	رضا
کاشی	چون تہیدستی ز حد بگذشت سامان میدہد	گوہر غلطان صدف را دستگردان میدہد	صبر و قناعت
ملا بیگ	در فطرت کامل نکند حادثہ نقصان	یاقوت چو سائیدہ شود قوت روح است	"
سلیم	صفائے دل طلبی چشم از جہان بربند	کہ رخنہ نیست کزینجا غبار مے آید	"
میر معصوم	با سفلگان طریقہ تسلیم حکمت است	پیش آیدت اگر دو سہ تیغ خمیدہ رو	رضا و تسلیم
غنی	فتد چون رخنہ در کار تو مگشا یدہ در روزی	ز سنگ آسیا در گوشم این آواز می آید	قناعت
ملا اسلم	ز جور چرخ شکوہ کند ہر کجا تنک ظرفیست	حباب می شکند کاسہ بہ بسر دریا	صبر و تسلیم
صائب	شاخی کہ چار فصل پر از میوہ و گل است	دست نگار رفتہ اہل توکل است	قناعت و توکل
کاشی	جز صبر نیست صیقل دلہائے بیقرار	چون ایستاد آب بآئینہ میرسد	صبر و قناعت
غنی	تا رزق خود رسد بدہانت چو آسیا	دائم خموش دار زبان سوال را	قناعت
شوکت	فریب نعمت الوان مخور فراغت کن	چو پارہ نو بہ دو انگشت نان قناعت کن	"
سرخوش	چو لعل ہر کہ چون جگر خوردہ صبر کرد	زیب کلاہ گوشہ اقبال می شود	صبر
ناصر علی	نعمت خوان قناعت دیدہ الذت سیر	چشم سیری نقل با دام است مہمان مرا	قناعت
ملا فقری	چو بستہ شکر قناعت لب سوال مرا	زبان بود بہ دہن لقمہ حلال مرا	"
علی رضا	از اضطراب کار رہا نمی شود	سیل از دویدن است کہ دریائی شود	صبر و قناعت

غور کیجئے کہ ان سب میں صبر و قناعت و توکل کے نتائج کس خوبی کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں کہ اس سے بہتر سمجھ میں نہیں آتے۔ اور یہی سب سامنے کی باتیں ہیں عزلت گزینی کے مضامین ملاحظہ کیجئے۔

صائب	عزلت گزین کہ آب باین سہل قیمتی	در دامن صدف چو کشد یا گہر شود
"	مرد بخانہ ارباب بے مروت دہر	کہ کنج عافیتے در سرائے خویشتن است
"	کلید گلشن فردوس آن کسان دارند	کہ در بروئے خود از کائنات می بندند

کلیم — صحبت سپہر بہ ان مغتنم اہل گفت / اہل عزلت را سفر از پا و مردم رفتن است
در کیش ما تجرد عزلت تمام نیست / در قید نام ماند اگر از نشان گذشت
غنی — شوق تنہائی ہمیشہ مرد دارد از جوان / موئے چون از سر جدا گردد دلی باشد سفید

اسی صورت سے بچھڑ جانے اور دوستوں سے جدائی کی مذمت کے لئے دیکھئے۔

پیدا نہ شد ز شر من بہ آسیا رفتا د / ز ہجر یار موافق جدا نباید شد
مقصود صحبت است ز گل ورنہ بوی گل / ز صبا نہ گرد رہ جدا سے توان شنید
تا بر دو ز ہم مہینان کہ تنہائی / لطیفہ نیست کہ از بہر خود گزید خدا
نیست اکسیری برا از صحبت کامل عیار / گفتہ ام حرفی کہ می باید بآب زر نوشت

میں ابھی اور کچھ بھی لکھتا مگر چونکہ اپنے مقصد سے دور پہنچا جاتا ہوں لہذا یہیں اس کو ختم کرتا ہوں۔ مگر ہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ ہمارے اردو کے شعرا اکثر فارسی زبان کے اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں عیوب وغیرہ کی امثال اسی ذخیرہ سے دیجاتی ہیں مگر بجدت مضامین میں اتباع کرنا ایسے مذموم و متروک ہو گیا ہے کہ جیسے یہ کوئی گناہ ہے حالانکہ مجرب اخلاق مضامین لکھنے کے گناہ متروک نہیں ہیں۔

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں / یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

کل سے مراد روز قیامت ہے۔ کہتا ہے کہ روز قیامت کے خوف سے شراب دینے میں خست نہ کر کیونکہ اس سے ساقی کوثر کی شان میں سوئے ظن پیدا ہوتا ہے کہ اگر شراب نہ رہی ہوتی تو ساقی کوثر کو یہ کام کیوں سپرد ہوتا۔ ساقی کوثر سے مراد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم اور خلفائے اربعہ جو آپ کی طرف سے حوض کوثر سے لوگوں کو سیراب کریں گے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ ہے وہ آج ہی پلا دے کل کے لیے کیوں بچاتا ہے۔ کل ساقی کوثر پلا دیں گے گویا اس بچانے سے تو اُن کے حق میں بدگمانی کرتا ہے کہ وہ نہ پلا سکینگے۔ یہ معنی پہلے معانی سے زیادہ مناسب اور اچھے ہیں اور لفظ خست اس مفہوم پر خصوصیت سے دال ہے۔ ذوق مرحوم فرماتے ہیں۔

خط پڑھ کے اور بھی ہوا وہ پیچ و تاب میں / کیا جانے لکھدیا اُسے کیا اضطراب میں

ہیں تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں — بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
سینہ آرام سے ہے کون جہان خراب میں — گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

آج ہم اس قدر ذلیل کیوں ہیں کل جب فرشتوں سے جناب باری نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہم زمین میں ایک خلیفہ بنانے والے ہیں اور فرشتوں نے عرض کیا تھا آیا تو کوئی ایسا خلیفہ بنانے والا ہے کہ جو زمین میں خون بہائے اور فساد کرے۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تہلیل کرتے ہیں اور جناب الٰہی سے از راہ عتاب حکم ہوا تھا کہ چپ رہو تم ان اسرار کو نہیں جانتے ہو جو میں جانتا ہوں بالکل اسی مضمون کا شعر فارسی میں بھی کہا گیا ہے۔

اے آنکہ از غرور تبسم نمی کنی — حاشا زبان شیدہ بازگوے کہ پیش از ظہور بود

جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

اگر وہ صدائے جان بخش چنگ رباب میں سمائی ہوئی ہے تو کیا سبب ہے کہ اسکو سنکر جان نکلنے لگتی ہے حالانکہ اسکا خواص جان بخشی ہے۔ اس صورت میں استفہام استخباری ہے اور مجکو یہی معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ مگر نظم صاحب یون فرماتے ہیں کہ یہاں استفہام فقط سامع کے متنبہ کرنے کے لئے ہے شاعر جواب نہیں چاہتا ہے۔ مولانا نظم کا ایک شعر اسی مضمون سے ملتا جلتا مجھے یاد ہے بہت خوب فرمایا ہے۔

صدائے چنگ سے مجکو بھی آواز آتی ہے — کوئی کہتا ہے اب پردہ ہم باہر نکلتے ہیں

ظاہرا اخذ اسکا یہی غالب کا شعر ہے۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

میرا رخش عمر بے محابا دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے جس سے میں سہم رہا ہوں نہ اس خوف و اضطراب میں حلقۂ رکاب میں میرے پاؤں جمتے ہیں نہ باگ پر میرا ہاتھ ہے۔ غرضکہ میں بے اختیار ہوں دیکھئے یہ کہاں جا کر رکتا ہے اور کس وقت میرا خوف کم

ہوتا ہے یا کسی جگہ مجھکو اپنی پشت سے گرا سکتا ہے یعنی دیکھئے کب موت آتی ہے اور میں مصائب زندگی سے فراغت پاتا ہوں۔ مومن خان صاحب اس قافیہ کو یوں کہتے ہیں ؎

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم فتراک میں جو سر ہے تو پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جس قدر کہ مجھکو غیر کا وہم ہے اور غیر کو غیر سمجھتا ہوں اُسی قدر اپنی حقیقت سے دور ہوں اپنی ذات سے بھی دور ہوں یعنی ماسوا کے اثر سے [illegible] وہ اپنی ذات ہے یا کوئی اور ہوا وہ اس کے دوسرے [illegible] نے لکھے ہیں کہ جس قدر وہم غیر سے مجھکو پیچ و تاب رہتا ہے اُسی قدر اپنی حقیقت سے مجھکو بعد ہے یعنی جس مقام کی خواہش ہے یا جس جگہ میں ہوں [illegible] نہیں ہے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے یہاں بھی دو شعر [illegible] ؎

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا [illegible]
سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی [illegible]
سب آئینہ میں [illegible] [illegible]
[illegible] شیفتہ [illegible] [illegible]

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود و شاہد و مشہود ان سب کی اصل ایک ہے [illegible] ایک ہیں تو شاہد و مشہود کی مغایرت سے کس حساب میں [illegible] مشاہدہ مراد ہے [illegible] یعنی تمام عالم موجود [illegible] اعتبار متقاضی مغایرت کی گنجایش نہیں ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

مطلب یہ ہے کہ قطرہ اور موج اور حباب کی [illegible]

سب صورتیں دریا کی بدولت نظر آ رہی ہیں اور ان صورتوں کے ظاہر ہونے سے جس کا پتہ چلتا ہے یعنی ہستی موجودات وجود واجب کے ضمن میں ہے باقی کچھ نہیں ہے۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی   ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

شرم ایک ادائے معشوقانہ ہے کوئی نہ ہو تو خود ہی سے شرمانا چاہئے وہ اگرچہ شرمائے ہوئے ہیں اور حجاب میں ہیں مگر حجاب سے بے حجاب ہونا بھی ایک امر خلاف شرم و ادائے معشوقانہ ہے سامرعہ کا ایک مصرع مجھے یاد آیا۔

اتنا گستاخ ہے پردے میں حجاب آیا ہے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

باوجودیکہ ایک جہان اس کا عاشق ہو چکا ہے مگر اس کو آرائش جمال سے فراغت حاصل نہیں ہوئی اور اسی لیے اب تک بھی پردہ میں وہ اپنی آرائش جمال میں مصروف رہتا ہے مولانا نظم نے اس شعر کو تصوف کے مضامین سے لبریز بنایا ہے اور یہ مفہوم ظاہر کیا ہے کہ نقاب استعارہ ہے حجاب قدس سے اور آئینہ اس میں مظہر ما یکون و ما کان ہے اور آرائش جمال سے فارغ نہ ہونا تفسیر کل یوم ہو فی شان ہے یہاں ایسا نکتہ یہ ہے کہ اولیٰ کو گنجائش ہے اس کو بھی ذہن تک تعریف شان لے جا سکتے ہیں اور جو معانی بتائے گئے وہ غلط نہیں ٹھہرائے جا سکتے مگر استعارات جو انہوں نے بیان کئے ہیں وہ سب بے لطفی ہیں اور استعارہ کے لئے ضرور ہے کہ اس بات کی سمجھ ہو کہ اس کی طرف جلد سے جلد ذہن منتقل ہو جائے اور یہاں یہ کچھ بھی نہیں ہے اگر کوئی معانی ... ہیں اور جب ایسا رشتے کا ذکر نہیں کیا گیا تو فصاحت و بلاغت تو درکنار وہ شعر کو مہمل اور شاعر کو مخل کو ناحق خطاب دلا دیتے ہیں۔

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جس کو ہم شہود یعنی ظاہر یا حاضر سمجھتے ہیں وہ غیب در غیب ہے اور اس غیب کو شہود سمجھنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حالت خواب میں یہ سمجھے کہ ہم جاگتے ہیں۔

مگر دراصل وہ بیداری نہیں ہے مولینا حالی نے یادگار غالب میں اس کی یوں تشریح کی ہے کہ سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے وہ شہود ہے اور غیب الغیب سے مراد مرتبہ احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے ورا الورا ہے کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ دراصل غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ خواب ہی میں ہے۔

مولانا نظم لکھتے ہیں یعنی خواب میں خواب دیکھ رہے ہیں تو یہ غیب غیب ہے۔

مولانا حالی مرحوم نے بہت خوب معانی بیان کئے ہیں۔ مولانا نظم کی شرح خود تشریح طلب ہے۔

عرفی مرحوم ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہر کس نشناسندہ راز است دگرنہ — اینہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست — مشغول حق ہوں بندگی بو تراب میں

دوست کے ہم نشین سے مجھے دوست کی خوشبو آتی ہے اس صورت سے گویا میں حضرت علی کی عبادت و طاعت کرنے میں خدا کی عبادت کرتا ہوں۔ اس شعر میں دلیل کو دعوے پر مقدم کیا گیا ہے اور یہ اکثر ہوتا ہے مگر مروج یوں ہے کہ اول دعوی بعدہ دلیل دینی چاہئے۔

ناسخ بیعت خدا سے ہم نے بواسطہ نصیب — دست خدا ہے نام مرے دستگیر کا

اس میں دعوی پہلے مصرع میں اور دلیل دوسرے میں ہے۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

تو زیادہ تر رقیب کے گھر رہتا ہے یہ مجھے معلوم تھا۔ اس واسطے تیری تلاش میں دشمن کے گھر جانے کی ذلت بھی اٹھانی پڑی کاش مجھے تیرا پتہ نہ معلوم ہوتا تو ذلت نہ اٹھانی پڑتی۔

مومن نے اس مضمون کو نہایت عمدہ طریقہ سے ادا کیا ہے کہتا ہے ؎

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل　　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

دوسرا پہلو اس میں یہ بھی موجود ہے کہ رقیب ہر وقت تیرے یہاں رہتا ہے اور تیرا اور رقیب کا گھر ایک ہی ہے تو اس صورت میں تیرے گھر جانے سے گویا رقیب کے گھر جانا پڑا کاش تیرے گھر کا راستہ مجھے معلوم نہ ہوتا اسی مضمون کو غالب نے دوسری جگہ ادا کیا ہے

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب　　　اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے　　　کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

کمر کسنا اور کمر باندھنا کسی مہم کی انجام دہی کے لئے مستعد ہونے کو کہتے ہیں اسی لئے مصنف کہتا ہے کہ آپ جو مجھ سے بار بار کہتے ہیں کہ تیرے قتل کے لئے ہم نے کمر کس کر باندھی ہے تو یہ آپ مجھے ڈراتے ہیں آپ کی کمر کا وجود ہی کیا ہے جو آپ نے کس کر باندھی ہے کیا میں آپ کی کمر کو جانتا نہیں ہوں جو آپ مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

لو اور سنو جس کی وجہ سے ہم تباہ ہو گئے وہ ہم کو بے ننگ و نام کہتا ہے اگر ہم جانتے کہ وہ بھی ہم کو یہ کہے گا تو ہم کاہے کو اپنا گھر تباہ کرتے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ　　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

میں تلاش منزل مقصود میں سرگرداں اور دیوانہ ہو رہا ہوں انتہا دیوانگی کی یہ ہے کہ اب راہبر کو بھی نہیں پہچانتا کہ کون مجھ کو میری منزل پر پہونچا دے گا۔ اسی دیوانگی میں جس راہرو کو تیز جاتا ہوا دیکھتا ہوں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وہیں جا رہا ہے اور اسے بھی میری طرح جلد پہونچنے کے لئے اضطراب ہے لیلیٰ سی خیال کی بنا پر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ وہ کسی دوسری جگہ جا رہا ہے اور اس کی منزل اور ہے تو پلٹ آتا ہوں کوئی اور تیز رو ملتا ہے پھر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں یہ شعر گویا ایک تصویر دیوانگی ہے۔ اور محاکات شاعری اسی کا نام ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاعری سے مصوری زیادہ ہے مگر در اصل یہ خیال غلط ہے
بلکہ شاعری مصوری سے مشکل ہے اور اس میں اگر شاعر قادر الکلام ہے تو ان باتوں
کی تصویر کھینچ سکتا ہے جو مصور کو نصیب نہیں ہو سکتی ہیں مصور کا بڑا کمال یہی ہے
کہ ہر چیز کی جو تصویر کھینچے اس کے حالات عیاں ہوں مگر بعض کامل مصور ایسے بھی
ہیں اور ہو گذرے ہیں کہ جذبات کی تصویر بھی کھینچ دیں مگر ان کا یہ کمال مرئی اور مادی
چیزوں تک منحصر اور محدود ہے غیر مرئی چیزوں کی تصویر اگر مصور کھینچے گا تو بدقت کھینچے گا
اور وہ بھی ایسی کہ جس کے دیکھنے سے اس کی حالت پورا پورا معلوم ہونا غیر ممکن ہے اپنا
سے میری مراد جذبات ہیں یعنی فرض کیجیے کہ غصہ، شکست، غرور، سادگی، متانت ابھرے
کھنڈروں کے نقشے ہرے بھرے باغوں کی سرسبزی اور درختوں پتے ہوئے چشمے کی
روانی وغیرہ کو ایک مصور چاہے کہ کھینچ سکے تو یہ ممکن ہے کہ غصہ، شکست، غرور، سادگی
کے جو حالات ہیں یا کسی جگہ کے اسباب اور ان کے آ جانے کے اثرات وہ اپنی
کے ساتھ اس سے عشق وغیرہ کیونکر دکھا سکتا ہے بخلاف اس کے شاعر کے کمالات میں
یہ سب باتیں ایک ہی ساتھ ادا ہو جاتی ہیں مثلاً قاآنی کا شعر ہے

زرنگ نسیم بہ گلستان می شمرد — شبنم از ہی سیب عارض آن می برد
سنبل از می گشتہ گرد آن آن می گرد — گر ہیچ می ... گر بہ عکس می دود
گاہ بہ شاخ درخت گرہ لب جو بیبار

اس میں لطافت کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہلکی ہلکی ہوا کی تصویر کھینچی گئی ہے جو صبح کے
وقت باغوں میں بہار کے دامن سے اٹھا ہوا ... آتی ہے ... سے ... ہوا کی
... چلنے کی تعریف کی ہے ساتھ ہی صبح کی نرم اور خوشگوار ہوا کی تصویر
آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور گلستان کی خوشبو کے ساتھ ہی ... سے ... ہوا کی
... دوسرے مصرع سے شبنم کی ... تصور آتی اور قدم
شعر کے پڑھتے ہی بات کے ... پر نگاہ جا پڑی ... ہلتی ہیں
پانچویں مصرع میں میوہ دار شاخوں کا جھومنا جھولا ڈالا ہو ... ان کے نازک نازک
ٹہنیوں کا لچکنا سب سماں اپنے پیش نظر ہو گیا جیسے کہ باغ ہی میں ... وہاں ... آ
پانی کی روانی ... کا سر اٹھا اٹھا ... درختوں ... کو ... کے ...

سب تصویریں کھنچی ہیں پیش نظر ہو گئیں

بخلاف اس کے ایک مصور باغ کی ہر ایک چیز کو بہ خوش اسلوبی دکھائے لیکن یہ ہوا کی شوخیاں اور اس سے باغ کی لطافت وغیرہ وغیرہ غنچوں کے چٹکنے کی آوازیں وغیرہ وغیرہ کیونکر دکھائے گا۔

دوسرا جانب غالب کے اسی شعر کو لیجئے۔ بہت ممکن ہے کہ ایک تماشا گم شدہ راہ کی تصویر کھینچ کر اس کے جذبات حیرانی کو اس کے چہرے سے ظاہر کرے مگر جو حالت کہ آپ اس کے سننے سے سمجھ رہے ہیں کہ دوڑنا۔ اور کسی رہبر کے ساتھ ہو لینا پھر پلٹ آنا پھر وہی حالت اختیار کرنا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں کہ جو ایک مصور کی حد اختیار سے باہر ہیں۔

ہم محاکات اور تصویر کے موازنہ میں یہ نکتہ بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کسی شے کا دیکھنا اور سننا کسی صورت سے برابر نہیں ہو سکتا چنانچہ مشہور ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ مگر شاعر کے اندر یہ کمال موجود ہے کہ وہ اپنے حسن بیان سے ایک ایسی چیز کو بے قدر کر دیتا ہے جسے آپ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مثلاً ایک مصور تصویر کھینچ لایا اس کو آپ نے دیکھا اس سے آپ پر اس قدر اثر نہ ہوگا جس قدر کہ ایک جادو بیان کے چند الفاظ کی تصویر آپ کو متاثر کر دے گی یہ امتیاز بھی کم نہیں ہے۔

اس کے سوائے یہ بھی خیال کیجئے کہ مصور کے لئے یہ ضرور ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچے اس کے ایک ایک خط و خال پر گہری نظر ڈالے اور اسے اسی طرح تصویر میں دکھائے ورنہ تصویر میں بجائے خوبی کے نقص پیدا ہو جائے گا مگر شاعر کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جزئیات بیان کرے۔

فردوسی افراسیاب کے غصہ اور غیرت اس کے غرور تمکنت تکبر دلیری اپنے مقابل پر دنیا کو ذلیل سمجھنے اور زمانہ کے حیرت انگیز انقلاب کی یوں تصویر کھینچتا ہے ؎

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسیدست کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

یہ باتیں تصویر میں دکہا دینا حد مصوری سے باہر ہی نہیں ہیں بلکہ غیر ممکن ہیں۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہون اُس بُتِ بیداد گر کو مین

اس مین غالب ترین پہلو تشنیع کا ہے کہ مصنف کہتا ہے کہ ابنائے دہر کیسے بیوقوف ہین کہ میری خواہش کو عبادت سمجھے ہین کہ مین اُس کو پوجتا ہون یعنی اہل دہر نے میری پرستش سے دہوکا کھایا ہے اور اس کو پرستش کا خطاب دیدیا ہے۔ حالانکہ جس حد تک میری پرستش ہے اُس کو پرستش کا خطاب نہین دیا جاسکتا ہے یہ حد طاعت مین نہین آسکتی صرف خواہش ہے اس مین ایک نازک نکتہ یہ نکلتا ہے کہ جب پرستش کیجائے گی وہ خواہش دل ہی سے ہوگی خواہ اُس مین کسیقدر استغراق کیون نہو اور جس امر مین خواہش دل شامل ہے وہ عبادت نہین ہوسکتی تو ثابت ہوا کہ حق طاعت کوئی بجا نہین لاسکتا۔ صرف دنیا پابندان خواہش کو عابد کا خطاب دیدیتی ہے۔ مولانا نظم لکھتے ہین کہ معنی باریک اس شعر مین یہ ہین کہ شاعر حیران ہوکر پوچھتا ہے کہ کیا مین اُسے پوجتا ہون اُسے خبر نہین کہ معشوق کے سامنے جا کر اظہار نیاز پرستش کی حد تک پہونچ جاتا ہے یا خواہش کی حد تک رہتا ہے اور حیرت کے علاوہ دوسرا پہلو تشنیع کا بھی ہے۔

مگر اس سے پہلا مصرع قریب قریب بے معنی ہوا جاتا ہے کیونکہ مصنف خواہش کو پرستش سمجھنے کی بنا پر ہی دیکھنے والون کو احمق قرار دے رہا ہے۔ فافہم۔

پھر بیخودی مین بھول گیا راہ کوئی یار جاتا وگرنہ ایکدن اپنی خبر کو مین

مین اپنے دل اپنے ہوش وحواس کو اُس کی گلی مین چھوڑ آیا تھا اور جب وہان سے آیا ہون بیخود ہون لہذا اُس گلی کا راستہ بھی بھول گیا۔ اور اس لئے اب اپنے دل وجان ہوش وحواس کی خبر بھی نہین لاسکتا کہ اُنپر کیا گذر رہی اور وہ اب کس حال مین ہین۔

اپنے پہ کر رہا ہون قیاس اہل دہر کا سمجھا ہون دلپذیر متاع ہنر کو مین

مثال مشہور ہے کہ المرا یقیس علی نفسہ یعنی جیسا آدمی خود ہوتا ہے ویسا ہی دوسرے کو سمجھتا ہے۔ اسی لیے مصنف کہتا ہے کہ جیسے میں متاع ہنر کا قدردان ہوں اور اسکو اچھا سمجھتا ہوں اسی طرح دنیا کو سمجھتا ہوں کہ اُس کو سب اچھا سمجھتے ہیں حالانکہ دراصل ایسا نہیں ہے ایکسا میں ایسا ہوں تو ہوا کروں دنیا ایسی بیوقوف نہیں ہے کہ متاع ہنر کی دلدادہ ہو۔ ہنر اس زمانہ میں ایسی شے نہیں ہے جسے کوئی پسند کرے (اپنے پہ) لکھنؤ کی زبان نہیں ہے لیکن دہلی میں یہ محاورہ روزمرہ میں داخل ہے۔ غالب نے ایک جگہ اور بھی لکھا ہے۔ شعر

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائیں کیوں

غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز — دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

سوار سمند ناز سے مراد ناز نین۔ علی بہادر یا تو کسیکا نام ہے جو مصنف کے دوستوں میں ہیں یا بہادر عالی گہر علی کی صفت ہے جس سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

وہ میرا ذکر بدی اور بُرائی کے ساتھ بھی سننا نہیں چاہتا کیونکہ مجھ سے اسکو سخت نفرت اور عداوت ہے اگر میرا رقیب ہر وقت اُس سے میری بُرائی کرتا ہے تو عجب نہیں کہ وہ اس کا بھی دشمن ہو جائے۔ بالکل اسی مضمون کو دوسری جگہ بھی کہا ہے۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق — مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

اُسنے میرے ساتھ سیر گلستان کا وعدہ کیا ہے اور اس میں جو خاص بات ہے اُس کا مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ یعنی در پردہ میرے قتل کا ارادہ ہے تو اگر ایسا ہو جائے تو میرے شوق کا نصیبہ جاگ اُٹھا۔ اسی مضمون کو ایک جگہ اور بھی

مصنف نے کہا ہے مجھ کو ایسے شعر یاد آئے ہم اسی شعر کو لکھ چکے ہیں مگر اس وقت یاد نہیں آتا۔

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شعرائے معشوق کی کمر کو اس قدر نازک قرار دیا ہے کہ اس کو بالکل معدوم فرض کر لیا ہے کہ لوگ عالم یعنی دنیا کو معشوق ہستی مطلق کی کمر کہتے ہیں (یعنی اس وجہ سے اس کو معدوم قرار دیتے ہیں۔ مگر انکا یہ کہنا کہ عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے سراسر خلاف ہے لوگ عدم کے ساتھ ہے کا لفظ کیوں شامل کرتے ہیں یہ بالکل بے معنی یعنی ہستی ایک معدوم شے ہے جس کے ساتھ اثبات کا کوئی لفظ شامل کرنا منافی مقصود ہے نظم صاحب لکھتے ہیں کہ منظور یعنی مبصر و مرئی استعمال کیا ہے مگر یہ خلاف محاورہ ہے یہ خیال میرے نزدیک صحیح نہیں ہے بلکہ غالب کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہے (یعنی لوگ اس کے ساتھ ہے کا لفظ شامل کرتے ہیں مگر ہم اس (ہے) کو نہیں مانتے۔ ہے کی معدوم شے میں گنجایش ہی نہیں ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

یعنی حقیقت میں میں بھی ایک ایسا قطرہ ہوں جو فنا فی البحر ہے اور اس لحاظ سے میں بھی دریا ہوں مگر منصور کی طرح میرا ظرف چھوٹا نہیں ہے کہ لوگوں پر اپنے دریا ہونے کا اظہار کردوں یعنی میں بھی مرتبہ فنا فی الذات پر پہونچ گیا ہوں مگر یہ نہیں کہ منصور کی طرح کہدوں کہ میں خدا ہوں لفظ حقیقت اس شعر میں لطف سے خالی نہیں ہے۔

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی — عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

اے ذوق خرابی افسوس ہے کہ اب مجھ میں وہ پہلی سی طاقت باقی نہ رہی کہ عشق جیسے پہلوان سے نبرد آزمائی کروں (ذوق خرابی) سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ عشق نے مجھکو خراب کیا اور اب بھی خرابی کے سوا عشق سے کوئی نتیجہ پیدا

نہ ہوگا دگرگون یعنی حسب ہندی کا لفظ ہے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

یعنی جب میں اس سے کہتا ہوں کہ ہم خدا سے تم کو قیامت میں لیں گے
وہ حاضر جوابی کی راہ سے کہتا ہے کہ کوئی ہم حور تھوڑی ہیں جو آپ کو قیامت میں
ملجائیں گے۔ دوسری جگہ یہی مضمون اس طرح کہا ہے ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے اگر حوریں یہی واں ہو گئیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

یعنی اگر لطف اور مہربانی کرنے میں تجھے کچھ تکلف ہے تو یہ نہیں مگر ظلم تو
کر کیونکہ حالت تغافل میں ہم دونوں باتیں [illegible] سکتا ہے کہ محض تغافل میں تو معذور
اور معاف نہیں رکھا جا سکتا یعنی تیرا تغافل مجھے دونوں باتیں کرنے کی اجازت
دیتا ہے [illegible] انجام پا سکتی ہیں یعنی ہر طرح مجھے تجھ سے تغافل
[illegible] ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے
[illegible] ہو گیا کہ اس نے ظلم کرنا چھوڑ دیا۔
دوسرے یہ معنی ہیں کہ عاشق و معشوق کہیں حسن اتفاق سے ملے ہیں اور
عاشق [illegible] مضمون اس کے سامنے ادا کرتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ
[illegible] اس بات کے طعنے دیتا کہ یہ اس سے ملا تو عاشق اس کو اپنے اوپر مہربان
[illegible] اختیار کیا ہے اس کو [illegible] ظلم
کیا کرتے [illegible] مہربان ہوا تھا
[illegible]

گر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی۔

[illegible] تغافل اختیار کرتے کچھ [illegible]
[illegible]
[illegible]

یعنی تغافل تو ناشائستہ محض ہے یہ مجھے کیونکر گوارا ہو۔ حسرت صاحب کہتے ہیں کہ اگر تو لطف نہیں کرتا تو ظلم ہی کر بہر حال تغافل نہ کر یعنی تیرا شیوۂ ستم ہے تغافل بھی پسند نہیں ہے۔

مست و دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ   وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہم مے کشی میں جمشید کے مقلد ہیں اور شراب انگوری اسی کی ایجاد ہے لہذا وہ شراب کہ انگوری نہ ہو ہم نہیں پیتے۔ دردی کش کی وجہ سے لفظ مست لا آگیا ہے جس نے شعر کو بے اثر بنانے ہی پر بس نہیں کیا ان کی بندش کو بھی سست کر دیا اور ایک جگہ کہتے ہیں ۔

نادان حریف مستی غالب مشو کہ او   دردی کش پیالۂ جمشید بودہ است

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب   میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

میں چونکہ مشہور نہیں ہوں لہذا خفائی ہوا۔ اور خفا اور ظہور میں تقابل ہے لہذا میں بوجہ نہ مشہور ہونے کے ظہوری کا مقابل ہوں یعنی جتنے کہ ظہوری مشہور اتنے میں نامشہور ہوں۔ مرزا غالب شاعری میں مرزا عبدالقادر بیدل۔ عرفی۔ نظیری۔ ظہوری کے رنگ کے متبع تھے اور اس تقلید و اتباع پر اکثر جگہ ناز کیا ہے۔ جیسا کہتے ہیں۔

بنظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب   رگ جان کردہ ام شیرازۂ اوراق کتابش را
گشتہ ام غالب طرز نامشرب عرفی کہ گفت   روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است
ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون   با ظہوری و صائب محو ہم زبانی ہاست
بتازہ گشتہ غالب روش نظیری از تو   سزد اینچنین غزل را بسفینہ ناز کردن

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں   ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اے ستم ایجاد تو سمجھا ہے کہ میں جو تیرے ظلم و ستم پر روتا ہوں اس سے ظلم و ستم کا شکوہ مقصود ہے یہ میرا مطلب نہیں ہے بلکہ اس نالہ سے میرا مطلب یہ ہے کہ تو مجھ پر اور بھی زیادہ ظلم و ستم کرے یعنی میں جس قدر روؤں گا تو خفا ہوگا اور زیادہ

ظلم کرے گا۔

یا یہ کہ اے ستم ایجاد تو نے میرے نالہ کو شکوہ ستم سمجھ کر شیوۂ تغافل اختیار کیا ہے تو غلط سمجھا ہے میں اس گریہ سے شکوہ پیدا نہیں کرتا بلکہ تقاضائے جفا کرتا ہوں۔

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب — ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں (۲)

یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ فرہاد خسرو کے حکم سے کوہ بیستون کو کاٹنے اور نہر نکالنے کے لئے گیا لوگ اس کو عشق صادق پر محمول کرتے ہیں کہ اس نے عشق پر دھبہ نہ آنے دیا اور یہ سخت کام انجام دینا منظور کیا۔ مگر ہم کو یہ تسلیم نہیں ہے۔ فرہاد کو دعویٰ عشق کامل نہ تھا ورنہ رشک اس بات کی اجازت نہ دیتا کہ وہ رقیب کے حکم کرتا اور اس کے عشرت گاہ کو زینت دیتا یہ نکونامی نہیں ہے بلکہ فرہاد کے لیے باعث بدنامی ہے بالکل اسی مضمون کو غالب نے فارسی میں کہا ہے ؎

از جوئے شیر و عشرتِ خسرو نشاں نماند — غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می‌زند

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں (۳)

یعنی میرا گھر بھی خرابی میں جنگل سے کم نہیں ہے مگر جنگل کی طرح وسیع نہیں ہے اس لئے جنگل میں وہ عیش مجھ کو نصیب ہے کہ گھر یاد نہیں آتا۔ اس قسم کے اور شعر بھی گذر چکے ہیں۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں (۴)

عقلمند طوفان حوادث زمانہ سے افسردہ دل نہیں ہوتے بلکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرتے اور سبق لیتے ہیں اور طپانچہ موج حوادث کو استاد کا تھپڑ سمجھتے ہیں۔ ظہیر فاریابی کا ایک شعر ہے ؎

صدمہائے عشق را کے بوالہوس دارد قبول
کے شناسد طفل قدر سیلیِ استاد را

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا   جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

ہم بربنائے صبر و رضا و وفا اُس کی جفاؤں پر آہ و فریاد نہیں کرتے تو سمجھتا ہے کہ ہم فریاد کر ہی نہیں سکتے اور ہم میں فریاد کی طاقت باقی نہیں رہی ہے ہائے ہمارا شیوہ تسلیم کس قدر اثر سے محروم ہے اور ہماری وفا کس قدر بُری ہے محرومیِ تسلیم و بداحالیِ وفا کے ظاہر معنی تو یہی ہیں جو ہم نے لکھے مگر در اصل جو اُس کا لطف ہے وہ ذوقِ وجدانی پر خوب ظاہر ہوتا ہے۔

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے   گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں

اگر گل و لالہ چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں ہیں تو آخر ان کا رنگ اس قدر پریشان کیوں ہے رنگ کی پریشانی رنگ اُڑنے کو کہا گیا ہے اور اسی سے چراغ گل و لالہ کو چراغِ رہگذرِ باد قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جیسے ہوا چراغ کو بجھا دیتی ہے اسی طرح چراغِ گل کی روشنی رنگ کو زایل کر کے اُس کو بے نور کر دیتی ہے پھولوں کو چراغِ رہگذرِ باد کہنا لطافت سے خالی نہیں اور غالباً یہ نئی تشبیہ ہے جو اردو کے دواوین میں نہیں پائی جاتی۔ ایک جگہ کہا ہے ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام   مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یہاں

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں   مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

اے مرغِ گرفتار شکر کا مقام ہے کہ تجھے کسی صیاد نے گرفتار نہیں کیا بلکہ گلچیں نے سبدِ گل کے نیچے بند کیا ہے۔ اگرچہ تو قید ہے مگر پھولوں کی صحبت تجھ کو حاصل ہے اور یہ بہت غنیمت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عاشق کیسی ہی تکلیفیں اُٹھائے مگر معشوق کی صحبت حاصل ہے تو یہ تکلیفیں [illegible] سے [illegible] نے اس شعر کی شرح میں یہ الفاظ لکھے ہیں کہ شعر کا مطلب [illegible] ہے کہ گل و بلبل شمع و پروانہ کا ذکر بھی مضمون شعر [illegible] [illegible] کہا ہے ورنہ یہ اتنا شعر کہنے کو کوئی حاصل نہیں [illegible] تو [illegible] اس کی شرح [illegible] سکتے ہیں

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

جو مرغ کو قفس میں بند کر دے گا۔ فقط۔ یہ شعر مرغ آزاد سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ تجھے مژدہ ہو اس وقت باغ میں صیاد نہیں ہے گلچیں ہے اگر تجھے گرفتار بھی کرے گا تو سبد گل میں تجھے بند کرے گا۔ جو تیرے لئے باعث راحت ہوگا نہ کہ قفس کی طرح جانگزا [illegible] اب شعر دلکش ہے۔ اور [illegible] بجائے اس کے صحیح ہے۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا　　دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

اس کو بجائے دہن کے دہن [illegible] ملی ہے یا اس کو دہن قبلِ ایجاد نہیں [illegible] چونکہ ہر بات پردہ نہیں میں نکلتا ہے اور اس نفی سے اثبات کی تراوش ہوتی ہے۔ یعنی کوئی چیز ضرور ہے جس سے وہ اس لفظ کو ادا کرتا ہے پہلی صورت میں دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں کہ اگرچہ نہیں بجائے دہن اس کو ملی ہے مگر ملی ضرور ہے۔
اس شعر میں مصنف نے [illegible] اثبات کو [illegible] یا دو شعر نزدیک اس کو [illegible] بھی صحیح سمجھتے تھے دوسری جگہ لکھا ہے۔ ع
ہے رنگ [illegible] کا اثبات [illegible] ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت　　یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

بہشت رونق کے لحاظ سے تو ایسا ہی ہے جیسا تیرا کوچہ ہے مگر وہ اتنا آباد نہیں ہے یہاں عاشقوں کا ہجوم ہے وہاں [illegible] آبادی [illegible] زیادہ ہے [illegible] ایک جگہ سے دوسرے شعر کے ساتھ اس کو [illegible]

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب　　تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

غالب تم غربت کی شکایت کس منہ سے کرتے ہو کیا یاران وطن کی بے مہریاں اور ان کی آزاریاں یاد نہیں ہیں جو کہ اس سے کہیں زیادہ تھیں
[illegible]
[illegible]

دونون جہان دیکے وہ سمجھا یہ خوش رہا	یان آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کرین

ہم نے دونون جہان کو اُس کے مقابلہ پر ہیچ سمجھا تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ خوش ہے حالانکہ دونون جہان کا چھوڑنا ہم کو بہت شاق گذرا تھا۔ مگر شرم یہ تھی کہ اُس کا یہ خیال ہے تو یہی ہی اب تکرار کیا کرین سمجھنے دو چپ ہو رہو۔ ع

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار مین آئے

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے	تیرا پتہ نہ پائین تو ناچار کیا کرین

یعنی تیری جلوہ گاہ تک کوئی نہ پہونچ سکا کوئی یہان تھک کر رہ گیا کوئی وہان رہ گیا غرضکہ اثنائے منزل ہی مین سب کا خاتمہ ہوا اور ایسا کیونکر نہوتا کیونکہ تجھ تک پہونچنا حد بشری سے باہر ہے یہ شعر تصوف کا ہے مقام سے مقامات سلوک مراد ہے۔ جو سالک کو اس راہ کے طے کرنے مین پیش آتے ہین۔

کیا شمع کے نہین ہین ہوا خواہ اہل بزم	ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرین

مطلب یہ ہے کہ بزم مین شمع کے خیر خواہ بھی موجود ہین مگر وہ مجبور ہین اس کا غم جانگزا اور رنج جانسوز ہے وہ اس کا کچھ مداوا نہین کر سکتے۔

ہو گئی غیر کی شیرین بیانی کارگر	عشق کا اُس کو گمان ہم بے زبانون پر نہین

دشمن نے چرب زبانی سے اُس کو رام کر لیا ہے اور اُسے یقین دلا دیا ہے کہ مین عاشق صادق ہون ہم بے زبان ہین رعب حسن ہم کو کچھ کہنے کی اجازت نہین دیتا اس لیے وہ ہم کو اپنا عاشق نہین سمجھتا۔

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشت قیس مین آنا	تعجب سے وہ بولا یون بھی ہوتا ہے زمانہ مین

وہ سنگدل جذب دل عاشق سے بے خبر ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ لیلیٰ کا ناقہ ناواستہ ہو کر اک شب تار مین اس کو اس جنگل مین لیگیا تھا جہان مجنون خاک چھانتا تھا

چنانچہ قیس کو جب یہ قصہ سنایا تو اُسنے کہا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک معشوق عاشق کے پاس چلا جائے یعنی جذب عشق اتنا نہیں ہو سکتا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ حجاب معشوقانہ معشوق کو عاشق کے پاس جانے کی اجازت دیدیتا ہے۔

دل نازک پہ اسکے رحم آتا ہے مجھے غالب　　نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

اے غالب تو جو ارادہ کرتا ہے کہ میں جان دیکر اس کی الفت کو آزماؤں اور امتحان کروں کہ میرے مرنے کے بعد اس کو کچھ میرا رنج ہوتا ہے یا نہیں ایسا کر ممکن ہے کہ اس سے اس کے نازک دل کو کوئی صدمہ پہونچے جو مجھے منظور نہیں

دل لگا کر لگ گیا انکو بھی تنہا بیٹھنا　　بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

یعنی وہ بھی کسی پر عاشق ہو گئے ہیں اور اب رات دن تنہا بیٹھے رہتے ہیں جیسے کہ عاشقوں کا قاعدہ ہے خیر کچھ بھی ہو اس صورت میں ہمیں اپنے بیکسی کی داد مل گئی جیسے ہم اکیلے منہ لپیٹے پڑے رہتے تھے ویسے ہی انکو بھی دیکھ لیا ۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر　　آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

جناب جاوید با الفاظ دیگر اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ۔

منت کا ذکر کیا یہ اسیروں کا صبر ہے　　اپنے گلے میں آپ نے زنجیر دیکھ لی

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہر گردوں ہے چراغ رہگذار باد یاں

دنیا کا ذرہ ذرہ آمادۂ زوال ہے گویا سورج ایک ایسا چراغ ہے جو ہوا میں جل رہا ہے اور کوئی دم میں فنا ہوا چاہتا ہے۔

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں　　کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ہمارا ہجر میں دیوار و در کو دیکھنا بے سبب نہیں ہے بلکہ ہم اپنے قاصدوں کا انتظار کر رہے ہیں ایک قاصد ہوا ہے جس سے دیوار پر نظر پڑتی ہے کہ کب وہ دیوار پھاند کر ہم تک اس کی خبر لاتی ہے اور در کو قاصد کی وجہ سے دیکھتے ہیں کہ کب وہ یہاں

پہونچاتا ہے۔

صبا کو نامہ بر بنانے کی بہت سے وجوہ ہین ایک یہ کہ یہ ہر جگہ بغیر روک ٹوک جاسکتی ہے دوسرے یہ کہ صبا خوشبو وغیرہ منتشر کرتی ہے اور ایک جگہ کی ایک دوسری جگہ پہونچاتی ہے وغیرہ وغیرہ یہ مضمون اس قدر مستبذل ہوگیا ہے کہ اب واجب الترک ہے

وہ آئین گھر مین ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہین

یعنی وہ اور ہمارے جھونپڑے مین آئین یہ قدرت الٰہی ہے اسیوجہ سے حالت حیرانی مین کبھی ہم انکو دیکھتے ہین اور کبھی ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہین کہ یہ منہ اور مسور کی دال چہ نسبت خاک را با عالم پاک مصرعہ ثانی اس قدر بے تکلف واقع ہوا ہے کہ اس سے زیادہ سلیس کرکے لکھنا غیر ممکن ہے۔

لگے نظر نہ کہین اسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیون مرے زخم جگر کو دیکھتے ہین

لوگ از راہ ہمدردی میرے دل کے کاری زخم کو دیکھ کر قاتل کی چابکدستی کا خیال کرتے ہین مگر مین ڈر رہا ہون کہ کہین اس کے دست و بازو کو نظر نہ لگجائے یہ شعر مقبول عام ہے اور تعریف سے مستغنی ہے۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھین — ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہین

تیری کلاہ کے موتیون کی چمک دمک پر کیا نگاہ ڈالین ہم موتیون کے نصیبہ کا خیال کر رہے ہین کہ انکا بخت بلند کیسے اوج پر ہے جو تیرے گوشہ کلاہ تک ان کی رسائی ہوئی۔ اسی زمین مین ذوق مرحوم کی غزل ہے جس کا مطلع بے مثل ہے ؎

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہین — وہ آج بزم مین دیکھین کدھر کو دیکھتے ہین

نہین کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہین — شب فراق سے روز جزا زیاد نہین

یہ بات نہین ہے کہ مین قیامت کا منکر ہون بلکہ اس کے آنے اور اس کی تکالیف اور شدائد کو اپنی شب فراق کی سختیون سے زیادہ تکلیف دہ نہین سمجھتا ایک سیر اشعر کہ

برا ہو شامِ غم کا اسنے کا ذکر دیا مجسکو — مین قایل ہی نہین اب روزِ محشر کی درازی کا

کوئی کہے کہ شب مہ مین کیا برائی ہے — بلا سے ٓاج اگر دن کو ابر و باد نہین

ابر و باد مین شراب نوشی کا مزہ ہے مگر آج دن مین اگر کالی کالی گھٹا ئین آسمان پہ چھائی ہوئی نہیں ہین اور اس کے باعث سے شراب نوشی مین بے لطفی ہے تو کیا پروا ہے اس کا نعم البدل تو موجود ہے رات کو چاندنی ہوگی اس سے بھی وہی ابر و باد کا لطف حاصل ہوگا۔

جو آؤن سامنے انکے تو مرحبا نہ کہین — جو جاؤن اںسے کہین کو تو خیر باد نہین

وہ میرے ساتھ اس بے التفاتی سے کام لیتے ہین کہ اگر کبھی بزم مین جاتا ہون تو یہ نہین کہتے کہ آئیے تشریف لائیے جاتا ہون تو کبھی خدا حافظ ان کے منہ سے نہین نکلتا۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہون مین تو کہتے ہین — کہ آج بزم مین کچھ فتنۂ و فساد نہین

اول تو وہ مجھے بزم مین یاد ہی کب کرتے ہین اور اگر کبھی اتفاقاً یاد آجاتا ہون تو یہ فرماتے ہین کہ آج محفل مین کچھ فتنہ و فساد نہین ہو رہا ہے شاید وہ مفسدہ پرداز نہین آیا۔ گویا یاد بھی کرتے ہین تو اس طرح کہ جس سے نہ یاد کرنا اچھا۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گداے کوچۂ میخانہ نامراد نہین

یہی نہین ہے کہ شراب خانہ کے فقیر کو بس عید ہی کے دن شراب ملے۔ عید کے دن کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ عید کے دن عموماً صدقہ فطرہ وغیرہ دیا جاتا ہے لیکن وہان اور دنون مین بھی فقیر کو کچھ نہ کچھ مل ہی رہتا ہے اور وہان کا فقیر کبھی نامراد نہین رہتا۔ ایک اور شعر مین اسی مطلب کو ایک نئے پہلو سے ادا کیا ہے۔

غمگین کسے نمیرود از کوئے میکدہ — تا ہم پیالۂ مہ عید عشرتی کنند

جہان مین ہون غم و شادی بہم ہمین کیا کام — دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہین

لوگ کہتے ہیں کہ جہان میں غم و شادی توام ہیں مگر ہوا کرین ہم تو وہ محروم ازل ہیں کہ ہمارا دل کبھی شاد ہی نہیں ہوا ہم ہمیشہ غم ہی میں گرفتار رہے یا یہ کہ ہم کو کبھی ایسی خوشی بھی نصیب نہیں ہوئی جو غم سے ملی ہوئی ہو۔

تم اُنکے وعدہ کا ذکر اُنسے کیون کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

گویا کوئی دوسرا شخص ہے جو غالب کو سمجھا رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم اُن کے وعدہ کا اُن سے کیون ذکر کرتے ہو کیا یہ سنکر کہ ہم کو یاد نہیں ناحق کا صدمہ اُٹھانا پڑتا ہو اس سے یہی اچھا ہے کہ اُنکا وعدہ اُنہیں یاد نہ دلایا کرو۔

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہین

تیرے گھوڑے کو صبا سے تشبیہ دیتے ہیں اس سے ہمارے مضمون کی ہوا بندھ جاتی ہے۔ صبا باندھنے سے ہوا باندھنا بہت خوب ہے۔

معشوق کو تہلکو اور ترک قدر انداز وغیرہ لکھنا شعرائے اُردو کی عادت میں داخل ہوگیا ہے حالانکہ بہت سے لکھنے والے ایسے ہون گے جو اس سے بے خبر ہون گے کہ یہ تشابیہ معشوق کے لئے خاص کیون کی گئی ہین۔ کیونکہ اگر اتفاق سے اس پہلو کو نظرانداز کردیا جاے کہ ہند کی شاعری مین عورت عاشق اور مرد معشوق قرار دیا گیا ہے۔ اور اہل ایران کی طرح امرد پرستی ہی کو مناعری کی بنا اور مرد کو معشوق کہا جاے تو بھی جہان تک تواریخ یا ہندوستان کے بھولے بسرے قصوں سے دریافت ہے یہ کہیں نہیں دکھائی دیتا کہ کسی امرد معشوق نے نیزہ بازی سیکھی ہو یا قدر اندازی سے کسی عاشق کی جان لی ہو۔ یا تلوار ہی چلائی ہو اور یہان کے عشاق کی موت محض تیل اقیون اور زہر کھانے کنوین مین ڈوب جانے پر منحصر رہی ہو بڑی کسی نے ہمت کی تو خود کو کوٹھے وغیرہ سے گرا دیا اپنے گولی مار لی۔ چاقو مار لیا۔ یہان کے معشوق اگرچہ ہندی شاعری مین مرد اور عورت عاشق قرار دی گئی مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی برعکس معاملہ تھا۔ بہت کم ایسی بے حیا عورتیں ہندوستان مین پیدا ہوئی ہین جنھون نے غیر مردون کے عشق کو نصب العین قرار دیا۔ یہان تک کہ عشقیہ ہی تعداد میں کالمعدوم ہین جنھون نے شوہر پرستی کے جوش مین اپنے اصلی اچھے جذبات کو شاعری کے ذریعہ سے مشتہر کرکے خواہ کو

اس سے آگاہ کیا ہو۔ انکا عشق انکی محبت کیسی ہی برانگیختہ ہوئی ہو مگر زیادہ تر سینہ کی چہاردیواری میں محدود رہی ہے اُنھوں نے دنیا کو اپنے خیالات سے آگاہ کرنا کبھی اپنا فخر نہیں سمجھا مگر بہاشا اور ہندی شاعری کے مٹ جانے کے بعد بھی اگر خیال فرمایئے تو اردو شاعری جو فارسی کے قدم بقدم چلی ہے اسکے شروع ہونے کے وقت سے اس وقت تک کوئی دور ایسا نہیں آیا کہ کوئی جنگجو قوم معشوق بنکر یہاں رہی ہو۔ اور جنھوں نے تیر تلوار و ان نیزوں وغیرہ سے عاشقوں کا خون بہایا ہو۔ عربی ترکی گھوڑوں پر چڑھ کر بازاروں میں نکلے ہوں۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب عرب کی شاعری زوال پذیر ہوئی اور فارسی شاعری معرض ظہور میں آئی۔ اتفاق سے وہاں ترک غلام بہت کثرت سے تھے جو نہایت حسین تھے چونکہ اہل ایران کا شعار بنا ہوا تھا عیش و طرب کا دور دورہ تھا چنانچہ یہ غلام بھی اس مصرف کے لئے نہایت موزوں سمجھے گئے۔ امرا کی مجالس عشرت میں ساقی گری اور بزم آرائی یہی کرتے رہے۔ ایرانیوں کو امرد پرستی بھی مرغوب تھی اس لیے یہی لوگ بالآخر مستقل معشوق قرار پائے اور شعرا کو ایک مستقل دل لگی کا ذریعہ ملتا آیا۔

معتصم باللہ کے زمانہ میں فوج میں حسین اور خوشرو ترک بھرتی کئے گئے تھے۔ اسی لحاظ سے شعرا کے لیے ع

سمند ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا

کا مضمون ہوا جہاں ترکوں کو حسین کہا گیا تھا وہاں اُن کی معشوقی کی صفات میں جنگجوئی قدر انداز تیغ زنی وغیرہ کا بھی اضافہ ہوگیا اور اس کثرت سے یہ مضامین نظم ہونے لگے کہ بڑے بڑے شعرا اس اثر سے خود کو نہ بچا سکے۔

ہماری شاعری کو جہاں فارسی والوں سے ترکیبیں اور اور باتیں ملی ہیں یہ بھی ملگئی۔ حالانکہ چند دور کے بعد ان مضامین کا ایران کی شاعری میں اثر کم ہوتا گیا۔ اور وہ عرفی ظہوری۔ نظیری۔ صائب وغیرہ کے زمانہ میں بہت کم رہ گیا۔ مگر اردو میں آج تک وہی مضمون پلاسے بیدرمان کی طرح لگتے ہوئے ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی لکھنے کے قابل ہے کہ اس امرد پرستی اور خلاف فطرت فعل سے اہل ایران کے طبائع اور اُن کے افعال قبیح ٹھہرتے ہیں۔ مگر اُن کی شاعری پر کوئی نکتہ چینی نہیں کیجا سکتی اس لئے وہ جیسا کچھ دیکھتے تھے ویسا لکھتے تھے۔ اور اس کا نقشہ اتار کر دیکھتے اور دکھاتے تھے

مگر ہمارے شعرا میں تو بہت سے ایسے ہوں گے کہ جنھوں نے ترکوں کی صورت بھی نہ دیکھی ہو۔ مگر اُن کے نام اور ان کی وہی معشوقانہ حالت محکومی کی حاکمانہ صفات۔ قدر اندازی گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلنا شہسواری کا فن قتل غارتگری وغیرہ وغیرہ سب بے تکلفی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں۔ جو کسی حد تک بھی جائز قرار نہیں دی جا سکتی ہیں۔ اور یہی وجوہ ہیں جو ہماری شاعری میں اثر نہیں پیدا ہونے دیتے اور دوسری قوموں کی نظر میں ہمیں بھبی کا خطاب دلاتی ہیں۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

کہتا ہے کہ آہ میں کہیں اثر ہوتا ہے یا عاشق کی آہ سے کوئی کام نکلتا ہے یہ صرف ہماری ہوا بندی ہے اس سے بس ہم اتنا کام لیتے ہیں کہ ذرا مضمون میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے۔

تیری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پابہ حنا باندھتے ہیں

اے عمر تو اتنی تیز رو ہے کہ تیرے مقابل میں برق کی کوئی ہستی نہیں تو بہت جلد گزر جاتی ہے اور وہ دیر میں گزرتی ہے۔

قید ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

قید ہستی سے کسی صورت میں رہائی نہیں ہو سکتی آدمی باوجودیکہ معدوم تھا اور معدوم ہو جائے گا مگر پھر بھی ہستی کی قید سے آزادی نہیں ہے اس کی مثال اشک کی ہے کہ لوگ اس کو بے سر و پا کہتے ہیں مگر پھر بھی باندھتے ضرور ہیں ہستی سے آزادی نہیں ہو سکتی یا اشک کے مضمون کو شعرا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل مست کب بند قبا باندھتے ہیں

پھول نشۂ رنگ سے مست ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے اس کی واشد اور شگفتگی کا یہی سبب ہے مست بند قبا کب باندھتے ہیں۔

غلطیہائے مضامین مت پوچھ　　لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

یعنی شعرا کے مضامین کی غلطیوں کا کیا اظہار کیا جائے بس کچھ نہ پوچھئے نالہ جو کبھی رسا ہوتا ہی نہیں اور جو عنقا صفت معدوم ہے اس کو رسا باندھتے ہیں۔
غلط　ی کا لفظ ہے جو فاعل اور مفعول دونوں کے معانی پیدا کرتا ہے مگر ہندیوں نے یائے مصدری کا لگانا بھی صحیح سمجھا ہے اس صورت میں جمع اسکی درست ہوگی مگر اکثر شعرا و فصحا اس کو جائز رکھتے ہیں۔

اہل تدبیر کی واماندگیاں　　آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

عقلا کی واماندگیاں دیکھئے کہ اگر پاؤں میں چھالا پڑ جاتا ہے تو اس پر حنا باندھتے ہیں یعنی ایک تو چھالا ہی ایسی چیز ہے کہ چلنے نہیں دیتا دوسرے اس پر مہندی لگانا غلط در غلط ہے یعنی مشہور اور ظاہر ہے کہ حنا لگا کر چل نہیں سکتا۔ اس میں یہ بھی مفہوم ہے کہ اہل جنون کا علاج برعکس کرتے ہیں اور ان سے کچھ بن نہیں پڑتا۔

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب　　ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

معشوق ظاہر میں سادے ہیں مگر در اصل بڑے ہوشیار ہیں ہم سے بیوفائی کرنے کے لئے پیمان وفا باندھتے ہیں یا یہ کہ ہم کو ذرا تغیر لہجہ کے ساتھ پڑھنا چاہئے یعنی ہم سے اور پیمان وفا کہ جو ان کی ہر ایک بات کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خوب کی جمع خوباں اب بغیر کسی ترکیب فارسی کے لکھنا برا ہے اور غیر فصیح ہے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد　　وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

گویا اس شعر کا قائل کوئی دوسرا شخص ہے جو کہتا ہے کہ زمانہ اسد کی جان پر جو مصیبتیں ڈال رہا ہے وہ اس کی آرزوؤں کو دیکھتے ہوئے کم ہے وگرنہ ہم کو تو اس سے بھی بہت زیادہ اس سے تکالیف پہونچنے کی امید تھی اور ہے۔ اس

مین بجان اسد مضاف و مضاف الیہ ہیں۔ اس مین (ب) کو تسمیہ بھی مانا جا سکتا ہے۔ مگر اس حالت میں (بجان) اردو کے لئے ایک غیر مانوس ترکیب ٹھہرے گی۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کاش میں پتھر ہوتا تو ہمیشہ تیرے دروازے پر پڑا رہتا یعنی تیرا سنگ آستان بنتا۔ ایسی زندگی پر خاک پڑے کہ میں پتھر نہیں ہون۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا ہمیشہ تیرے ہی در پہ میں نہیں پڑا رہتا ہون افسوس ہو اور ایسی زندگی پہ لعنت ہے کہ پتھر نہیں ہون اور پتھر کی حالت ہو گئی ہے۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ پتھر کی طرح پڑا تو ضرور رہتا ہون لیکن تیرے در سے دور رہتا ہون میں پتھر نہیں ہون کہ یہ گوارا کرون۔

چوتھا مفہوم یہ ہے کہ ہمیشہ اب میں تیرے دروازے پر پڑا رہتا ہون ایسی بے حیائی کی زندگی کس کام کی کہ لوگ مجھے آوازے کسیں۔ اور طعنے دیں اور میں برابر سنا کرون میں آدمی ہون پتھر تو ہون نہیں۔

ایک مفہوم یہ ہے کہ تیرے در پہ میں ہمیشہ نہیں پڑا رہتا ہون تو یہ غلط سمجھا ہے بلکہ میرا مطلب اس پڑے رہنے سے یہ ہے کہ جیسی زندگی میں گذارتا ہون باوجود اس کے کہ پتھر نہیں ہون۔ ہون آدمی مگر اس پر خاک پڑ جائے تو اچھا۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اس گردش شبانہ روز سے میرا دل کیوں نہ گھبرا جائے آخر میں پیالہ و ساغر تو ہون نہیں جن کے لئے گردش لازمی ہے انسان ہون یا یہ کہ اس پریشان کن زندگی سے دل کیوں نہ گھبرائے۔ افسوس کہ میں انسان ہون پیالہ و ساغر نہیں ہون کاش وہی ہوتا۔

ہمارے شعرا کی کچھ ایسی عادت ہوگئی ہے کہ جسکو طبیعت ثانیہ کہین تو کچھ بیجا نہین ہے کہ چند ایسے الفاظ جن کے معانی عام ہین مگر اُن کے مطالب کو محدود و خاص سمجھ لیا گیا ہے گویا انکا ذہن ایک قطب نما بن گیا ہے کہ کہنے والا کچھ کہے مگر انکا ذہن فوراً اُسی طرف کو منتقل ہو جائے گا۔ مثلاً پیالہ و ساغر جہان شاعر دیکھے گا اُس سے فوراً شراب کا ساغر و پیالہ۔ کل سے فردائے قیامت اور ازل۔ تیشہ سے تیشۂ فرہاد۔ چاہ سے چاہ کنعان۔ محمل سے محمل لیلےٰ وغیرہ وغیرہ مراد ہونگی اور فوراً انہین کا قیاس کیا جائے گا۔ اگرچہ کہنے والے بھی ایسے ہی ہین کہ وہ بھی جب کہتے ہین تو جو سمجھا جاتا ہے وہی اُن کا ارادہ بھی ہوتا ہے۔ مگر احیاناً قایل اور کچھ بھی کہے تب بھی سامع کو وہی خیال آئے گا۔ چنانچہ یہین خیال کیجئے کہ پیالہ و ساغر سے ایک سمجھنے والا غیر ذی روح اشیا کو قیاس کرے تو کیا غلط کرتا ہے۔ مگر نہین سب سے پہلے جو خیال آئے گا وہ یہ ہوگا کہ پیالہ و ساغر سے وہ ساغر مراد ہین جو دور شراب مین مستعمل ہین۔

یارب زمانہ مجکو مٹاتا ہے کس لئے لوح جہان پہ حرف مکرر نہین ہون مین

اے خدا زمانہ مجکو لوح جہان سے کیون مٹاتا ہے مین کوئی حرف مکرر نہین ہون جس کے مٹانے کی ضرورت پڑے۔ واضح ہو کہ مولانا نظم صاحب نے مکرر کے معنی غلط کے لکھے ہین حالانکہ مکرر کے معنی وہ لفظ ہے جو عبارت مین بہ تکرار لکھا جائے یا سہواً لکھا جائے۔ اور غلط وہ ہے جو بے ضرورت ہو۔ تو اگر بجائے غلط کے مکرر کہا جائے تو اس مین غلط کے معنی پیدا ہو سکتے ہین مگر غلط کہکر مکرر کے معنی مراد نہین لیے جا سکتے میری مراد یہ نہین ہے کہ مولانا اس لفظ کے معنی نہین جانتے بلکہ صرف بیان معانی مین ایک غلطی ہوئی ہے۔

مفہوم غالب صرف یہ ہے کہ اگر مین ایسا لفظ ہوتا جو غلطی سے مکرر لکھا گیا ہو تو اُس کے مٹانے کی ضرورت تھی۔ یا اُس لفظ کے مٹانے مین کچھ حرج نہین ہے جو آیندہ عبارت مین کہین آئے اور اس کو اس وقت بے ضرورت سمجھا جاوے مگر یہ کچھ بھی نہین ہے اور پھر بھی مجکو مٹایا جاتا ہے آخر اس کا کیا سبب ہے بخلاف

اس کے اگر مکرر کے معنی غلط کے لئے جائین تو صرف وہی معنی ہوتے ہین اور کچھ نہین
مگر غالب نے مکرر کے معنی غلط کے نہین لیے ہین -

حد چاہیے سزا مین عقوبت کے واسطے آخر گناہگار ہون کافر نہین ہون مین

ہر گناہ کی سزا کی حد چاہیے آخر مین گناہ گار ہون کافر نہین ہون جسکی سزا کی کوئی حد نہو۔ اہل عجم کافر کی (ف) کو عموماً مفتوح نظم کرتے ہین - اردو مین بھی عموماً یہ لفظ بفتح ف مستعمل ہے۔ ذوق مرحوم کہتے ہین سه

اے ذوق دخت رز کو تو ہرگز نہ منہ لگا چھٹتی نہین ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کس واسطے عزیز نہین جانتے مجھے لعل و زمرد و زر و گوہر نہین ہون مین

اس شعر کو نعتیہ بھی قیاس کر سکتے ہین، گویا جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتا ہے کہ آپ کو زر و گوہر سے نفرت ہے مگر مین تو وہ نہین ہون آپکا ایک غلام ہون پھر میرے عزیز نہ رکھنے کی کیا وجہ ہے -
دوسرا پہلو یہ ہے کہ معشوق سے کہا گیا ہے کہ اگر تم زر و گوہر سے مستغنی ہو تو مجھے کیون نہین عزیز رکھتے مین تمھارا عاشق صادق ہون -

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھون سے کیون دریغ رتبے مین مہر و ماہ سے کمتر نہین ہون مین

اس مین بھی نعت اور معشوق سے خطاب دونون مراد ہو سکتی ہے - رسول اللہ سے عرض کیا ہو کہ تم آخر قدم میری آنکھون سے کیون دریغ رکھتے ہو کہ تمنے شب معراج مین مہر و ماہ کو شرف قدم بوسی سے مشرف کیا ہے اور مین رتبہ مین ان سے کمتر نہین ہون اس واسطے کہ مجھے آپ کی قدم بوسی کی تمنا ہے -

کرتے ہو مجھکو منع قدم بوس کس لئے کیا آسمان کے بھی برابر نہین ہون مین

یعنی شب معراج مین آپ نے آسمان کو قدم بوسی کا اعزاز بخشا تو مین مستحق قدم بوسی ہون کیا رتبہ مین آسمان کی بھی برابر نہین ہون حالانکہ اس سے بھی بہت

زیادہ میرا رتبہ ہونا چاہیے۔ عدہ یہ سہو کرتے اور تشبیہ دیتے ہین اور تیر

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا یون سے مضمون کو غالب کہتا ہے کہ ایخدا

ہاتھ کاٹ یہان تک اچھا تھا کہ اُن کے واسطے

غالب ایک ذہ دن بیتے کہ یہ کہ خیرات تھا اور اس صورت مین جلد تر میرا

تھے کہ مین نوکر نہین ہون مگر اب وہ زمانہ گزر یہ رنگ لائی کہ انکو میری جانب سے

بیاہ کو دعائین دو جس نے تم کو اس غم سے آزاد

ت بنا دیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ ہر وقت

سب کہان کچھ لالہ و گل مین نمایان ہو گئین

نب بھی یہ حالت ہے کہ مین خیال کرتا

نا مرا جاتا ہون آخر اس کا کیا سبب

نیرنگ فلک نے اتنی پیاری پیاری تیر کا کام دے رہی ہین نگاہون کا

حد و حساب نہین وہی صورتین سب تو خیر کیا مگر

ہوئی ہین ہائے لالہ و گل کی خوبصورتی دیکھ کر پہچاننے سے مراد یہ ہے کہ اس قدر

ہون گی جو مٹ گئین بہت ہی خوب شعر کہا ہے۔ ترگان ہو گئین۔ مگر باوجود اس

علیہ الرحمۃ نے اپنے یہان باندازِ دیگر فرماتے ہین۔

ای گل چہ آمدی ز زمین گو چگونہ اند

ن نے لیا ہے ۔

مرزا رفیع السودا نے نئی صورت سے کہا ہے کوتاہی قسمت سے نشتر ہو گئے

گئے جہان کیا کیا سبزہ رو تہ خاک

ایک میرا شعر اسی قسم کا ہے ۔ میری آہین بخیۂ چاک گریبان ہو گئین ۱۱

نگ و صدف مین لعل و گہر بن کے رہ گئے

ٹھہرنا چاہا۔ لیکن مین نے ان کو ٹھہرنے

یاد تھین ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیان

نہ دی آہین میرے سینہ مین ایسی پیچیدہ

کی صورت مین منتقل ہو جاتا ہے

اے محبوب بزم آرائی کبھی تیری طرح ہم کو بھی تھے جو بار بار ابھرتا ہے تشبیہ دیکر

آرائیان کرتے تھے لیکن اب وہی بزم آرائیان اور نیا مضمون ہے جس کا حاصل

دے رہی ہین یعنی اب وہ سب بھول گئے ہستی جنونانہ حالت کو اچھی حالت مین

تقابل کی جو صورت دکھائی گئی ہے انہین اور اسی ضبط سے یہ نتیجہ نکالا کہ

تھین بنات النعش گردون دن کو پردہ مین نہان

شبہ پر ہوتا ہے اور آہ کا مقام بھی جو

سے چارشارسے جنازہ اور تیں جنازہ
ن کو آسمان سکے پردہ مین پنہان تھین

...حتیٰ ہے اس سے مراد یہ نہین ہے کہ
اس قسم کے الفاظ کی جمع یونہی بناتے ہین جیسے
ہ نے ایسے اکثر الفاظ کو قریب قریب مونث مانا

قطب لادوام جنازہ بر سر دختر است

یا ہے اسی صورت سے اُن کو اپنی زبان مین لڑکیان
سے پردہ ثابت کیا گیا ہے۔ ظاہر ا معشوق کا کوئی
نے ایک بات رکھی ہے گویا کہ یہ شعر اپنے معشوق کی
حسن بڑی پردہ دار تہین۔ دن کو منہ چھپائے رہتین
ایسے ہو کہ شب وصل مین بہی مجھسے شرمائے
یا یہ کہ یہ ایک عاشقانہ چال ہے کہ معشوق سے
تام عریان اور بے پردہ ہونے کا نہین ہے دیکھو
آخر شب کو اگر بے پردہ ہونے کا

لیکن آنکھین روزن دیوار زندان ہو گئین

نے ظاہرا قید مین حضرت یوسف علیہ السلام کی
مین دیوار زندان مین روزن ہو گئین جس سے انکا
شق کا نمونہ ہے۔ مولانا نظم لکھتے ہین کہ آنکھین

ہیر زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعان ہو گئین

دنیا بھر کے عاشقوں کا قاعدہ یہ ہے

ہیں مگر برعکس سب کے زلیخا اپنے رقیبوں سے

ایسا محو بنا دیا کہ بجائے ترنج کے اپنے ہاتھ کاٹ

حسد کی آگ مشتعل ہو مگر وہ خوش ہوئی کہ جراب

پر عاشق ہوئی۔

بہے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق

اپنے ناصحوں اور دوستوں سے خ

سے مجکو منع نہ کرو یہ شب یلدائے فراق ہے اگر

رہیں گی تو کم از کم میں اُن سے یہ فائدہ اٹھاؤں گا

شمع میں روشن ہو رہی ہیں۔ ادب اردو کے

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام

اگر یہی پریزاد جنپر ہم عاشق ہیں جنت

ان سے ہم خوب بدلہ لیں گے۔

یہاں یہ بات قابل الذکر ہے کہ دہ گیا

اناث سے سوا لاکہ اردو فارسی میں جو شاعر

یہ ہے کہ غزل میں نہ معشوق کو مذکر کہا جائے نہ

ہے مگر اردو شاعری کا کچھ ایسا رنگ بگڑا

ہے اور مشہور شعرا کے دیوان اس سے بھرے

ہے افصح الفصحا جناب داغ مرحوم نے جو ہیں کیا

حتراز فرمایا ہے۔

ں کو اکثر ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ دہلوی شعرا سے زیادہ

مرد ہوتے در اصل انکی شاعری کا اصول یہی ہے کہ معشوقہ

دیا گئی ہو اتنی کہ ان کی شاعری میں آیا ہے وہ معشوق ایک

ن ہے اکثر محترز رہے ہیں اور ان کی شاعری قریب
بنا ردیف کی مجبوری سے وہ یہ سب باتیں لکھ گئے
ہے۔ چنانچہ دوسرے شعر سے بھی یہ پتہ چلتا ہے۔

آہنا تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

اہے۔ اسی کا دماغ دنیا کی بہترین خوشبوئیں
لا دماغ عرش اعلیٰ پہ ہے اسی کی راتیں آرام سے
انے کی مستحق ہیں جس کا ہم خواب تو ہے اور
یاری زلفیں بکھری ہوئی ہیں۔
ن مردوں کے ایسے گھنے اور لمبے بال بہت ہی کم
خطاب دیدیا جائے اس سے صحیح پتہ بھی چلتا ہو
یوں وغیرہ اور زنانوں ہجڑوں کا ہے بہرحال
ان زلف رکھنے کا شوق ہو۔ یہ شعر کیسا ہی ہو مگر بہترین
ین ہو سکتا۔

ا گیا بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں
آن

ہے گویا مکتب کھل گیا جیسے ہی کہ مجکو دیکھا
یا اس لیے کہ ان کو بحیثیت عاشقی کے ایک
۔ یا اس لیے کہ میں ایک دیوانہ تھا مجکو دیکھکر
نیا۔ یا یہ کہ میں ایسا فصیح البیان تھا کہ میری
بھی شروع کردی اور یہ قاعدہ ہے کہ بلبل
ہے۔ حالی سے
ست عندلیبان ہر چہ میگویند مضمون از منست

کے یا جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

نگاہ کو لوگ تیر سے تلوار سے استعارہ کرتے اور تشبیہ دیتے ہین اور تیر یا تلوار کا زخم زبردست اور گہرا ہوتا ہے۔ اسی مضمون کو غالب کہتا ہے کہ ایخدا اس کی نگاہین بمنزلہ تیغ یا تلوار کے تہین اور یہان تک اچھا تہا کہ اُن کے وار سے دل کے ٹکڑے ہو جاتے یا دل کے پار ہو جاتا اور اس صورت مین جلد تر میرا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر میری کوتاہی قسمت (بدقسمتی) یہ رنگ لائی کہ انکو میری جانب سے اتنا کوتاہ کیا کہ انہین تیر جیسی نگاہون کو مژگان بنا دیا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ ہر وقت ایک کھٹک میرے دل مین رہتی ہے مگر اب بھی یہ حالت ہے کہ مین خیال کرتا ہون کہ وہ دل کے پار ہوئی جاتی ہین اور مین مرا جاتا ہون آخر اس کا کیا سبب ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی ہین اور پھر بھی وہ تیر کا کام دے رہی ہین نگاہون کا مژگان ہو جانا ایک لطف رکھتا ہے۔

مولانا نظم لکھتے ہین کہ مژگان ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اس قدر میری طرف سے اس کی نگاہین کوتاہ ہین گویا مژگان ہوگئین۔ مگر باوجود اس کوتاہی کے دل کے پار ہوئی جاتی ہین۔

یہی مطلب قریب قریب مولانا حسرت نے لیا ہے ؎

دلکو توڑا ابروؤن نے اور گلے کاٹے نہین   نیمچے کوتاہی قسمت سے نشتر ہوگئے

بسکہ روکا مین نے اور سینے مین ابھرین پے بہ پے   میری آہین بخیۂ چاک گریبان ہوگئین (۱۱)

بار بار میری آہون نے زور کیا اور اُبھرنا چاہا۔ لیکن مین نے اُن کو اُبھرنے نہ دیا اور ضبط سے کام لیا۔ اسی وجہ سے میری آہین میرے سینہ مین ایسی پیچیدہ ہو کر رہ گئین جیسے رشتۂ بخیہ گریا بار بار اُبھر کر بخیہ کی صورت مین منتقل ہو جاتا ہے میرے نزدیک آہون کا اُبھرنا اور رشتہ بخیہ سے جو بار بار اُبھرتا ہے تشبیہ دیکر بخیہ کی صورت مین منتقل ہونا ایک تشبیہ بدیع اور نیا مضمون ہے جس کا حاصل یہ ٹھہرتا ہے کہ ضبط کی وجہ سے مین نے اپنی مجنونانہ حالت کو اچھی حالت مین منتقل کیا۔ یعنی ضبط کیا کہ آہین سینہ مین رہین اور اسی ضبط سے یہ نتیجہ نکالا کہ چاک گریبان کو بخیہ کیا۔ چاک گریبان سینہ پہ ہوتا ہے اور آہ کا مقام بھی جب

ادعاے شاعرانہ سبب قرار دیا آہ کے ضبط سے اُدھر بخیہ ہوئی اور اُدھر چاک گریبان میں بخیہ ہو گئی ایک لطیف نکتہ اس میں یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ چاک گریبان (جس سے غلطی سے صرف گریبان ہی مراد لیا جاتا ہے) پیراہن کے لئے ضروری اور اس کا سی دینا ایک حرکت مجنونانہ ہے جس سے یہ حاصل نکلا کہ آہوں کو بمقتضاے ضبط میں نے روکا مگر اس سے بھی جنون کو ترقی ہوئی۔ غالباً یہ شعر بلاغت کا ایک بے مثل نمونہ ہے جس میں غور کیجیے تو کئی لطیف معانی پیدا ہوتے ہیں مگر مولانا نظم انصاف کی گردن پر کند چھری پھیر کر فرماتے ہیں۔

اس شعر میں بار بار آہ کے اُبھرنے کو اور بار بار ضبط کرنے کو رشتہ بخیہ گر کی حرکت سے تشبیہ دی ہے یعنی متحرک کی متحرک سے تشبیہ ہے اور وجہ شبہ حرکت ہے لیکن آہ کے لیے ایسی حرکت محض ادعاے شاعرانہ ہے اس سبب سے یہ تشبیہ ویسی بدیع نہیں ہے جیسے اور شعر تشبیہ متحرک کے گذر چکے ہیں۔ اور اعتبار مضمون کے شعر بے معنی ہے فارسی و اردو کے شعرا آنکھ بند کرکے اپنے مضمون کہا کرتے ہیں یہاں بخیہ اور سینہ میں جو ضلع بول گئے ہیں لطف سے خالی نہیں ہے۔

واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب　　یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

واں بروزن فع۔ متروک ہے مطلب یہ ہے کہ اگر میں بزم میں پہونچ بھی گیا تو آہ۔ اس کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا۔ کیونکہ جس قدر دعائیں اُسکی گالیاں کھا کر اُن کے مقابلہ میں اس کو دینے کے لئے لایا تھا وہ سب درباں کو دے چکا کہ اُس نے مجھے بزم میں جانے کی اجازت دی۔ یا اجازت لینے کے لئے اس کو اتنی دعائیں دینی پڑیں کہ اب کوئی دعا یاد نہیں رہی۔

ہمارے شعرا کی عادت ہو گئی ہے کہ سنگدلی کے جتنے الفاظ ہیں وہ سب معشوق کے لیے صرف کیے جاتے ہیں۔ اور جتنے دنیا بھر کے عیب ہوتے ہیں وہ سب کا مرتکب عاشق کو قرار دیتے ہیں۔ جیسے کہ ایک جگہ سید انشا فرماتے ہیں ؎

خیال کیجیے کیا آج کام ہوا ایک تار بھی گریبان مین باقی نہین رہا۔ جس سے لوگون کو زنار کا
پر اور کچھ لکھنا قریب قریب بیکار ہے تی ہیں مجھے شامل سمجھین۔
معشوق سے پرہیز واجب ہے۔

ار کر چکے — دیکھا تو ہم مین طاقت دیدار بھی نہین
جان فزا ہی بادہ جسکے ہاتھ مین

سے دیدار مین مٹا دیا۔ مگر اب دیکھتے ہین تو ہم مین اتنی بھی
جسکے ہاتھ مین جام شراب آگیا کہ سکین دیکھا صیغہ ماضی کے معنے بھی دیتا ہے اور یہ بھی
رگ جان ہو گئین اور ظاہر ہے کہ رگ جان
اگویا کا لفظ اس شعر کی جان ہے جو مبالغہ کو جانیے
کہ مبالغہ حد سے گذر جانے پر خلاف فصاحت ہو جا

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہین

نا چاہیے۔ اور دشوار کی یہ صفت ہے کہ وہ ممکن
دشوار نہین بلکہ ناممکن الوقوع ہے۔ گویا تو ہمکو

ہم موحد ہین ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ہم توحید کے قائل ہین اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ یہ آسان نہیں یعنی دشوار ہے تو یہ تو ایک آسان
ترک کر کے اوسی ایک کی طرف متوجہ ہو جائین جیسے ہوسکتے ہین مگر مشکل یہ ہے کہ تو غیر سے ملتا ہے
ایمان کے اجزا بنتی جائینگی۔ یعنی ہماری قوت ایسی ہے ہمکو صبر بھی نہین آتا۔
مراد دیگر ملل جن سے افرقہ پڑے سے یعنی رسوم و قیود

طاقت بقدر لذت آزار بھی نہین

...یت ہو بنتی جائینگی اور توحید کو ز ۲۲۵

کیا ہے جب اسنے ... غیر وغیرہ سب سے مبرا و منزہ ہے تا۔ یا عشق کسی شئے کا ضروری ہوتا ہے
...ین دلوان کوئی غرض کوئی تغیر نہیں رکھتا۔ آزار اوٹھانیکی طاقت نہیں اور عمر بغیر اس کے
...ہین مگر اتنا ضرور رہین گے اوسیقدر واحد کی صفت پر روشنی ہے

گیا — ہوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
صحرا ... اکوئی دیوار بھی نہین

جب انسان کو رنج و غم کی عادت ہو جاتی ہے تو بار معنے ... پھیل جاتا ہے ... کیا کرون
الٹے کے ایسی طرح دیکھ لیجیے کہ مجھپر اتنی مشکل پڑی دیوار بھی صحرا مین موجود ہین سے کہ اپنا
ہو گئین۔ غم سے نجات حاصل کرتا۔ ایک جگہ

کہانتک روؤں اوسکے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے   مری قسمت مین یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

گنجایش عداوت اغیار اک طرف   یان دل مین ضعف سے ہوس یار بھی نہین

دشمنون کی عداوت کی گنجایش کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے۔ یان دل اتنا ضعیف ہو گیا ہے کہ اب ہوس یار بھی اوس مین باقی نہین مصرع ثانی نہایت بلیغ ہے۔ اس سے یہ مراد نہین ہے کہ یار کی محبت اب باقی نہین رہی بلکہ مطلب یہ ہے کہ۔ اب دل سے آرزو سے وصال برداشت نہین ہو سکتی۔ اور وہ اتنی زیادہ ہے کہ میرے دل مین سما نہیں سکتی۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی عاجز ہوتا ہے تو ہر وقت چاہتا ہے کہ میری آرزو کسی صورت سے پوری ہو جا

ڈرنا لے زار سے میرے خدا کو مان   آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہین

میری رات دن کی گریہ وزاری سے ڈر۔ خدا کا خوف کر میرے نالے کچھ مرغ گرفتار کی آواز نہین ہین کہ اون کا اثر ہی نہو۔ نہین ان کا اثر ہونا بہت ممکن ہے۔

دلمین ہے یار کی صف مژگان سے روکشی   حالانکہ طاقت خلش خار بھی نہین

حالانکہ اب میرا دل اسقدر ضعیف ہو گیا ہے کہ اسمین ایک خلش خار کی بھی طاقت نہین ہے اور اسکے صدمہ اور دکھ کو بھی یہ برداشت نہین کر سکتا۔ مگر مژگان یار سے اوسی صورت سے مقابلہ کے لیے تیار رہے۔

سادگی ہے کون نہ مر جائے اے خدا   لڑتے ہین اور ہاتھ مین تلوار بھی نہین

ایسی سادگی دعائین دیتا ہے کون نہ مر جائے کہ وہ مجھ سے لڑنے کے لئے آئے ہین اور ہاتھ مین تلوار ہے شعرا کی عادت ہین گویا یہ سادگی بجائے تلوار کے ہے۔

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت مین بارہا × دیوانہ گر نہین ہے تو ہشیار بھی نہین

ہم نے اسد کو ظاہر و باطن مین بہت سی مرتبہ دیکھا ہے تم جو کہتے ہو کہ وہ دیوانہ

نہیں ہے تو اگر وہ دیوانہ نہیں ہے تو کچھ ہوشیار بھی نہیں ہے۔

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں — ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

چونکہ کوئی زخم میرے جسم کا ایسا نہیں ہے جسمیں ٹانکے دیے جا سکیں اسواسطے بخیہ گر کی سوئی میرے حال پر روتی ہے۔ اور نا امیدی کے آنسوؤں کا تار اوس کی آنکھ میں رشتہ بن گیا ہے۔ چونکہ متواتر روتی ہے اسواسطے آنسوؤں کا تار بنا۔ اور اسکو رشتہ کہا گیا۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی — کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

میں اسقدر رویا کہ میرے آنسوؤں کے سیلاب نے میرے گھر کو تباہ کر دیا اور اب روزن میں کفِ سیلاب روئی کی طرح موجود ہے جس سے لذتِ تماشا و سیر بھی باقی نہیں رہی ہے۔

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں — نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرۂ خوں تن میں

میرے ہر قطرۂ خون پر معشوق کا نام کھدا ہوا ہے۔ اور یہ بیداد کاوشہائے مژگان نے کھودا ہے اسی لئے اب میرا جسم جسم نہیں ہے بلکہ بیداد کاوشہائے مژگان کا امانت خانہ بن گیا ہے۔ دیکھئے اسی مضمون کو تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ایک جگہ پہلے ادا کیا ہے فرماتے ہیں ؎

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خون جگر امانت مژگان یار تھا

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شبِ مہ ہو جو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

میرے سیہ خانہ کی ظلمت کا حال کس سے بیان ہو سکتا ہے یہ لطف ہے کہ اگر اس کی دیواروں کے روزنمیں پنبہ رکھدے تو اس سے بھی چاندنی پھیل جائے یعنی اگرچہ وہ ایسا سامان ہے جس سے تاریکی بڑھ جانے کا احتمال ہے مگر ظلمت کی حد یہ ہے کہ اوس ایک ادنی سی سپیدی سے بھی ماہ کا اثر پیدا ہوجاتا ہے یہی مضمون ہے۔

۵ کیا کہون تاریکی زندان غم اندھیر ہے — پنبہ نور صبح سے کم جسکے روزن مین نہین

نکوہش مانع بیربطی شور جنون آئی — ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن مین

میرے احباب جو وحشت مین مجھے ملامت کرتے ہین اوس سے میرے شور جنون کی بیربطی جاتی رہی ہے اور گویا اون کا ہنسنا (یعنی خندۂ دندان نما) میرے جیب و گریبان کیلیے بخیہ کا کام دے رہا ہے -

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے — پر افشان جوہر آئینہ مین مثل ذرّہ روزن مین

اُس مہروش کے عکس کے سامنے جوہر آئینہ اسطرح سے پرافشان ہوئے اور اڑنے لگے جیسے کہ ذرے آفتاب کی شعاع سے روزن مین اڑنے لگتے ہین -

نجانون نیک ہون یا بد ہون پر صحبت مخالف ہے — جو گل ہون تو ہون گلخن مین جو خس ہون تو ہون گلشن مین

مین یہ تو نہین کہہ سکتا کہ مین اچھا ہون یا بُرا ہون مگر یہ ضرور جانتا ہون کہ جیسا مین ہون ویسی صحبت مجھے میسر نہین ہے اگر مین گل ہون تو اس صحبت کو جو مجھے حاصل ہے مین گلخن سمجھتا ہون - اور اگر خس ہون تو گویا گلشن میں ہوں جو اسکی جگہ نہین بہرحال صحبت میرے حسب حال نہین ہے -
گلخن و گلشن کے ایسے ہی مضمون مختلف طریقون سے مصنف نے کئی جگہ لکھے ہین - جو گذر چکے -

ہزارون دل دیئے جوش جنون عشق نے مجھکو — سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خون تن مین

سودائے جنون کی وہ زیادتی ہوئی کہ میرا ہر قطرۂ خون تن مین سویدا بن گیا - اور اس صورت سے گویا مجھے سیکڑون دل مل گئے گویا جسقدر قطرۂ خوں میرے جسم مین ہین وہ سب دل ہین - اور ہر دل میں سودائے جنون بھرا ہے اور ہر دل مین معشوق کی یاد ہے یہ شعر بیت الغزل ہے -

ممنونی تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں   خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

اے اسد میں معشوقوں کی تاثیر الفت کا اسیر ہوں اونکا ہاتھ جو میری گردن میں مہربانی سے پڑا ہے وہ میری گردن کے لئے طوق بن گیا ہے۔ تاثیر الفت کا لفظ خصوصًا قابل داد ہے جس سے خمِ دست نوازش کو طوق بنا لیا گیا ہے۔

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں   سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

دنیا کے انواع واقسام کے کھانوں میں ہمیں کچھ لذت نہیں آتی سوائے جگر کے خون کے کوئی شے ہمکو مرغوب نہیں ہے اور حال یہ ہے کہ جگر میں اب کچھ باقی نہیں رہا۔ (سوا اب قریب قریب متروک ہو گیا ہے۔

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لیجائے   وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

مگر بمعنی شاید۔ یعنی ہمارے بال و پر میں تو طاقت باقی نہیں رہی ہے کہ اڑ کر گلستان یعنی کوچۂ دلدار تک پہونچیں شاید مرنے پر ہماری خاک کو ہوا اڑا کر وہاں لیجائے۔

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے   کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

یہ کون بہشت شمایل آج سیر باغ کے لئے آتا ہے کہ سوا سے پھولوں کے رہگذر میں اور کچھ نظر نہیں آتا۔

بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا   اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

اگر اُسے میرے اوپر رحم نہ آیا تھا تو کچھ مجھی کو اپنے حال زار پر ترس آتا کہ اُس کے عشق سے باز آتا اور اس گریہ وزاری سے ہاتھ اُٹھاتا۔ مگر یہاں یہ بھی نہیں۔ نہ وہ مانتا نہ دل مانتا ہے۔ مولانا نظم لکھتے ہیں کہ نفس کو بے اثر کہکر پھر کہنا کہ اثر نہیں اس کی تاویل باعتبار معنی کے مشکل ہے۔ محاورہ میں ٹھیک ہے۔ میرے نزدیک مولانا کی تقریر بھی غالب سے کم نہیں کہ غلط بھی فرمایا ہے اور پھر درست بھی کہا ہے حالانکہ غالب نے تو صرف

یہی کہا ہے کہ میرے نفس میں اثر نہیں بے اثر ہے۔

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش — شراب خانے کی دیوار و در میں خاک نہیں

شراب خانہ کی شراب میکش سب ختم کر چکے اور اب وہاں خاک بھی باقی نہیں ہے مگر نشہ کی ترنگ میں آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوئی ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ فصل بہار آ رہی ہے اور اس کا خیال کہ اس موسم میں بغیر شراب کے کیونکر گذارہ ہوگا۔ اون کو خراب کئے ہوئے ہے اور حال یہ ہے کہ میخانہ میں کچھ باقی نہیں ہے وہ بالکل تباہ ہو چکا ہے۔

یا لوگ سمجھتے ہونگے کہ میخانہ کو دیکھکر میکش مست ہیں یہ خیال غلط ہے میخانہ میں تو نقش و نگار کجا دیوار و در میں جان بھی باقی نہیں ہے۔ اُس سے کیا مست ہونگے مگر جلوۂ گل کے خیال نے اُن کو مست کر رکھا ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ — سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

عشق کی لوٹ مار اور دستبرد سے میں بہت ہی محجوب ہوں کیونکہ گھر میں سوائے حسرت تعمیر کے کچھ نہیں کہ وہ اُسے خراب کرے خاک نہیں اسجگہ ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ع گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد — کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

سن عتب

ہمارے شعر کیا ہیں ایک دل لگی ہے۔ بس زمانہ کی ناقدری سے معلوم ہوگیا کہ ہنر کے ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ غالباً یہ غزل اُس زمانہ کی کہی ہوئی ہے جب مشکل پسندی کے سبب سے لوگوں نے غالب پر بے معنی اور مہمل گوئی کا الزام لگایا تھا۔ اور بعض ظرافت مآبوں نے یہ قطعہ کہکر عین مشاعرہ میں غالب کے سامنے پڑھا تھا مجھے اچھی طرح یاد نہیں مگر ایک شعر لکھتا ہوں۔

بزم مین اُسکے روبرو کیون نہ خموش بیٹھئے — اسکی تو خامشی مین بھی ہے یہی مدعا کہ یون

ہم اسکے سامنے محفل مین خاموش کیون نہ بیٹھے ہین اوسکے چپ رہنے کا یہی حال ہے
ہے کہ تو بھی یون ہی خاموش بیٹھا رہ

گر ہو آب گشتہ دامن سے غبار ہنفت دریاہو

مینے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی — سنکے ستم ظریف نے مجھکو اوٹھا دیا کہ یون

اسمین ستم ظریفی کا نقشہ علی وجہ الکمال کھینچا گیا ہے کہ ہمنے جو اس سے یہ کہا کہ بزم ناز
غیر کی ... سے خالی نہ ہونا چاہئے تو اس نے مجھے بزم سے اٹھا دیا کہ اسطرح - اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا
کہ ... طرسے اُسنے مجھکو بزم مین بٹھا رکھا تھا - مگر دلمین غیر ہی سمجھتا تھا جسکا اُس کے
... ل سے ظہور ہوا -

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہین ہوش کسطرح — دیکھکے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یون

مجھ سے جو یار نے کہا کہ ہوش کسطرح اُڑ جاتے ہین تو میری بیخودی دیکھکر ہوا چلنے لگی کہ
اسطرح ہوش اڑ جاتے ہین - نکتہ یہ ہے کہ میری ہر شئے دشمن ہے - اُسکے سوال کا جواب
دینے کی مجھے نوبت بھی نہ آئی ہوا نے پہلے سے جواب دیدیا - یا یہ کہ ہر ایک شئے میرے
درد دل سے واقف ہے اور ہر شئے میری حالت پر گواہ ہے - یا یہ کہ اُسکی ہر چیز مطیع ہے
اور اُسکے سوال کے جواب کے لئے تیار رہتی ہے -

کب مجھے کوے یار مین رہنے کی وضع یاد تھی — آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یون

مین یہ نہ جانتا تھا کہ کوے یار مین کیونکر رہنا چاہئے نقش قدم نے مجھکو بتایا کہ اسطرح
سے حیران اور بیکسی کیحالت مین پڑا رہنا چاہئے -

گر ترے دلمین ہو خیال وصل مین شوق کا زوال — موج محیط آب مین مارے ہے دست و پا کہ یون

شاید تیرے دل مین یہ خیال ہوگا کہ وصل مین شوق کا زوال ... ہوتا ہے ... یون
جواب دینے کے لئے موج دریا اپنے سر کو ٹپک رہی ہے کہ کیا ... پھر بھی اسکے

یہی کہا ہے کہ میرے نفس میں آخر نہال نصیب بھی ہوجاتا ہے تو اضطراب کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھ جاتا ہے
نہ ملے تھے انکو سکون تھا ابھا دریا سے ملنے پر اون کی یہ صورت

خیال جلوۂ گل سے خراب تبدیل ہوکر وہی سر ٹپک رہے ہین اور بزبان حال کہتے ہین کہ کیا یونہی

شراب خانہ ہے مولانا نظم اسکی شرح یون فرماتے ہین کہ اگر مجھے خیال ہو کہ مبدء حقیقی تک
نہین سے ہے تکمیل زوال شوق ہو جائے گا اور اس طرح اتحاد پیدا ہوگا تو موج محیط کو دیکھ وہ بتا رہی
دوسری دست و پا مارتی ہے آخر اتحاد ہو جاتا ہے جو کہ مرتبہ اطمینان و سکون کا ہے۔

مین لیجۂ مولانا حسرت تحریر فرماتے ہین۔ وصل سے شوق کم ہو جاتا ہے دیکھ کہ موج بحر بھی بزبان
حال کہہ رہی ہے موج کی حرکت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وصل بحر سے علیحدہ ہوکر کنارے پر
پہنچنے کے لئے دست و پا مار رہی ہے غور فرمائیے اور جو سننے صحیح معلوم ہون ان تعین پر عمل
کیجئے (مارے ہے) فی زمانہ متروک ماری ہے مارتا ہے مارتے ہین مستعمل ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

جو یہ کہے کہ فارسی شاعری سے اردو شاعری کیونکر بہتر ہو سکتی ہے تو ایک مرتبہ غالب
کی اردو شاعری اسکو سنا کہ یون اچھی ہوتی ہے (کیونکر مستعمل ہے۔ کیونکہ متروک ہے۔)

ردیف واو (و)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

حاسد کی صفات مین تنگ چشمی بھی داخل ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ وہ اپنے سوائے
کسی کو دیکھ نہین سکتا اسکو مصنف کہتا ہے کہ حسد کی وجہ سے تیرے دل مین افسردگی اور چشم
مین ہمارے شعر لیا گیا ہے اسکا علاج یہ ہے کہ دنیا کا تماشا کر اور بغور ہر شے کو ملاحظہ کر تو ممکن
ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ زیادتی کے سبب تیری تنگدلی اور تنگ چشمی کے مرض کو زائل کر دے
بیندی کے سبب سے لوگ چیزوں کے معائنے سے وسعت بڑھیگی۔ اور کسی تنگ چیز کو بہت پر
اور بعض ظرافت مابوں سے لیا گیا۔
اچھی طرح یاد نہین مگر ایک شعر کہ تجربہ کے بعد تجھے معلوم ہو جائے گا کہ حسد کرنا بے جا ہے

دنیا میں دولت کمانے کو کوئی سبب نہیں درکار ہے ہر جگہ یہی حال ہے۔

بقدر حسرت دل چاہیئے ذوق معاصی بھی — بھروں اک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو

گنہگار کو فارسی میں تر دامن کہتے ہیں اسی کی بنا پر یہ شعر کہا گیا ہے کہ اگر ہفت دریا سے گناہ ہوں تب میرا ایک گوشہ دامن تر ہوگا تو دامن کا تر ہونا تو بہت دور ہے۔ کیونکہ میرے دل میں گناہوں کی حسرت بہت زیادہ ہے دوسرا شعر اسی مضمون کا گذر چکا ہے ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجائے — کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

گر میرا سرو قد گلشن میں گرم خرام ناز ہو کر آجائے۔ تو خاک گلشن تک شکل قمری نالہ کرنے لگے خاک کو قمری بوجہ قمری کے خاکستری رنگ ہونے کے کہا گیا۔

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں — بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو

اگر میں کعبہ میں جا رہا تو مجھ کو طعنہ نہ دو کیا میں بتخانہ والوں کی صحبت کو بھول گیا ہی کیا ہوں۔ یعنی انکی یاد اب بھی تازہ ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

میں چاہتا ہوں کہ عبادت کسی طمع سے نہ ہو خالصاً لوجہ اللہ ہونی چاہیئے۔ شراب و شہد اور بہشت کی طمع سے اگر عبادت کی تو کیا عبادت ہوئی لہذا اچھا ہے کہ کوئی بہشت کو دوزخ میں ڈالدو کہ کوئی طمع نہ رہے اور جو عبادت ہو وہ بے لاگ ہو۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے — ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کا

راہ و رسم ثواب سے ہمارا منحرف ہونا ضروری ٹھہر گیا میں اصل ہی سے یہ انحراف لکھا ہے کیونکہ وہ قلم جس سے سرنوشت لکھا ... یا ہوں ہم اسی پر قط ٹیڑھا لگا ہے۔

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے　　خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

غالب مجھے اپنی سعی سے لہنا نہیں ہے کسی نہ کسی طرح سے میری کوشش بیکار ضرور ہو جاتی ہے اگر اتفاق سے ملخ نہ ستائے تو بجلی موجود ہے۔

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو　　کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ہم اس خیال سے آزاد ہیں کہ ہمارے ساتھ آپ محبت کیوں نہیں کرتے ہیں۔ اگر آپ کو ہمارے ساتھ یہ منظور نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

؎ قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا　　ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

ضعف نے مجھ میں کسی بوجھ اٹھانے کی طاقت باقی نہیں رکھی یہاں تک کہ اب نقش محبت بھی دل پر بار ہے دوسری جگہ اسی مضمون کو نئی صورت سے کہا ہے۔

؎ گنجائش عداوت اغیار اک طرف　　یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ　　ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

اگر تم مجھ سے غیر کی برائیاں کرتے ہو مگر مجھے اسکا گلہ ہے کہ تم اس ملعون کا میرے سامنے تذکرہ کیوں کرتے ہو۔ میرا ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔

؎ کرتے ہیں شب وصل وہ دشمن کی برائی　　میں کہتا ہوں آخر وہ تمہیں آہی گیا یاد

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا　　یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

ہمارے سر... ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ۔ ہر مرض کی دوا پیدا ہوئی ہے مگر یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یہ بات صحیح ہو پسندی کے سبب سے لو... کیوں نہ ہو شعر غم عشق کو لا علاج کہا کرتے

اور بعض ظرافت ما... اچھی طرح یاد نہیں مگر ایسا

...نے کسی سے معاملہ　　اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

میری بے کسی نے میرا معاملہ کسی غیر سے نہیں ڈالا۔ یہاں تک کہ میں اگر خجالت بھی اٹھاتا ہوں تو دوسرے سے خجالت بھی منظور نہیں ہے اور یہ انتہائے غیرت ہے۔
یا یہ کہ یہ تو ظاہر ہے کہ اور کسی سے مجھے کچھ اور نفع حاصل نہ ہوتا تو خجالت تو حاصل ہوتی مگر میری بے کسی نے مجھے اس سے بھی بچایا۔ یہ مثل شعر کہا ہے۔ معانی آفرینی کی حد کی گئی ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

آدمی تنہا بیٹھے تب بھی خیالات گوناگوں کا ہنگامہ رہتا ہے لہذا ہم خلوت کو بھی جلوت ہی کہتے ہیں مومن خان مرحوم کا ایک شعر ہے جسے مرزا غالب بہت پسند کرتے تھے۔
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
کسیکا شعر ہے ہمیشہ مجھ شیفتہ آزردہ میں سمجھا ہے دل اپنا شورش روز جزا کو کیا جانے

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

انفعال زبونی ہمت کی دلیل ہے۔ یعنی کسی سے کچھ حاصل کرنا باعث انفعال ہے لہذا عبرت بھی اگر حاصل کرو تو زمانے سے مت کرو کیونکہ اس میں بھی شرمندگی حاصل ہوگی
یا یہ کہ انفعال سے کم ہمتی کا پتہ چلتا ہے۔ لہذا کم ہمتی کا خود کو متہم ٹھہرانا بہت برا ہے زمانے سے کچھ نہ کچھ حاصل کیوں نہ کیجئے چاہے وہ عبرت ہی ہو۔ یعنی بے حصول کمال دنیا میں عیش و نشاط اور انفعال سے کام نہیں چلتا۔

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

آزادی یہ نہیں ہے کہ دوسروں سے بیگانہ ہو گیا اور ان سے بیزاری اور وحشت اختیار کر لی اگر وحشت بھی آتا ہے تو اپنی ذات سے کرو۔ وحشت کا لطف بیگانگی دنیا کا پتہ چلے گا ورنہ سب جھوٹا ہے۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اگرچہ عمر کا عبادت و طاعت میں صرف ہونا عمر کا بہترین مصرف ہے لیکن پھر بھی اس کے

فوت ہونے کا غم کچھ ایسا نہیں ہے کہ اسے کوئی بھول جائے - یعنی عمر عزیز برترین شے ہے - بہت خوب شعر کہا ہے

اُس فتنۂ محشر کے در سے اب اٹھنے نہیں آئے اسمیں ہمارے سر قیامت ہی کیوں نہ ہو

چاہے کچھ ہو جائے مگر اب اوس کے در سے ہم اٹھ نہیں سکتے یہاں تک کہ اگر قیامت بھی آجائے جس سے ہر چیز اٹھے گی مگر ہم نہ اٹھینگے

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے اور ہونگے تری محفل سے ابھرنے والے

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو

اول تو میرے شیون میرے نالے سے نوا سنجان گلشن کو عبرت حاصل کرنی چاہیے اور چونکہ انہیں یہ حصول عبرت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اس لئے مجھکو اچھا سمجھنا چاہیے - مگر با اینہمہ اگر وہ مجھکو اچھا بھی نہ سمجھیں تو برا بھی نہ جانیں کیونکہ میں خود آفت زدہ ہوں قفس میں ہوں کسی کا میرے ہونے سے کیا بگڑتا ہے کوئی میں آزاد تھوڑا ہی ہوں کہ کسیکا کچھ کر سکوں یا کسی کو میرے آزادی پر حسد اور رشک آئے - یا مجھے اپنا شریک صحبت سمجھکر برا جانیں

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

دشمن کو اگرچہ میرے معشوق سے ہمکناری حاصل نہیں ہے مگر میرے لئے یہ رشک بھی کم نہیں ہے کہ جس کی میں تمنا کرتا ہوں اوسکی تمنا اوسکو بھی ہے - مرزا غالب مرحوم نے رشک کے مضامین کو جس صورت سے ادا کیا ہے اس سے بہتر کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں پائے جاتے چنانچہ یہ مضمون بالکل نیا ہے ایک جگہ اسی رشک کے مضمون کو فارسی میں یوں ادا کیا ہے

شعر یاد از سر دو نیارم دانیم زود رنجی است کاندر دلم گذشتی با یار ہم نشینی است

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر کیا سینہ میں جس نے خونچکاں مژگان سوزن کو

افسوس کہ ایسے گہرے زخم پر تیری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا جسکو سینے میں مژگان سوزن نے خونچکاں کیا ہے مولانا نظم لکھتے ہیں سوزن سے سوزن نظم مراد ہے - جسکا مقام سینے کے اندر ہے اور اگر یہ استعارہ سوزن کا نہیں تو شعر عامیانہ ہو جائیگا

شعر اور غیر واقعی باتیں نظم کر دیا کرتے ہیں خدا جانے غالب نے کیا کہا تھا۔ اللہ اکبر۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ان ہاتھوں سے خدا سمجھے جنھوں نے فراق میں میری گریبان دری اور وصل میں رخصت کے وقت اُسکے دامن کھینچنے کی عادت اختیار کر رکھی ہے (جاناں) اس جگہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا میں آہیں مولانا حسرت کے قول کی تائید کرتا ہوں کہ جاناں کا دامن اگرچہ صحیح ترجمہ ہے۔ دامن جاناں کا مگر تعجب ہے کہ غالب نے اسکا استعمال جائز رکھا۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ابھی ہم قتل گاہ کا نظارہ معمولی بات سمجھے ہوئے ہیں تیرے توسن کو ابھی خون میں شناور نہیں دیکھا ہے کہ ذرا جو اس ٹھکانے ہوں مبالغہ تو خونریزی معشوق حد سے گذر گیا ہے معاذ اللہ۔ ہلاکو خان مات ہو گیا خدا کرے آجکل فرضی عاشقوں کو ایسے خیالی جلاد معشوق نہیں

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

میرے زنجیر بننے کا جو شہرہ ہوا تو لوہے کے جوہر نے لوہے کو معدن میں بیتاب کر دیا کہ کاش مجھی سے ایسے کامل دیوانہ کی زنجیر بنے۔ کان کے نون کا غنہ ہونا بہت بُرا ہے نیز ایسا اغراق کرنا غالباً قوت متخیلہ کے قوت ممیزہ سے حد سے گذر جانے کا نتیجہ ہے۔

تخیل وہیں تک تخیل کی حد میں ہے جہاں تک وہ اعتدال پر ہے۔ اگر وہ قوت ممیزہ سے گذر گیا۔ تو وہ شاعر کو مہمل بکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یعنی جسقدر کہ متخیلہ خلاق معانی ہے اسیقدر قوت ممیزہ اسکی روک ٹوک کرنیوالی ہے اور کبھی اسکو اسقدر پرواز کی اجازت نہیں دیتی جانے سے وہ گرے اور اسکی ہڈی پسلیاں چکنا چور ہو جائیں۔ قوت متخیلہ کی عادت ہے کہ وہ ہمیشہ آسمان سے تارے توڑ کر شاعر کے سامنے لا رکھتی ہے مگر ممیزہ اسکے خیالی کی بہ لحاظ وضع الشئے علیٰ غیر محلہ کبھی کسی زمین پر لگانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور اگر ایسا ہو تو سمجھ لیجئے کہ قوت متخیلہ حاکم اور ممیزہ محکوم ہو گئی۔ اور اس کا اثر بُرا ہو گا

جیسا کہ ایک پیاسے کو زہر کا شربت پینا مضر ثابت ہوتا ہے۔

جہاں شاعر مبالغہ سے کام لیتا ہے وہاں مضمون اکثر محکم ہو جاتا ہے اور تخیلہ غالب رہتی ہے یہ صحیح ہے کہ آجکل غلطی سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جہاں تک مبالغہ ہو وہ شعر کیلئے زینت ہوگی مگر دیکھا جائے تو عرب کی ابتدائی شاعری میں کہیں جھوٹ کا نام بھی نہیں ہے۔ چنانچہ زہیر ابن ابی سلمیٰ جو دور اول کا شاعر ہے کہتا ہے۔ احسن القول ما صدقہ الفعل۔ یعنی بہترین کلام وہ ہے جس کی فعل بھی تصدیق کرے۔ اسی لئے حضرت عمر نے زہیر کو اشعر الشعراء کا خطاب دیا تھا اسی طرح عرب میں سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ مگر خلفائے بنی عباس کے زمانہ سے برابر جھوٹ کو ترقی ہوتی رہی۔ بیوقوف امیر بیجا مدح سے خوش ہوتے رہے یہانتک کہ مبالغہ شعر کے ارکان ضروری میں داخل ہو گیا۔ مگر ہم اس زمانہ کے شعراء کو الزام نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ دروغ مصلحت آمیز سے کام لیتے تھے اور اسکی بدولت انعام اور دولت حاصل کرتے تھے۔ مگر اب خیال کیجئے کہ زمانہ کی قدردانی کا اب یہ حال ہے کہ جیسے پہلے امرا خزانہ دیتے تھے آج کوئی بجائے اسکے واہ کہنے کو بھی تیار نظر نہیں آتا۔ پھر آخر اس اتباع سے کیا فائدہ ہے کیوں وہی آثار خاص مد نظر رکھی جاوے۔ اور کیوں شاعر کے بجائے خود کو لاغی کا خطاب دلایا جائے۔

خوشی کیا کھیت میرے اگر سو بار ابر آئے ــ سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

اگر میرے کھیت پر ابر آئے تو اسکی مجھے کوئی خوشی نہیں ہے اسواسطے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی باوجودیکہ کچھ نہیں ہے مگر برق خرمن کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ اسکا شعر ہے

سے کبھی ہنستی ہے بجلی اور کبھی روتا ہے ابر اسکا ــ ابھی پتی ہی نکلی ہیں کہ شاخ نشیمن میں۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ــ مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

وفاداری اور اپنی وضع کو نباہنا ایمان کی دلیل ہے۔ یہانتک کہ اگر برہمن بت کی عبادت کرتا کرتا بتخانہ میں مر جائے تو وہ کعبہ میں گاڑنے کے قابل ہے یہ انتہائی شعر ہے۔ اسی مضمون کو عرفی شیرازی کہتے ہیں۔

سے بکیش برہمنان آنکہ از ضعیف الست ــ [illegible]

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھکو　　جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

میری قسمت میں شہادت تھی اسی لئے مجھکو یہ عادت پڑی تھی کہ جہاں کہیں تلوار دیکھتا تھا گردن جھکا دیتا تھا۔ یہی ہوا کہ اس عادت کی بدولت میں مارا گیا اور شہید ہوا۔

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

یہ شعر بیت الغزل ہے۔ کہتا ہے کہ اگر دن کو میں لٹ نہ جاتا تو رات کو ایسا بیخبر کیوں سوتا۔ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی مال نہ اٹھا کر نہ لیجائے۔ اب کہ لٹ گیا ہوں تو آرام کی نیند پڑا سوتا ہوں اور رہزن کے لیے جس نے مجھے اس غم سے سبکدوش کیا ہے دل سے دعا نکلتی ہے۔ بہت خوب شعر کہا ہے۔

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے　　جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

ہمارا جگر معدن ہے اور سخن جواہر ہے اگر ہمارے پاس جگر اور سخن نہ ہوں تو جا کر معدن کو کھود دیتے کہ وہاں سے جواہرات نکال کر لائیں۔

مرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب　　فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

مانا کہ فریدون جمشید کیخسرو بہمن سب عالی قدر بادشاہ تھے مگر میرے بادشاہ سے انکو نسبت نہیں میرا بادشاہ سلیمان مرتبت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت سلیمان ان سب سے بڑے بادشاہ تھے کہ جن ہوا پرند وغیرہ پر بھی حکمران تھے اور بادشاہ ہی نہیں تھے بلکہ پیغمبر تھے۔ نیز بہادر شاہ بھی ایک درویش صفت بادشاہ تھے۔

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں　　رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

محاورہ ہے کہ فلاں فلاں کے پاؤں دھو دھو کر پیتا ہے۔ اسی مضمون کو ادا کرتا ہے کہ گو میرا کمال نقاہت ہے اس ظالم کے دھونے کے لئے پاؤں دھوتا ہوں جب پینے کا ارادہ کرتا ہوں تو ضد سے لگن سے باہر پاؤں کھینچ لیتا ہے۔ گویا مجھے اسقدر ذلیل سمجھتا ہے کہ اپنے پاؤں کا دھوون

ملانا کبھی منظور نہیں کرتا -
پانو کے آخر میں اہل لکھنؤ نون لکھتے ہیں اور اہل دہلی واو -

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

فرہاد نے سادگی سے محض پیرزن کے مکر و فریب پر جان دیدی ہائے ہائے پیرزن کے پانوں کیوں نہ ٹوٹ گئے ہائے ہائے میں اسکے پانوں پڑوں وہ ایسا سادہ تھا یہاں میرے نزدیک پانوں پڑنے کا محاورہ کچھ اچھا صرف نہیں ہوا -

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

ہم راہزن سے بہت بھاگے تھے اسی کی سزا یہ ملی ہے کہ اب اسکا مطیع ہوکر ہمکو اسکے پانوں واسنے پڑے ہیں نظم صاحب فرماتے ہیں اس شعر کے جو معنی حقیقی ہیں وہ تو شاعر کا کلام نہیں معلوم ہوتے ہاں اگر یہ سب باتیں استعارہ سمجھو تو وہ بھی صاف نہیں ہیں -

واقعہ تو یہی ہے جو جناب نظم نے لکھا ہے کہ یہ شعر کلام غالب کے بالکل خلاف ہے - اسمیں پانوں و پاؤ وغیرہ یہ سب رکیک رکیک مضمون ہیں - مگر معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زبان پر یہ لفظ ضرور تھا ایک جگہ اور کہتے ہیں -

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پانوں پھول گئے
کہا جو اسنے ذرا میرے پانو داب تو دے

مگر وہاں محاورہ اچھی طرح صرف ہوا ہے اگرچہ مضمون وہ بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا - مگر سچ ہے کہ ردیف اور قافیہ کی بیجا قید جو اردو کی شاعری میں ہے وہ کبھی کبھی شاعر کو ایسا مجبور اور مجنون کرتی ہے کہ وہ کچھ کا کچھ کہہ جاتا ہے یہی معاملہ غالب کو پیش آیا ہے ورنہ وہ خود کہتا ہے

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمی است کہ بر کلک و قلم میکنم امشب

مگر یہاں یہ دونوں شعر ایسے ہی ہیں - جنمیں قافیہ بندی کے سوا کچھ نہیں -

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

مجھے مرہم کی جستجو کرنے میں وہ زحمت اٹھانی پڑی ہے کہ وہ اصل مرض سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی ہے اور میرا جسم اتنا فگار نہیں ہے جتنے کہ پانو زخمی ہو گئے ہیں -

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ　　ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

مجھے دشت نوردی کا وہ شوق و ذوق تھا کہ مرنے کے بعد بھی خود بخود کفن کے اندر میرے پانؤں ہلتے ہیں یہ شعر بیت الغزل ہے۔

ہے جوش گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف　　اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغ چمن کے پانو

چمن میں بہار کا اسقدر جوش ہے کہ طایران چمن کے اڑتے ہوئے پھولوں کے جال میں پانؤں پھنستے ہیں دوسرے نازک معنے یہ پیدا ہوتے ہیں کہ اگر وہ اڑنے اور چمن سے باہر جانے کا ارادہ بھی کرتے ہیں تو رونق چمن ان کے لئے دام بنجاتی ہے اور کہیں جانے نہیں دیتی۔

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں　　دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

آج اس بت نازک بدن کے پانو دکھتے ہیں کہیں خواب میں شاید وہ گیا ہوگا۔ کسیکا شعر ہے۔

ع وہ خواب میں عدو کے گھر آیا گیا نہ ہو　　مہندی لگی ہے پانؤں میں چھالا پڑا نہ ہو

غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو　　پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

چونکہ بادشاہ شیریں سخن کے پانو دھو دھو کر پیتا ہوں اسواسطے ان کے اثر سے میرے کلام میں مزا پیدا ہوگیا ہے مزا۔ پینا۔ شیریں۔ خسرو وغیرہ یہ سب الفاظ مناسب ہیں جو نہایت صفائی سے نظم ہوئے ہیں۔

واں پہونچکر جو غش آتا پیہم ہے ہمکو　　صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہمکو

مجھکو وہاں پہونچکر جو پے در پے غش آتا ہے یہ خالی از علت نہیں ہے بلکہ اس سبب سے کہ سو مرتبہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے قدموں کو بوسہ دوں۔ اور یہ پانؤں کی توقیر مجھے عشق سے منظور ہے کہ اُسی کے ذریعہ سے کوچہ محبوب میں جانا ہوتا ہے۔ پیہم بغیر اضافت اور پیہم الاضافت دونوں طریقہ سے صحیح ہے مگر اردو میں بغیر اضافت مستعمل ہے۔

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے　　کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہمکو

میں اپنے دل کو۔ اور میرا دل مجھے دامِ وفا مین پھنسائے رکھتا ہے اس سے ہمارے لذتِ آزار کے خوگر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن　　تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہمکو

جس ناتواں کے گلے میں اتنا بھاری طوق ہو اوسمین بھاگنے کی طاقت کہاں باقی رہ سکتی ہے یعنی ایک چونٹی کے پاؤں کا نقش بھی طوقِ گردن ہے۔

جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو　　یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہمکو

مین تغافل کو بھی منع نہین کرتا آپ شوق سے تغافل بھی کیجیے لیکن تغافل آشنایانہ کیجیے ناآشنایانہ نہ کیجیے یہ نگاہِ غلط انداز تو ہمکو زہر معلوم ہوتی ہے۔ تغافل جو جانکر کیا جائے گا اُس سے کم از کم یہ تو امید بندھے گی کہ اب ناآشنا ہو تو کبھی تو آشنا ہوگے۔

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزین　　نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہمکو

مرغِ سحر کا نالہ ہمارے لئے تیغِ دو دم ہے یعنی اوس سے ہمکو دو قسم کے صدمے پہنچتے ہیں ایک تو رشکِ ہم رنگی کا یعنی رونے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی آپ کا عاشق ہے۔ دوسرے یہ کہ اسکی آواز درد ناک ہمپر اثر کرتی ہے

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا　　ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

ہم نے جو سر اڑانے کے وعدہ کی مکرر اُن سے التجا کی۔ تو ہنس کے جواب دیا کہ ہمین تیرے سر کی قسم ہے ضرور اڑائینگے۔ یا یہ کہ ہنس کر کہا کہ تیرا سر اوڑانے کی تو ہمکو قسم ہے ہم نہ اڑائینگے۔

پہلا مطلب صاف ہے۔ ہنسنا۔ اور سر اڑانے پر سر کی قسم کھانا ایک ایسا لطف پیدا کرتا ہے جسے شاعر ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔

دل کے خون کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار — پاس بیرونقی دیدہ اہم ہے ہمکو

دل کے خون کرنے کی کوئی وجہ نہیں مگر مجبور ہیں ہمیں اپنی آنکھ کی بیرونقی بُری معلوم ہوتی ہے یعنی ہم خون رونے کو رونق دیدہ سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ شعر بھی بہت خوب ہے۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغان کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہمکو

ان دونوں مصرعوں میں حد شق دکھائی گئی ہے۔ یوں تو ظاہرا برابر کے مصرعے ہیں۔ اس کا مضمون بھی قیامت ہے تم اتنے نازک ہو کہ میری خموشی تمکو فغاں معلوم ہوتی ہے مگر میں اتنا عاجز ہوں کہ تم نے ستم سے ہاتھ اٹھا کر جو انداز تغافل اختیار کیا ہے اسکو بھی ستم سمجھا۔

لکھنؤ آنیکا باعث نہیں کھلتا یعنی — ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہمکو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کہیں جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹھہرے۔ کہتے ہیں کہ ہمکو لکھنؤ کے آنیکا کچھ سبب نہیں معلوم ہوتا سیر و تماشا کی ہوس سو وہ ہمکو بہت کم ہے۔ محض اس لئے دلی سے یہاں آ نہیں سکتے۔

مقطع سلسلہ عزم نہیں ہے یہ شہر — عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہمکو

ہمارا سلسلہ شوق سیر یہاں کیا قطع ہو سکتا ہے بلکہ یہ سلسلہ شوق حرم اور نجف اشرف میں جا کر منقطع ہوگا۔

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب — جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہمکو

ہم کہیں کسی توقع پر جا رہے ہیں اور مرکز کاف کرم ہمارے لئے جادہ راہ بنا ہوا ہے یعنی محض کرم کی امید پر ہم کہیں جا رہے ہیں۔

واں اسکو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار — یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

وہاں اسکو ہول دل ہے میں اس سے بیقرار ہوں اور ڈر رہا ہوں کہ کہیں کچھ نہ

میری آہ نے اثر نہ کیا حالانکہ اس کا ہول دل محض رقیب کی جدائی میں ہے۔ ایک جگہ بالکل یہی مضمون فارسی میں کہا ہے۔ داغش در انتظار غیر تا لم زار زار * دامن گرفتہ باشد خو اثر را بجوعامن

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ   آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

اسکو ذوقِ ستم اتنا ہے کہ خود آرائی کو بھی اسکے آگے ہیچ سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ اگر اپنی شکل دیکھتا ہے تو آئینۂ دیدۂ نخچیر میں دیکھتا ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو   مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

خیر ہم رشک رقابت کو بھی گوارا کرتے ہیں غیر سے تم راہ و رسم رکھتے ہو تم جانو تمہارا کام جانے مگر مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔ عدو کے ساتھ ہی آئیں وہ خیر وقت آخیر وہ اب کرنے گوارا جو عمر بھر نہ کیا۔

بچتے نہیں مؤاخذۂ روزِ حشر سے   قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

یعنی تم نے محض اس لحاظ سے کہ مجھ سے حشر میں کوئی مواخذہ نہ ہو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا رقیب سے قتل کرایا ہے۔ مگر کیا تم اس حیلہ سے بچ جاؤگے۔ رقیب قاتل ہے تم گواہ ہو۔ مواخذہ تم سے ضرور ہوگا۔ یہ شعر بیت الغزل ہے۔

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں   مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

اچھا تمہاری خاطر سے ہم نے یہ بھی مان لیا کہ تم انسان نہیں ہو خورشید و ماہ ہو۔ مگر کیا خورشید و ماہ بھی تمہاری طرح بیجرم آدمیوں کا خون بہاتے ہیں اور ناحق شناسی سے کام لیتے ہیں۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے انکے ایک تار   ڈرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

انکی نقاب میں ایک تار ابھرا ہوا ہے میں ڈرتا ہوں اور اس شک سے مرا جاتا ہوں کہ یہ کسی کی نگاہ نہ ہو۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اس بیت میں اس مضمون کو شوخی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ جگہ جو ہم کو مرغوب تھی اور جہاں شراب پیا [illegible] تھا ہم سے چھوٹ گئی تو پھر اب مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی جگہ ہم وہاں پی لیں گے۔ اگر صحرا دشت ویرانہ وغیرہ کہا جاتا تو شعر میں یہ خوبی اور یہ شوخی پیدا نہ ہوتی۔ اس زمین میں یہ شعر بھی بہت خوب ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

لفظ بہشت کی جو [illegible] تعریف کرتے ہیں وہ سب سچ سہی لیکن بس بہشت اسی وقت ہم کو بھی معلوم ہو [illegible] وہاں تیرا دیدار [illegible] ورنہ کچھ بھی نہیں۔

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

یعنی اس شعر میں یہ لطف [illegible] کیا ہے کہ اول تو بادشاہ کے لئے ضرور ہے کہ غالب جیسا شاعر [illegible] اور [illegible] دربار میں ہو [illegible] اگر یہ بھی نہ ہو تو کچھ نقصان نہیں۔ میرا بادشاہ عمر جاہ [illegible] کچھ [illegible]۔ مولانا نظم لکھتے ہیں کہ میری عمر بھی بادشاہ کو لگ جائے

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

اب وہ زمانہ گیا جب ہم یہ تمنا کرتے تھے کہ ہم ان سے دو باتیں کر لیں تو ہم اپنے درد و غم کا ان کے سامنے نقشہ کھینچ دیں گے اور وہ ہم پر یقیناً مہربان ہو جائیں گے تو وہ موقع بھی نصیب ہو گیا اپنا [illegible] ان کے سامنے [illegible] اور ان کو مطلق رحم نہ آیا۔ اب بتاؤ کیا علاج [illegible] پہلے گفتگو کی تمنا تھی۔ گفتگو ہو چکی [illegible] نہیں ہوا۔ اگر اب اپنی داستان پھر ان کے سامنے بیان کی جائے تو جو باتیں پہلے [illegible] ہو گی۔ [illegible] اب وہ کیونکر مہربان ہو جائیں گے

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

گویا کہنے والا وصال کے اصلی معنے ہی نہین سمجھتا - اور اس سے انتہائے محرومی کا نقشہ کھینچنا مقصود ہے - وہ کہتا ہی کہ ہم تو وصال کے اتنے ہی معنے سمجھتے ہین کہ اگر وصال نہو - تو کہان جائین - اور اگر ہو تو ہونے کی کیا صورت ہی - یہ ویسا ہی انداز بیان ہی جیسا کہ ع
لب تک آ جائے ہے ہوتی ہی جو فرصت غم سے ÷ اور پھر کون سے نالہ کو رسا کہتے ہین -
مولانا نظم اسکی شرح فرماتے ہین - یعنی اسی فکر ہی مین ہم خوش رہتے ہیں وصال کبھی ہوتا نہین

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے — حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیا کہیے

اگر ہمارا یہی ادب - یہی دلی الجھن - یہی گو مگو کا اور انکا یہی حیا کا عالم ہو تو آخر کیونکر کام بنے گا اور کیا ہوگا -

تمھین کہو کہ گزارہ صنم پرستون کا — بتون کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

تم ہمکو تو کہا کرتے ہو کہ تو ہمکو ہمیشہ بدخوئی کا الزام دیتا ہی مگر لیجیے ہم آپ ہی سے انصاف سے پوچھتے ہین کہ جیسی تمھاری عادت ہی اگر ایسی ہی معشوقون کی عادت ہو تو کیونکر بنے اور عاشقون اور صنم پرستون کا گذارہ کیسے ہو -

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر مین ہون ایک دو تو کیونکر ہو

اگر تم آئینہ دیکھتے ہو تو گھنٹوں اپنے عکس سے الجھتے ہو گستاخی معاف اگر شہر مین تمسے دو چار حسین ہون تو پھر تو بڑی مشکل ہو جائے پھر تو جینا بھاری کر دین - آئینہ مین عکس دیکھکر معشوق کا لڑنا یہ عام مضمون ہی - معمولی معمولی شعراء کے دواوین بھی اس سے خالی نہین ہیں چنانچہ کسی کا شعر ہی -
بھوین تنتی ہین آنکھین سرخ ہین کچھ کہتے جاتے ہین ÷ لڑائی لڑتے ہو تم آئینہ رکھکر مقابل مین

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

میرا دن اور میری رات یکسان ہی لہذا مجھے مجبوراً اسی روز سیاہ کو جو رات کی طرح ہی دن کہنا پڑتا ہے نہ کہوں تو کیا کروں - سیاہی ہی کا خیال کیا جائے تو گویا دن مجھے

دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا۔

یا یہ کہ میرا روز سیاہ رات سے زیادہ تاریک ہے اور مجبوراً میں رات کو دن دن کو رات کہتا ہوں۔ غالباً عرفی کا شعر ہے ؎

ز فروغ آفتابم نبود خبر کہ بے تو ٭ چو دو زلف تست یکساں شب روزم از سیاہی

ہمیں پھر اُن سے امید اور انہیں ہماری قدر ٭ ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو تو کیونکر ہو

جب وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں تو ہمکو اُن سے کوئی امید اور اُن کو ہماری قدر کیونکر ہو۔
اس شعر میں (ہ) کو تقطیع کے لئے واؤ بنا لیا ہے۔ اس لئے کہ یہ (ہ) تلفظ میں نہیں ہے۔ بلکہ اظہار حرکت ماقبل اس سے مقصود ہے دوسرا واؤ محض اشباع یعنی پیش کر کے پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ صحیح ہے۔ خود مصنف مرحوم نے اسکو اسی صورت سے دوسری جگہ نظم کیا ہے ؎ کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے۔ اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے۔ نظم صاحب نے لکھا ہے کہ میر کی زبان پر لفظ وہ بفتح واؤ تھا اور (ہ) ملفوظ تھی یہ شعر اُن کا شاہد ہے ؎ کہتا ہے کون تجھکو یاں یہ نکر تو وہ نکر۔ پھر ہو سکے تو بارے دل میں بھی ٹک جگہ کر۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے میر صاحب کی زبان پر وہ بفتح نہ تھا بالضم تھا اور "وہ" اور یہاں بھی ملفوظی ہی تھی ملفوظی نہ تھی بلکہ جگہ کا کاف فارسی انھوں نے مضموم کر کے وہی قاعدہ اشباع جاری رکھا۔ اور یہ لفظ جگہ بضم کاف نواح دہلی میں اب تک بولا جاتا ہے اس سے غالب کا وو لکھنا صحیح رہتا ہے۔ اور میر صاحب بھی الزام سے بری ٹھہرتے ہیں ورنہ غالب سے بھی یہ بعید ہے کہ دو دو جگہ ایک لفظ میں دھوکہ کھا جائیں۔ اور میر جیسے سے بھی مشکل ہے دنیا بھر سے خلاف ہو کر وہ بالضم کو بفتح لکھیں گے۔

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا ٭ نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

ہمکو گمان تھا کہ اُن کے خط سے ہمکو تسلی ہو جائے گی۔ اور یہ گمان صحیح بھی تھا۔ کہ المکتوب نصف الملاقات کا مضمون ہے مگر ایسا نہ ہوا دیدۂ دیدار طلب کو خالی خط سے تسلی نہیں ہوتی ہم مجبور ہیں۔

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

کوئی بتائے کہ اُسکی مژہ کو دیکھکر مجھکو کیونکر قرار آئے یہ گویا ایک نشتر ہے جو رگ جاں میں اترا ہوا ہے جس سے قرار آنا غیر ممکن ہے۔ مژہ کی جمع مژگاں کا دنبالہ فارسی میں جائز اور صحیح ہے یا یہ کہ مجھکو سمجھانے والے اُس مژہ کو دیکھیں پھر مجھے میرے سوال کا جواب دیں سے کہ کوئی بجز خوں گزیدہ مثال۔ واللہ اعلم بالصواب ہے۔

مجھے جنون نہیں غالب ولے بقولِ حضور فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

غالب میں مجنوں نہیں ہوں یہ سچ ہے مگر بقول حضور کے مصرع ثانی میں قول ہے جو بہادر شاہ ظفر بادشاہ آخری سلطنت مغلیہ کا کہا ہوا ہے۔ اور یہ غالباً شاہی فرمائش ہی سے مصنف نے غزل لکھی ہے۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

اگر کسی کو دل دیدے تو پھر آخر فریاد کیوں کرے جب پہلو میں دل نہ ہو تو زبان منہ میں کیا ہے یہ غزل غالب کی مقبول عام ہے اور واقعی اسکے شعر ایسے ہیں جنکی بندش و اثر وغیرہ ہر ایک کا مقابلہ کرنیکو تیار ہیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اُنکی عادت ناز اُٹھانے کی ہے اور ہم بھی وضعدار ہیں۔ وہ اپنی عادت کو نہیں چھوڑتے تو ہم کیوں اپنی وضع کو چھوڑیں اور اُن سے کیوں پوچھکر ہلکے بنیں کہ آخر آپ ہم سے کیوں نا راض ہیں۔

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

غمخوار نے مجھے رسوا کر دیا میرا رنج و غم دیکھکر وہ اسقدر مضطرب ہوا کہ وہ ناگوار میری حالت ظاہر کر گئی۔ ایسی محبت جہنم میں جائے جو غم اٹھا نہ سکے وہ میرا رفیق بننے کی کیوں جرأت کرے

ومبدم دیکھ دیکھ رہتا ہے   اور گدا ایسے ہی ہمنشین تو ہین

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستان کیون ہو

جب ہماری قسمت مین سر پھوڑنا بدا ہے تو پھر کیسی وفا اور کہان کا عشق جہان چاہینگے اپنا سر پھوڑ لین گے تیرے ہی آستانے پر کیوں سر پھوڑین ۔

۵ ۔ جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ۔ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو ۔
اس شعر کی بندش مین وہ چستی ہو جسکی تعریف غیر ممکن ہے ۔

قفس مین مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیون ہو

اسکی تعریف کرنا فضول ہو کیونکہ جسقدر معانی اس شعر مین بھرد ئے ہین وہ ادا بھی مشکل سے ہو سکتے ہین اور پھر لطف یہ ہو کہ بندش نہایت چست ۔ مضمون موثر اور بیحد دردناک گویا ایک طائر قفس مین مدت سے مقید ہو اور اسکو چمن و آشیانہ کی کچھ خبر نہین ہے ایک طایر کہین سے اسکے سامنے آکر بیٹھتا ہو اور یہ اس سے اپنے نشیمن کا حال بتاتا ہوا ہچکچاتا ہے ۔ اور حال یہ ہے کہ طایر مقید نے کل بجلی گرتی ہوئی دیکھی ہے ۔ تو سبب ظاہر ہو داز دیتا نیہ مین ہچکچاتا ہے تو یہ اس سے جھنجلا کر کہتا ہو کہ ارے کہتے کیون ہو تم رو کیون جاتے ہو خدا نہ کرے جو کل کی بجلی سے میرا آشیان جلا ہو دوسرے مصرعہ کی بناوٹ نہیں دیکھا سکے جسمین اپنے مضمون کو بہت خوبی سے ادا کیا ہو کہ باوجود یہ جانتے ہے کہ آشیانہ میں نہ ہو کسطرح اپنے دل کو سمجھا بجھا کر تسلی دیتا ہو ۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل مین نہین ہین پر یہ بتلاؤ   کہ جب دل مین تمہین تم ہو تو آنکھون سے نہان کیون ہو

یعنی تم یہ تو کہہ نہین سکتے کہ ہم تیرے دل مین نہین ہین ۔ اچھا جب تم یہان کوئی نہ ہو دل مین اگر نہین ہو تو پھر ۔ و تمنا یہ ہے یہ بھی بتا دیجیے ۔ کہ جب دل نہ ہو تو کہان ۔
آنکھون سے نہان کیون ہو ۔

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کسکا ہے   نہ کھینچو گر تم اپنے کو ... نوحہ خوان کوئی نہ ہو
... اپنے آپ نہ تو کوئی نوحہ خوانی

نہ کرے۔ یعنی ہمکو پھر ان لوگوں کی جنسے نفرت ہے صورت نہ دیکھنی پڑے۔ تینوں شعر دل میں بے کسی کی تصویر کھینچدی ہے۔

ردیف "ہ"

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ — طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

آفتاب سے لیکر ذرہ تک دل ہی دل ہے اور دل آئینہ کی صورت ہے تو گویا اس طوطی کو ہر طرف سے آئینہ میں اپنی شبیہ نظر آتی ہے۔ طوطی اور آئینہ مشہور مضمون ہے۔ مضمون کچھ ایسا ہی کہ تاویل مشکل ہے یعنی اگر غور کیا جائے تو تمام دنیا متحد بوجود واحد ہے۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ — جسکی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

میرے گھر میں گریہ وزاری کی نمی سے تمام جگہ سبزہ اگا ہوا ہے اور یہ گویا میرے گھر کی بہار ہے جس سے ویرانی کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر خیال کیجئے کہ بہار یہ ہو جو خزاں سے بدتر ہے تو خزاں کی کیا حالت ہوگی۔ مصنف نے سبزہ کے اوگنے کا کئی جگہ اعادہ کیا ہے۔ جیسے کہ

ع اگا ہے گھر میں سبزہ میری ویرانی تماشا کر — مدار اب کھودنے پہ گھاس کے ہے میرے درباں کا
ایضاً اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے — دشواری رہ و ستم ہمرہاں نہ پوچھ

مجبوراً ہمکو اب بیکسی کی بھی حسرت اٹھانی پڑتی ہے۔ یعنی ایسی چیز کی حسرت کرتے ہیں جسکی کوئی حسرت نہیں کرتا۔ گر بیکسی کو ہم ایسے ہمراہیوں کے ہونے سے اچھا جانتے ہیں جو ظالم ہیں اور جنکی وجہ سے راستہ طے ہونا دشوار ہو گیا ہے۔

مولانا حسرت صاحب نے اسکی یہ شرح لکھی ہے کہ ستم ہمرہاں اس لحاظ سے کہا کہ ان کی موجودگی کے باعث سے بے کسی کی بھی حسرت اٹھانا پڑتی ہے۔ کیونکہ جب لوگ ہمراہ ہیں تو ہم اپنے آپ کو بیکس بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ مطلب بھی اس شعر سے پیدا ہو سکتا ہے بعض جگہ مصرع ثانی کا مضمون تو ——— یہ ہے۔ دشواری رہ و ستم ہمرہاں نہ پوچھ۔

یعنی راہ ظلم ہمرہاں کا کاٹنا سخت دشوار ہے جس سے ہم بیکسی کی حسرت اُٹھاتے ہیں کہ کاش ہم بیکس ہوتے تو اس راہ کو طے نہ کرنا پڑتا۔

ردیف یا (ی)

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نظر اُٹھائیں تو جلوہ ہائے گوناگوں دیکھ سکتے ہیں۔ مگر ہم میں طاقت نہیں ہے کہ نظارہ کا احسان اُٹھائیں۔ یہ ہمارے لئے بہت دشوار ہے۔

ہر سنگ پر برات معاش جنون عشق　　یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھائیے

معاش جنوں کا فرمان سنگ طفلاں پر لکھا گیا ہے۔ یعنی جنوں کی معاش کا دارومدار سنگ طفلاں پر ہے اسکے یہ معنے ہیں کہ دیوانہ ہو کر بھی خوشامد اور احسان کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

دیوار کا خم ہونا محض مزدور کے بار احساں سے ہے لہذا ہرگز کسی کا احسان نہ اُٹھانا چاہئے۔ دیوار کے خم ہونے کی تمثیل کی تخصیص محض خانماں خراب کی رعایت سے ہے۔ غالب نے بار بار اس مضمون کا اعادہ کیا ہے مگر مختلف صورتوں میں۔ اس سے ان کی عادت پر ایک روشنی پڑتی ہے کہ وہ کیسے غیور تھے۔

؎ نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم　　کہ بدتر ڈوب مرنے سے ہے جینا اس سہارے کا

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے　　یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

یا تو میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے یعنی لوگوں سے یہ شکایت نہ کرتے پھریئے کہ یہ جلتا ہے اور رشک کرتا ہے یا یہ جو رقیبوں کے ساتھ آپ چھپ چھپ کر ہنستے ہیں اس پردہ کو ہٹائیے اور ہنسنا چھوڑ دیجئے۔ زخم رشک کو رسوا کرنا محض پردہ اور تبسم پنہاں کی رعایت سے کہا گیا ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے اور اسکی بندش بہت ہی چست ہے۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

مسجد کو بوجہ محراب وغیرہ کے ابرو سے اور آنکھ کو بہ لحاظ مستی کے میخانہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چنانچہ مصنف بھی ثبوت میں پیش کرتا ہے کہ مسجد کے پاس ایسے ہی شراب خانہ کی ضرورت ہے جیسے آنکھ کے پاس ابرو کی۔ بھوں اگرچہ صحیح ہے اور محاورہ میں یہ مفرد بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر یہاں بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

آپ بھی ایک اور شخص پر عاشق ہوئے ہیں اچھا ہوا میرے اوپر یا دوسرے عشاق پر جو رو جفا کی اونکی کچھ سزا ملنا چاہیے تھی۔ اب اسی طرح اونکو بھی رنج اوٹھانے پڑینگے جیسے کہ مجھے اونکی جدائی میں صدمہ جھیلنے پڑتے ہیں۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یعنی باغ میں انواع و اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہوتے ہیں ہر ایک کی بو جدا اور رنگ علیحدہ ہوتا ہے مگر بہار کا ثبوت ہر ایک سے ملتا ہے۔ بہار سب میں پوشیدہ ہے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

بیخودی کے وقت خم کے پاؤں پر لوٹنا چاہیے اور مناجات کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا چاہیے یعنی ہر وقت حسب موقع وقت کام کرتا رہے۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ فرماتے ہیں۔

ع پانی وضو کو لاؤ رخ شمع زرد ہے
مینا اٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا

یعنی بہ حسب گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

یعنی جس صفت کو دیکھے اوسی پر ذات کو یاد کر کے مست و بیخود ہو جانا چاہیے۔ کہ صفت لوازم ذات سے ہے۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی　　سو رہتا ہے بہ انداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

ہمیں بساطِ عجز پر محض یک دل تھا وہ دل بھی ایسا جو ایک قطرہ خوں سے زیادہ نہ تھا ۔ دل کی بھی یہ کیفیت ہے ٹپکنے اور بہ جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے اور وہ بھی سرنگوں کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ فوراً بہ جانے والا ہے ۔ اسی مضمون کا یہ شعر غالباً علامہ فیضی کا ہے ۔

سے ۵ دریاب کہ ماندست زدل قطرۂ خونے　　آں قطرہ ہم از دست تو بر بر چکیدن

ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اسی سے ترجمہ کیا ہے مگر شان استادی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے فارسی میں محض قطرۂ خون کہکر لبریز چکیدن سے ترقی دی ہے غالب نے ترقی در ترقی کا منظر دکھایا ہے بساطِ عجز ۔ اور ہیں ایک دل ۔ دل بھی ایک قطرۂ خوں قطرہ خوں بھی آمادہ چکیدن ۔ آمادہ چکیدن بھی بحالت سرنگونی ۔ دلکو باندازِ چکیدن کہنا لطف سے خالی نہیں ہے ۔ بہت خوب شعر کہا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ چکیدن مصدر فارسی ہے مگر یہاں بے تکلفی سے صرف ہوا ہے اور چنداں برا نہیں معلوم ہوتا ۔

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی　　ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

اے فلک کچھ نہ کچھ تو مجھے ان رنج اور غموں کا بدلہ دے کچھ تو مجھے خوشی حاصل ہو دوسرا لطیف پہلو یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ نہیں کرتا تو کم از کم میرے دل حسرت پرست کی داد ہی دے ۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

معشوقوں کے لیے ہم نے مصوری سیکھی ہے آخر حصول ملاقات کا کوئی تو ذریعہ چاہیے کبھی نہ کبھی تو وہ تصویر کھنچوانے کے لیے ہمکو بلا لینگے ۔ مولانا نظم طباطبائی کو شاعری کا کنایہ ٹھہراتے ہیں ۔ فارسی میں فرماتے ہیں ۔

سے ۵ خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم　　تا با تو خوش نشینم و نظارہ را گرے کہ چیدہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　اک گونہ بیخودی

میرا پینے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ نشاط اور سرور ہو۔ بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے ہر وقت ایک بے خودی رہے تا کہ ذرا اپنے غم کو بھولا رہوں۔

نشوونما ہے اصل سے غالب فروع کو — خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

یہ ایک قطعہ ہے جسکا پہلا شعر یہ ہے جسمیں مصنف اس بات کے ثبوت میں کہتا ہے جو بات پیدا ہوتی ہے وہ خاموشی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی پہلے آدمی خاموش ہو کر کچھ سوچتا ہے پھر اُن باتوں کا اظہار کرتا ہے تو گویا ہر کلمہ کی اصل خاموشی ہے۔ اور اسکی مثال۔ ہے کہ جڑ سے ٹہنیوں کو طاقت پہونچتی ہے حالانکہ جڑ پوشیدہ ہے اس شعر میں خاموشی کی ی دبتی ہے۔ اور یہ مصنف نے بہ بنائے قاعدہ فارسی صحیح سمجھا ہے مگر بعض اہل لکھنؤ یا ئے الفاظ فارسی کا گرانا جائز نہیں قرار دیتے۔ اپنی طبیعت کا ہر شخص مختار ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جب محاورہ میں ے کا گرنا جائز ہے بلکہ بعض جگہ اگر نہ گرائی جاسے تو محاورہ بڑا اور بھونڈا معلوم ہوتا ہے تو پھر شعر میں اس قاعدہ کو دیکھتے ہوئے کہ جو کچھ بولو وہی لکھو اسکا گرنا کیونکر ناجائز قرار دیا جائے سوائے زبردستی کے اور کچھ نہیں۔ اسی لیئے آتش وغیرہ نے اسکی پابندی نہیں کی ہے۔ بلکہ متقدمین میں تو اکثر ایسے ہیں کہ اُنھوں نے الف اور ے واؤ ہی نہیں بلکہ بہت سے حروف کا گرنا عیب نہیں سمجھا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

چند روز از راہ تکلف ہم اپنے معشوق سے آزردہ اور خفا رہے وہ بھی ایک انداز جنوں تھا۔ مصرع ثانی میں جو محاورہ تکلف برطرف استعمال کیا گیا ہے وہ نہایت برمحل صرف ہوا ہے جس سے شعر میں ایک صنعت لفظی یہ پیدا ہو گئی کہ تکلف (یعنی تصنع سے ہم اوس سے آزردہ تھے۔ تکلف کو اٹھا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ایک انداز جنون تھا۔ دگرنہ معشوق سے آزردہ ہونا اپنے آپ سے آزردہ ہونا ہے۔

یعنی یہ تسکین دل آزردہ کو بخشے — مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

یعنی خبر کیسے خیال اسے مجھے کیا تسکین ہو سکتی ہے کیونکہ میری تمنا کے جال میں کہ صفت لوازم ...

ایسے ایسے ہزاروں شکار آیا کرتے ہیں - ایک معمولی سا شکار یہ بھی ہے - یعنی جیسا کہ ایک مشکل کام مرتا ہے اس قسم کے ہزاروں خیال میں کیا کرتا ہوں -

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم کہ ہوگا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

اسے ہمدم میں نے سمجھا تھا کہ رو کر دل کی بھڑاس نکل جائیگی - مگر کیا معلوم تھا کہ رونے سے اور بھی زیادہ دل میں درد پیدا ہو جائے گا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں ہرگز نہ روتا - مصرع ثانی میں تین اضافتیں پے در پے آئی ہیں - اگرچہ یہ جائز ہے - مگر وہیں تک کہ شعر میں لطف اور تازگی باقی رہے -

نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

غالباً آپ کو ناز ہے کہ میری تیغ جفا کی برش نے عاشق کا کام تمام کیا - مگر آپ کا یہ ناز دربیان ترتیب بالکل فضول ہے کیونکہ آپ کی تلوار بھی میرے دریائے بیتابی میں ایک موج سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی - یعنی بے انتہا ایسی موجیں ہیں جنمیں سے ایک یہ بھی سہی - یعنی صرف آپ ہی کی تیغ جفا نے مجھے نہیں مارا بیتابی نے بھی بہت سی تلواریں میرے اوپر چلائیں -

مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

ساقیِ گردوں سے شراب عیش کی ہم کیا تمنا کریں - کیا ہم دیکھ نہیں رہے کہ دو چار الٹے پیالے لئے بیٹھا ہے شراب عشرت انمیں کہاں رکھی ہے - ایک دو چار سات ہوتے ہیں یعنی سات آسمان بالکل اسی مضمون کا مولانا جامی علیہ الرحمۃ کا ایک شعر ہے -

؎ آسمان جام نگوں داں کز مئے عشرت تہی ست جستن مے از چنیں ساغر نشان ابلہی است

مرے دل میں ہے غالبؔ شوق وصل و شکوۂ ہجراں خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غالب میرے دل میں وصل کا شوق اور جدائی کا شکوہ بھرا ہوا ہے خدا کرے کہ وہ دن آئے کہ مجھے اُس سے یہ دونوں سنانے کی نوبت آئے -

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے　　تنگ آگئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

معشوق اسقدر خوشامد پسند واقع ہوئے ہیں کہ بات ہمارے لبوں سے خفا ہوگئی یعنی اب ہم سے خوشامد نہیں کیجاتی دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ معشوق کے سامنے بوجہ رعب حسن وغیرہ کے لب سے بات نہیں نکلتی اور وہ چاہتی ہے کہ ہم اس کی خوشامد کریں تب وہ کہیں ہمارے لب تک آئے۔

ہے دور قدح وجہ پریشانی صہبا　　اکبار لگادو خم مے میرے لبوں سے

باربار پیالہ میں بھرنے سے شراب گرتی ہے اس سے یہ مناسب ہے کہ خم مے کو ایکدم میرے منھ سے لگادیا جائے ایسا کرنے سے مجھے نقصان پہونچتا ہے۔ جناب آرزو صاحب لکھنوی فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں

ع　ساقیا نقصان جاں ہے میرا نیم بسمل　　جتنے قطرے مے کے ٹپکے خون اپنا بہہ گیا

رندان در میکدہ گستاخ ہیں زاہد　　زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

اے زاہد وہ رندان بادہ نوش جو شب و روز میخانہ کے در پر رہتے ہیں کہیں ان کا مقابلہ نہ کر بیٹھنا کہیں ان سے کچھ کہہ دینا شراب کی حرمت ان کے سامنے بیان نہ کرنا یہ بڑے گستاخ ہیں۔ طرف ہونا محاورہ فارسی ہے اردو میں متروک اور ناقابل استعمال ہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر فصیح الملک مرزا داغ مرحوم کا ہے۔ جسکے تبدل مضمون کو شوخی بیان نے چار چاند لگا دئے ہیں۔

ع　زاہد نہ چھیڑ ان کو ستانے آدمی ہیں　　تجھ کو لپٹ پڑینگے دیوانے آدمی ہیں

بیداد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر　　ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

بیداد وفا ملاحظہ کیجیے۔ یعنی اُس وفا نے جو تیرے عشق میں مجھے کرنی پڑی ہے یہ ظلم ڈھایا ہے کہ اگرچہ میری جان کو لبوں سے بہت ربط اور محبت تھی یعنی وہ ہمیشہ ہونٹھوں پر رہتی تھی مگر اسی بیداد وفا کی بدولت اُسنے لبوں کو چھوڑ دیا۔ اور گویا وہ ایسے شخص

جدا ہوئے جنہیں نسبت تھی۔ اور دندوں کو جدا کرنا بڑا ظلم ہے اسی واسطے بیداد وفا کہا ہے۔

تا ہمکو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا　　سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

معشوق کے انتہائے رنج شوخی۔ اور سفاکی کا یہ نقشہ کھینچا ہے۔ کہ اگر کوئی ہمارا ذکر اوسکے سامنے چھیڑتا ہے تو وہ سن لیتا ہے کہ ہمکو موقع شکایت باقی نہ رہے۔ یا ہم اوس کے رنج کا اندازہ کرکے اوس سے معذرت چاہیں یا یہ شکایت کریں کہ آپ کو ہمارے نام سے بھی نفرت ہے۔ اگرچہ ہمارا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ یہ ظلم اور بھی ظلم ہے کہ ہماری حالت پر کبھی بھی اسکو رحم نہیں آتا اور وہ ہمارا کبھی ذکر نہیں کرتا۔

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو　　وہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

نہایت بلیغ شعر کہا ہے جسکے اتنے معنے پیدا ہوتے ہیں (کہ غالب) یعنی عاشق رو رہا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی میرا احوال اُن کو سنا دے پھر کسی دوست کو ترس آتا ہے وہ حال سنانے کے لئے تیار ہوتا ہے اور معشوق کے پاس جانے کا قصد کرتا ہے تو یہاں گدگدی پیدا ہوتی ہے اور جتنا ہے عاشق اپنے پیامبر دوست سے فرماتے ہیں کہ شاید کوئی ایسی صورت بھی نکل آئے کہ ایک گھڑی بھر کے لیئے وہ ہمکو اپنے پاس بلا لے تو وہ دوست سمجھاتا۔ اور کہتا ہے کہ حال تو ہم انکو سنا دینگے انکے ذمہ دار نہیں ہوتے کہ وہ تمکو اپنے پاس بلا بھی لیں۔

دوسرا پہلو یہ نکلتا ہے کہ غالب بے ہوش پڑا ہے کوئی آتا ہے اور پکارتا ہے کہ غالب۔ اُٹھ۔ اُٹھ ترا احوال ہم انکو سنا دینگے۔ پھر بھی یہ کام ہم سے ہو سکتا ہے کہ سنکر تمکو پاس بلا لینا یہ اون کا کام ہے ہم اسکا ذمہ نہیں کر سکتے۔ یا یہ کہ باتوں باتوں اسی طرح ترا احوال ہم اُن کو بھی سنا دینگے وہ سنکے بلا لیں یا نہ بلائیں معشوق کے غرور اور عاشق کے شوق کا بھی اس شعر سے پورا پتہ چلتا ہے۔

دراصل شاعری اسی کا نام ہے جسمیں قلیل الفاظ میں معانی کثیرہ پائے جائیں۔ اور جس جس پہلو کو مصنف دکھانا چاہے وہ نہایت عمدگی کے ساتھ تصویر بنکر پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

میرے گھر میں رکھا ہی کیا تھا کہ تیرا غم اوسکو غارت کرتا ایک حسرت تعمیر تھی وہ اب بھی موجود ہے اسے کمبخت عشق نے بھی غارت نہ کر دیا - اسی قسم کا ایک شعر کسی اور کا ہے ؎

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ — سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اول تو غم دنیا کی وجہ سے سر اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی اور اگر اتفاق سے فرصت بھی ملتی ہے تو اودھر آسمان کو دیکھا ادھر تو مجھے یاد آیا کیونکہ ظلم و ستم کے وجہ سے تو آسمان سے مماثل اور اسکا ہمسر ہے - اسی بہانہ سے غم کا سامنا ہوجاتا ہے یعنی غم سے فرصت پا کر سر اٹھانا بھی میرے لئے باعث غم ہے -

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب — قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

اے خدا میرے مکتوب شوق کا مضمون اس پر کیونکر ظاہر ہوگا کیونکہ اس کافر نے تو قسم کھائی ہے کہ اب جو کاغذ بطریق خط میرے پاس آئیگا - یا ہر کاغذ کو میں جلا دوں گا تو یقیناً اب وہ میرے مکتوب سے باخبر نہیں ہو سکتا مولانا نظم و حسرت صاحبان نے اسکی شرح یہ فرمائی ہے کہ خط کے کھولنے کی تو اس سے امید ہی نہیں اور اسنے جلا دینے کی بھی قسم کھائی ہے کاش کے جلاتا اور مکتوب سے شعلہ اٹھتا تو مضمون مکتوب یعنی حال سوز و گداز اس پر ظاہر ہوتا -

یہ مطلب بھی پیدا ہوتا ہے غلط نہیں ہے - مگر ذرا بعید ہے - صاف وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھا -

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے — ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

سوز غم دل میں چھپانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے آدمی آگ پرنیاں یعنی حریر میں لپیٹ سکتا ہے مگر سوز غم دل میں نہیں چھپا سکتا - بقول غالب -

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

مضموں دونوں ایک ہیں مگر الفاظ کا لباس جُدا جدا ہے۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا   اُٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ارادہ یہ تھا کہ ذرا اپنے زخمیوں کو دیکھ آئیں مگر سیر گل کا بہانہ کیا۔ گویا گل اوسکے زخمی تھے اونکا تماشہ دیکھنے گیا تھا ذرا بہانے کی شوخی تو دیکھئے کہ اپنے زخمیوں کے دیکھنے کو پھول کی سیر سمجھتے ہیں قریب قریب ایسا ہی مضموں ہے جو گذر چکا۔

ہوا ہے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل   کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا   ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

ہم اپنی سادگی سے اس التفات ناز پر مر مٹے کہ تو یہاں تک آیا۔ یعنی ہمکو یہ دھوکہ ہوا کہ تو نے ہم پر مہربانی کی حالانکہ یہ بھی ایک تیرا ناز تھا۔ یعنی ادہر آیا اُدہر جانے کا قصد ہے گویا آنا جانے کی تمہید بن گیا۔ اور اس سبب سے یہ التفات التفات ناز ہو گیا۔

لکد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی   مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

مری طاقت سے اب حوادثات زمانہ بھی نہیں اُٹھ سکتے یا ایک وقت میں یہ ایسی قوی تھی کہ بتوں کے ناز اٹھانے کی ضامن تھی۔ گویا ناز بتاں لکد کوب حوادث سے زیادہ ہے۔ یا یہ کہ میری طاقت ضامن اس بات کی تھی کہ بتوں کے ناز اٹھائے آخر یہ اسکے ساتھ لکد کوب حوادث کا طوفان کیسا آیا۔ میری طاقت اس کا تحمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب   بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اہل جہاں کے اوضاع شریفانہ کی کیا خوبی بیان کروں جس سے بارہا ہم نے نیکی کی اوس نے ہم سے بدی کی۔ نیکی۔ انمیں قافیہ معمولہ ہے۔ قواعد قافیہ میں معمولہ قافیہ کو عیوب میں سے سمجھا گیا ہو۔ مگر آجکل اسکو صنعت میں داخل کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ اب بھی شعر کو ویسا ہی سست کر دیتا ہے جیسا کہ پہلے کرتا تھا اور اسی وجہ سے یہ عیب میں داخل کیا گیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ اول تو قوافی ہی کی قید ہماری شاعری پر بلا ہے کہ شاعر کو

مجھ سے کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسکے ساتھ جب صنعتوں وغیرہ کا التزام کیا جاتا ہے تو سر رشتہ معانی و فصاحت و بلاغت سب غائب ہو جاتے ہیں اور شعر جسکی صفات میں سادگی جوش حقیقت اثر وغیرہ ہیں وہ بالکل رخصت ہو جاتے ہیں - اس لئے ہمیشہ احتراز لازم ہے - البتہ بے تکلفی کے ساتھ اگر کوئی صنعت آجائے تو وہ حسن شعر ہے

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

آرزو خرامی سے مراد آرزو کا چکر لگانا - اور گشت کرنا ہے نہ یہ کہ جیسے مولانا نظم سمجھے ہیں کہ آرزو خرامی سے مراد خرام حسب آرزو مراد ہے - اور اسی بنا پر ترکیب کو واہیات قرار دیا ہے -

مطلب یہ ہے کہ اے آرزو تو جو دل میں پھرتی ہے اور امید رکھتی ہے کہ جوش گریہ سے کچھ نفع حاصل ہوگا سو یہ تجھ سے اس سے ہاتھ دھو بیٹھ یعنی نا امید ہو جا - (جوش گریہ سے ہاتھ دھو بیٹھنا بے مثل ٹکڑا ہے - یعنی اس سے بس اتنا ہی فائدہ متصور ہے کہ تو ہاتھ دھو بیٹھے باقی کچھ نہیں) کیونکہ دل جوش گریہ میں ایک ڈوبی ہوئی آسامی ہے (ڈوبی ہوئی اسامی وہ جس سے لگان وغیرہ وصول ہونے کی امید نہو) یعنی اس سے تجھے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ڈوبی ہوئی اسامی بھی اس محل پر خوب صرف ہوا ہے -

اسامی جمع ہے اسم کی چونکہ زمیندار اپنے کاغذات میں فہرست وار کاشتکاروں وغیرہ کا نام لکھتے ہیں اس صورت سے اسامی مستقل کاشتکاروں و قرضداروں وغیرہ کے معانی کے لیے موضوع ہو گیا - اور یہ ایسا ہی لفظ ہے جیسے قارورہ جسکے اصل معنی شیشی کے ہیں چونکہ طبیبوں کو اکثر پیشاب دکھاتے ہیں اسواسطے اسکے مستقل معنے پیشاب کے مقرر ہو گئے - اس قسم کے ہزاروں الفاظ مل سکیں گے - فارسی میں اسی قسم کے محاورے بہت ہیں -

اس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھا دے میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

جس شمع کو کسی نے بجھا دیا ہو اور وہ تمام جلنے باقی ہو میں بھی ایسا ہی ہوں کہ پورے طریق سے جلنے نہ پایا تھا کہ مجھے بجھا دیا - اور میں اس سے بلکیا ہوں - اسی مضمون کا یہ شعر ہے جو گذر چکا -

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے　　　　اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف

کیا تنگ ہم ستمزدگاں کا جہان ہے　　　　جسمیں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہم غمزدوں ستم رسیدوں کا جہان اتنا تنگ ہے کہ ایک بیضہ مور اسمین آسمان کی برابر ہے یعنی جہان میں ہمارے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ (ستمزدگاں) اچھا نہیں ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　　　پرتو سے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

کائنات کی حرکت تیرے ذوق کی وجہ سے ہے۔ یعنی شوق میں تیری طرف دوڑ رہی ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہ آفتاب کے پرتو سے ذرہ میں جان پڑجاتی ہے۔

حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ　　　　غافل کو میرے شیشے پہ مے (کا / ہے) گمان ہے

میرا شیشہ پتھر کی چوٹ کھا کر لالہ رنگ ہو رہا ہے لیکن غافل کو یہ گمان ہے کہ اسمین شراب سرخ بھری ہے۔

کی اسنے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا　　　　آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

وہ سینۂ اہل ہوس یعنی رقیبوں میں جا کر رہا ہے اوسے پسند کیوں نہ آئے وہ مکان ٹھنڈا ہے یعنی اونکے دلوں میں سوز عشق تو ہے نہیں۔ (جا گرم کرنا) فارسی کا ترجمہ ہے جو ٹھنڈے مکان کی رعایت سے لایا گیا ہے۔ مگر کچھ اچھا نہیں ہے۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا　　　　بس چپ رہو ہمارے بھی منھ میں زبان ہے

کیا آپنے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس رہنے دو خفا ہو ہمارے منھ میں بھی زبان ہے کچھ در منھ سے نکل جائیگا۔ ایسے مضمون کا ایک شعر انور دہلوی شاگرد مرزا غالب و ذوق مرحوم کا مجھے یاد ہے جو بہت ہی خوب ہے۔

ع　نہ میں سمجھا نہ تم آئے کہیں سے　　　　پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

جو سایۂ دیوارِ یار میں بیٹھا ہو وہ گویا ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ چونکہ ہندوستان بھی کالا ملک ہے اور سایہ بھی سیاہ ہے اس واسطے ہندوستان کی تخصیص بیجا نہیں ہے۔ اسمیں اعلان نون بعد اضافت کیا گیا ہے جو اب متروک ہے مگر غالب اور ذوق وغیرہ کے وقت تک جائز تھا اور اس قسم کے اشعار ان بزرگوں کے کلام میں اکثر مل سکتے ہیں۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

میرے جگر کو داغ غم نے ایسا مٹا لیا۔ کہ اب اگر کسی سے یہ کہوں کہ میرا داغ جگر کا نشان ہے تو کسیکو مجھ سے اس کہنے کا یقین نہیں آسکتا۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ اسکے جسم میں پہلے جگر تھا بلکہ سب جھوٹ سمجھیں گے کسیکا شعر ہے

ہوتا جو دل تو تمکو دکھاتا میں داغ دل اب کیسا دکھاؤں اب تو نہ دل ہے نہ داغ ہے

ہے یار سے عنادِ وفاداری اسقدر غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

ہم اس سے خوش ہیں کہ وہ ہم پر نامہربان ہے کیونکہ ہم اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہرگز وفاداری کا اعتماد ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہم کیسے ہی نامہربان ہوں لیکن وہ وفا کو ترک نہ کرے گا۔ یا یہ کہ اسکے عہد بیوفائی کے اقرار سے ہم خوش ہیں۔

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اے ظالم میرے درد سے تجھکو بیقراری ہے ہائے تیری غفلت شعاری کیا ہو گئی کہ میں مرتا اور غم کرتا تھا تجھے اوسکی پروا بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ غزل تمام اپنی معشوقہ ڈومنی کے مرثیہ میں کہی ہے یا کسی دوسرے کو اوسکے معشوق کا مرثیہ لکھکر دیا گیا ہے۔ مگر جیسے درد کے شعر ہیں ان سے صاف صاف یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ سب آپ بیتی ہے دوسرے کے لئے ایسے دردناک اشعار لکھنا محال ہیں۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

اگر تو مجھے رنجیدہ دیکھ کر برداشت نہ کرسکتا تھا تو تو نے میری غمگساری کا کیوں دم بھرا تھا
مجھ سے بے خبر رہنا تیرے لئے اچھا تھا۔

کیوں مری غمخوارگی کا تجھکو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

تو نے میری غمخواری کا ارادہ کیا تھا۔ مگر میرے درد کی تاب نہ لاسکا اور آخر اپنی جان
کھو دینی پڑی گویا میرے ساتھ دوستی کرنا اپنے ساتھ دشمنی تھی۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اگرچہ تو نے میرے ساتھ عمر بھر کے لیئے وفا کرنے کا عہد کیا تھا۔ مگر کیا فائدہ ہوا کمبخت
عمر بھی تو ناپائدار ہے آخر اُسنے دغا دی۔ تو خود مجھ سے جدا ہوا تو دوستی سے جدا کر دیا۔

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی — یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

مجھے زندگی کی آب و ہوا زہر معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسکی تجھ سے موافقت نہ تھی۔ لہذا جو
وہ تیری دشمن تھی میں بھی اوسکا دشمن ہوں اور وہ مجھے بری معلوم ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ
تیرے مرنے کی وجہ سے اب میرا بھی جینے سے دل بیزار ہے۔

گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا — خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

کبھی تیرا جلوہ گلفشانی کیا کرتا تھا۔ اور آج یہ وقت ہے کہ تیری قبر پر لالہ کاری ہو رہی ہے
اور پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔ ہائے تیری گلفشانی جلوہ کو کیا ہو گیا۔

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

تجھے عشق کی رسوائی پسند نہ آئی اور بس شرم سے نقابِ خاک میں جا چھپا۔ الفت و محبت
کی پردہ داری تو نے ختم کر دی۔ اس سے زیادہ کوئی رسوائی عشق کو کیا چھپا سکیگا۔

حکیم مومن خاں مرحوم نے بھی اپنی معشوقہ کے مرثیہ میں پردہ کا ایک شعر کہا ہے جو حد سے زیادہ درد میں ڈوبا ہوا ہے ۔

بے پردہ جسکو صحن میں دیکھا نہ تھا کبھی ۔ لاش اوسکی جا بجا ہے سر بازار ہائے ہائے

خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی ۔ اٹھ گئی دنیا سے رسم و راہ یاری ہائے ہائے

شرم پیمان محبت کو تو نے خاک میں ملا دیا ۔ دنیا سے راہ و رسم محبت اوٹھ گئی تو نے مجھ سے بیوفائی کی گویا اس شعر میں شکایت کر رہے ہیں مگر اس سے درد مترشح ہوتا ہے اور یہ ایک بین ہے ۔

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ۔ دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے

میرے دلبر ابھی تیغ محبت سے گہرا زخم نہ کیا تھا کہ تیغ زن کا ہاتھ ہی بیکار ہو گیا ۔

کسطرح کاٹے کوئی شبہائے تار برشگال ۔ ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

میری آنکھوں کو عادت پڑی ہوئی ہے کہ میں رات کو تیرے انتظار میں تارے گن گن کر تمام کروں مگر اب یہ برسات کی اندھیری راتیں ہیں کیونکر کٹیں گی کہ نہ تارے ہونگے نہ تیرے ملنے کی امید ہوگی رشب برشگال میں وصل معشوق زیادہ لطف دیتا ہے شعرا کے یہاں ایسے مضمون بہت ملتے ہیں ۔ اسی مضمون کا داغ مرحوم کے یہاں ایک شعر ہے

شب تاریک میں ہمکو گھٹا چھائی ہے ۔ کاش گنتے جو ہم دو ایک ستارے ہوتے

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال ۔ ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

نہ کان کو کوئی مژدہ پیام سننے کو ملتا ہے اور نہ آنکھ کو جمال یار دیکھنے کو ملتا ہے ہائے ہائے ہمارے پہلو میں ایک دل ہے اور اسپر یہ ناامیدواری ہے ۔

مولانا نظم صاحب لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کے شعرا میں آتش و ناسخ وغیرہ اور دلی میں ذوق و مومن وغیرہ مصنف کے زمانہ سے کسی قدر پیشتر ہی ہیں ۔ تس پر کسی کے کلام میں نہیں ہے نہ لکھنؤ نہ دلی میں عرصہ سے یہ لفظ بولا جاتا ہے مصنف کے قلم سے اس لفظ کا نکلنا نہ چاہیئے تھا

حیرت ہے۔ اور یہ لفظ اسیات کا شاہد ہے کہ مرزا نوشہ مرحوم کی زبان دلی کی زبان سے کسی قدر علیحدہ ہے۔ انتہی۔

میں کہتا ہوں۔ کہ یہ لفظ آجتک دلی کے روزمرہ میں داخل ہے۔ مجھے یہ یاد ہے کہ مومن خاں کے یہاں میں نے یہ لفظ کئی جگہ دیکھا ہے اور غالباً ناسخ کے یہاں بھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے شعر یاد نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسکا استعمال عام ہے مثال کے لئے میں دو ایک شعر لکھتا ہوں۔

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجئے کیونکر — ایک تو یار ہے اور تسپہ طرحدار بھی ہے

مجروح ہے سب سینہ تسپہ ہے نمک باشی — آنکھوں کے لڑانے کا ہم خوب مزا دیکھا

طاقت نہیں ہے جان میں کڑھنا تعب ہے اور — بے لطفیاں کرو ہو یہ تسپہ غضب ہے اور

راجہ جسونت سنگھ مرحوم معروف بہ کاکاجی ابن مہاراجہ بینی بہادر نائب نواب شجاع الدولہ شاگرد لالہ سرب سنگھ دیوانہ۔

بحر ہستی میں ترا جسم ہے مانند حباب — تسپہ الکدم کی ہوا کھانے پہ مسرور ہے تو

اے دل انداز تو ہی کر انصاف — ہے یہی طرز دلربائی کی

عہد کیا کیا تھے اور قول و قرار — آہ تسپہ بھی سب بے وفائی کی

لیجئے ناسخ کی ایک رباعی یاد آئی۔ اسمیں تسپہ بندھا ہوا ہے۔

رباعی
ہر چند ہوں پیر اور سر پر ہے اجل — تسپہ نہیں پیٹ کے سوا فکر عمل

ہے رشتہ عمر مختصر سا لیکن — شیطاں کی آنت ہے مرا طول امل

نظیر اور میر درد کے یہاں بھی بہت ہے میر حسن کے یہاں بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ مولانا نے اپنی شرح میں صرف اپنی معلومات سے کام لیا ہے تحقیق کو دخل نہیں دیا۔ ایک جگہ مرزا غالب مرحوم نے غلطی لکھا ہے آپ نے بھی غالباً غلط بتایا ہے۔ اوّل تو غلط کہا ہے پھر یہ کہہ کر ٹال گئے ہیں کہ ہندیوں کا تصرف ہے۔ فرماتے ہیں کہ قدیم اردو میں بھی "ی" نہیں بڑھائی گئی تھی۔ اور اسپر میر تقی مرحوم کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

غلط اپنا کہ اس جفا جو کو — سادگی سے ہم آشنا سمجھے

مگر یہ خیال نہیں فرمایا کہ میر صاحب یوں بھی فرماتے ہیں

شعر
سب غلطی رہی بازی طفلانہ کی یکسو — وہ یاد فراموش تھے ہمکو نہ کیا یاد

یا یوں سمجھئے کہ غالب اساتذہ مسلم سے ہیں۔ اگر بھول کر ایک جگہ غلطی ہو گئی تھی تو دوسری جگہ نہ ہوتی۔ ایک جگہ اور فرماتے ہیں۔

سو دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار اسد　　غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ　　رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

میرے عشق نے ابھی وحشت کا رنگ نہ اختیار کیا تھا کہ معشوق نے جان دیدی۔ مجھے جو اسکے عشق میں ذلت وغیرہ کی خواہش تھی وہ دل ہی میں رہ گئی۔

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے　　تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

مجھے اپنی سرگشتگی میں اپنی زندگی سے نا امیدی ہو گئی ہے لہذا میری تسکین کو نوید دینی چاہیے کہ تیری خوشحالی کا زمانہ قریب ہے کیونکہ اپنے مرجانے کی اُمید ہے۔ یعنی میں وہ دیوانہ ہوں کہ مرکر مجھے تسکین ہوگی۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر　　اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

اب تک سے یہ معنے پیدا ہوتے ہیں کہ میرا دل مٹ گیا تباہ ہو گیا۔ اور وہ اسکی اس خیال سے خبر نہیں لیتا کہ میرا دل ابھی تک میرے پاس ہے۔

کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک　　ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

اپنے تپ غم کا سرور کیا بیان کروں کہ اس کی وجہ سے میرا ہر ایک موئے تن زبان سپاس بن گیا ہے قاعدہ ہے کہ جب تپ چڑھتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسکو زبان سپاس کہا گیا ہے تلک اب متروک ہے۔ اگرچہ بقول مولانا نظم بلا وجہ ہے۔ کیونکہ یہ لگ اور تک ہیں کے بعد پیدا ہوا۔ اب بجائے تلک کے تک صحیح ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ زبان کے دائرہ کو بلا وجہ تنگ کرتے جاتے ہیں اول تو خیال کیا جائے کہ اردو زبان خود ہی ایسی تنگ ہے کہ جو مضامین دوسری زبانوں میں چار چار سطر میں ادا ہو جاتے ہیں اسکے لیے چار چار سطریں رکھنی چاہیئے مگر اسپر بھی چلینا نہیں ہے۔

ہرچند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا

وہ جو میری قدر نہیں کرتا اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ ناحق پسند اور جفاکیش ہے نہیں اسکے پاس دلِ حق شناس ضرور ہے مگر غرورِ حسن اسکو اسطرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

پیا جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو سردی ہی راس ہے

جسقدر شبِ مہتاب میں شراب ملے پی۔ کیونکہ شبِ مہتاب کا مزاج بلحاظ سردی یا بلحاظ رنگ۔ یا بوجہ مرطوب ہونے کے بلغمی ہے۔ اور بلغم میں گرم دوائیں دیجاتی ہیں کیونکہ اکثر حکما علاج بالضد کرتے ہیں۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

ہر ایک مکانکی رونق مکیں سے ہوتی ہے مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل ویران معلوم ہوتا ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ بے وقوف ہیں انکو خاموش رہنا مناسب ہے تاکہ ان کے راز کسی پہ کھلیں اگر یہ واقعی ہے تو میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ہر وقت خاموش بیٹھے رہنے کی عادت ہو گئی ہے میرا راز کوئی نہ سمجھ سکیگا۔ مگر یہ خیال غلط ہے میری خاموشی ایسی ہی جو مجھے بیوقوف سے زیادہ ثابت ہوگی۔
دوسرا پہلو اسمیں یہ بھی ہے کہ خاموش رہنے کا صرف اک یہ فائدہ ہے کہ کوئی راز دل پر وقوف نہیں پا سکتا ہے مگر میں خوش ہوں کہ میں وہ مجذوب ہوں کہ اگر میں خاموشی سے بھی کام نہ لوں تب بھی کوئی میری بے تکی بڑ کو سمجھ نہیں سکتا ہے۔ یعنی یہاں بغیر خاموشی بھی فوائدِ خاموشی حاصل ہیں۔

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلا
دل فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

میں اپنی حسرت اظہار کا کس کے سامنے گلا کروں بس میرا دل ہی اس کو خوب جانتا ہے کہ کسقدر مجھے حسرت دل کا اظہار کرنا چاہیے تھا اور زبان سے کسقدر اظہار ہو سکا۔ گویا میرا دل ایک جمع اور خرچ کی فرد ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسقدر حسرت اظہار اسمیں جمع ہے وہ زبان کے ذریعہ سے کچھ بھی خرچ نہیں ہو سکی ایک جگہ ایسے ہی مضمون کا ان الفاظ میں اظہار کر چکے ہیں۔

۵ نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے ۔ میری نظر میں ہے سب جمع و خرچ دریا کا

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا ۔ رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

اس شعر میں آئینہ پرداز کے معنے غالباً جلوہ گر ہونے کے لئے ہیں یعنی اے خدا رحمت جو لب بے سوال کی طرف سے عذر خواہی کرتی ہے وہ کس پردہ میں حیران اور سرگشتہ جلوہ گر ہو رہی ہے۔ میں لب بے سوال رکھتا ہوں میری وہ عذر خواہی کیوں نہیں کرتی۔ اور مجھ پر رحم کیوں نہیں ہوتا۔

جناب نظم صاحب کی شرح کا مطلب اگرچہ میں نہیں سمجھا۔ مگر لکھے دیتا ہوں خدا جانے کیا فرمایا ہے ممکن ہے کہ ناظرین سمجھیں۔ لب بے سوال کا بے نفس ہونا ضرور ہے اور لب بے نفس کو لب بے سوال اس مناسبت سے کہا ہے کہ نفس کے پہنچنے سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے۔ تو ضرور ہوا کہ آئینہ پرداز سے ملنے کی خواہش لب بے سوال سے کرنا چاہیئے اور آئینہ پرداز وہ جو آئینہ کو جلا کرے رحمت کا فعل محذوف ہے یعنی رحم کرے۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی ۔ اے شوق منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

اے شوق تو یہ خیال کرتا ہے کہ ہم نے دشمن کو دوست سمجھ کر اسے اپنا دل دیدیا یہ تیرا خیال غلط ہے وہ ہمارا دشمن نہیں ہے بھلا وہ اور دشمنی خدا نکرے یہ تیرا خیال اس قابل ہے کہ تو اسپر شرمندہ ہو۔ یا یہ کہ اے شوق تو جو شرمندہ ہے کہ ہم نے دشمن کو دوست سمجھے ہیں غلطی کی یہ تیری شرمندگی خلاف اور بیجا ہے وہ دشمن نہیں ہے فی الحقیقت دوست ہے بھلا وہ اور دشمنی کا شیوہ اختیار کرے گا۔ ایک جگہ فرما چکے ہیں۔

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ۔ میں اور خدا نکردہ تجھے بیوفا کہوں

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان — نافِ زمیں ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

چونکہ حضرت علی وہاں پیدا ہوئے یا وہاں تھے محض اسکی وجہ سے لباسِ کعبہ مشکیں سے ایہام کیا ہے۔ یعنی لباسِ کعبہ خوشبودار ہے حالانکہ لباس سیاہ ہے۔ لہٰذا اسی سیاہ کو مشکیں کہہ کر خوشبودار کے معنی نکالے اور پھر نتیجہ مرتب کیا کہ اسکا مشکیں ہونا کچھ اسوجہ سے نہیں ہے کہ اسکو نافِ زمیں کہا گیا ہے۔ نافِ غزال خوشبودار ہوتی ہے اور مشک وہاں سے نکلتا ہے نہ کہ نافِ زمیں سے۔ یا مشکیں سے مراد دونوں جگہ سیاہ لیجیے مگر محض سیاہی میں کچھ قدمِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف نہیں نکلتی۔ یہ مضمون غالباً مصنف ہی کا ہے ایک جگہ فارسی میں بھی فرماتے ہیں۔

؎ از نکہتش نافِ زمیں نافِ غزال است — مشکیں ز چہ شد ورنہ لباسِ حرم آیا

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا — دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

میری صحرانوردی کے موافق چونکہ زمین پر میدان اور جنگل نہ تھے اور یہ اتنی وسیع نہ تھی تو زمین کو شرمندگی ہوئی اور پسینہ آیا۔ یہ دریا نہیں ہیں جو تم دیکھتے ہو بلکہ یہ اسکا پسینہ ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

عالم دنیا محض ایک وہم کی ٹٹی یعنی حلقۂ دامِ خیال ہے اسلئے فریب میں نہ آنا۔ یعنی ہستی ایک خیالی جال ہے اور اسی میں ایک عالم پھنسا ہوا ہے ورنہ دراصل ہستی کوئی چیز نہیں ہے۔ مت متروک اچھا نہ بجائے فصیح آنا صحیح۔ اسی مضمون کا یہ شعر ہے

؎ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو — حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

آخر تم ان شکووں کو جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں کھود کھود کر کیوں پوچھتے ہو مناسب یہی ہے کہ اس ذکر کو چھوڑ دو کیونکہ جن کو تم شکوہ سمجھے ہو وہ دراصل شکوہ نہیں ہیں بلکہ آگ ہے۔ ممکن ہے کہ بھڑک اٹھے اور فتنہ و فساد کو اشتعال ہو۔

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

اے دل اس درد و الم سے گھبرانا فضول ہے کیونکہ آخر کو یہ تمام دردوں سے نجات دہندہ ثابت ہوگا یہ ظاہر ہے کہ اگر اس صورت میں یہ درد و الم کچھ دنوں رہا تو ہمارا کام تمام کر دے گا اور کام تمام ہوا تو یہ آہ نیم شبی اور گریۂ سحری سب ناپید ہو جائینگے۔

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

تیرے خط کا کاغذ پر وفا گویا ایک حرف غلط تھا ۔ جو صرف ایک جگہ لکھا تھا سو خود بخود مٹ گیا

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

ظاہر تو اسکا یہ مطلب ہے کہ ہمارا دل ذوقِ فنا کی ناتمامی اور ناکامی پر کیونکر نہ جلے باوجودیکہ ہماری آہ اسقدر آتشبار ہے مگر پھر بھی ہم جل نہیں جاتے ۔
دوسرا مفہوم یہی طلب کا مسئلہ ہے جسکو مصنف پانچ چار جگہ نظم کر چکا ہے ۔
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے ۔ اے ناتمامی نفسِ شعلہ بار حیف

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

جب آگ کو پانی سے بجھاتے ہیں تو اس سے بھی آواز نکلتی ہے ۔ تو حاصل یہ ہوا کہ عاجزی کے وقت ہر کسی کے منھ سے فریاد نکل جاتی ہے ۔

ہے وہی بد مستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

جسکے جلوہ سے زمین سے لیکر آسمان تک تمام کا ایک ایک ذرہ سرشار اور بدمست ہو رہا ہے وہ اس بدمستی کا خود ہی عذر خواہ ہے کہ میرا جمال اور حسن ایسا ہے جس سے ہر کوئی بدمست اور سرشار ہونا چاہیے

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

مجھ سے یہ نہ کہہ کہ تو مجھکو اپنی زندگی کہا کرتا ہے خیر یہ بھی سہی کہ تیری جدائی کے سبب اور دنیا کے انکار کی وجہ سے آجکل میرا دل زندگی سے بھی بیزار ہے۔ گویا معشوق ان کو ستا رہا ہے۔ بہت خوب شعر کہا ہے۔

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا ۔ تجھ پہ کھل جائے کہ مجھکو حسرت دیدار ہے

میں نے عنوان نامہ یا سرنامہ پہ اپنی آنکھ کی تصویر اسواسطے کھینچدی ہے کہ کم از کم تجھے یہ معلوم ہو جائے کہ مجھے دیدار کی حسرت ہے۔ ذوق

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مُہر ۔ آنکھ اپنی ہو لفافہ خط پر لگی ہوئی

پینس میں گذرتے ہیں جو کوچہ سے میرے ۔ کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

میرے کوچہ سے اونہیں ایسی نفرت ہے کہ جب پالکی میں سوار ادہر سے گذرتے ہیں تو اگر کہار کندھا بدلنا چاہتے ہیں تو بدلنے نہیں دیتے کہ یہاں اتنی دیر بھی نہ ٹھہرنا چاہیے۔ یا یہاں ظلم و ستم معشوق مراد ہے کہ ایسا ظالم ہے کہ میں دیکھتا ہوں جب وہ میری گلی سے گذرتا ہے تو کہاروں کو کندھا بھی نہیں بدلنے دیتا۔ لفظ پینس۔ اور پنیس دونوں صحیح ہیں اسیطرح کاندھا اور کندھا دونوں درست۔ بعض آدمی کہتے ہیں کہ یہ ایک رکیک مضمون ہے۔ مگر اسکی رکاکت ہمیں معلوم نہیں کہ اسپر کچھ لکھیں۔ افسوس ہے کہ گالیاں کھانے کے مضمون رکیک نہیں ٹھہرائے جاتے اور جو مضامین واقعتاً نیچرل ہیں اور صحیح ہیں اونکو رکاکت سے متہم کیا جاتا ہے یا عجب

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے ۔ جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

میری ہستی ہستی نہیں حیرت آباد کی ایک فضا ہے جسمیں نام نالہ مثل عنقا موجود ضرور ہے مگر نالہ کا کہیں پتہ نہیں ہے یہ ظاہر ہے کہ حالت حیرانی میں انسان نہ نالہ کر سکتا ہے نہ فریاد کر سکتا ہے۔ یعنی میں سراسر حیران ہوں نالہ وغیرہ کچھ نہیں کر سکتا کمال حیرانی سے سمجھ میں نالے کا نام باقی ہے مگر اوسکا وجود نہیں ہے۔

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کسکو کوئی موسم ہو ۔ وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ہم خزاں اور بہار سے کچھ مطلب ہی نہیں رکھتے کوئی موسم ہو ہمیں بال و پر کے ماتم کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے ۔ اس شعر کی بندش نہایت چست ہے۔

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم — اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

معشوقوں کی وفا اتفاقی ہے ورنہ جذب وفا میں یہ تاثیر نہیں کہ وہ کسی کو مہربان کر سکے یا آہ و فریاد سے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ معشوق اس کو سنکر وفا کریں ۔ یہ ایک امر اتفاقی ہے۔

ف ۵ آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی — کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

میری شوخی اندیشہ سے رنج یاس و ناامیدی اٹھ نہ سکا ۔ حالانکہ یہ مایوس ہو چکی ہے اور یہی خیال ہے یہ ہاتھ مل رہی ہے مگر اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ از راہ تجدید بیعت تمنا اسکا یہ فعل ہے اور نکتہ اسمیں یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز کے فوت ہونے کا افسوس کر کے ہاتھ ملتا ہے تو گویا وہ از سر نو تمنا کرتا ہے کہ ہائے ایسا ہو جاتا تو کیا اچھا ہوتا ۔ آہ ایسا کیوں نہ ہوا ۔

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے — نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

اے ظالم عاشق بیمار پر اب بھی تو ستم کرتا ہے اب وہ قابل رحم ہے اوسکی ہستی اب کوئی ہستی نہیں ہے جس سے بقدر لتعض رکھا جائے ۔ بیمار وفا کی نبض چراغ کشتہ کا دھواں ہے کہ وہ متبدریج کم ۔ اور سرد اور کمزور ہوتا جاتا ہے اسی صورت سے آخری وقت کی نبض ہے آخری وقت نبض کی جو حالت ہوتی ہے اسے حکما نے یوں لکھا ہے ۔ ہو فی غایۃ الصغر والتواتر و یحدث عن کمال سقوط القوۃ و قریب الموت ۔ مولانا نظم نے اس آخری نبض کو دودی لکھدیا ہے دودی کمزور ضرور کرتی ہے مگر وہ بالکل قوت کو ساقط نہیں کرتی ۔ اسکی تعریف یہ ہے صدمہ تلے کالموجی فی الشہوق الا انہ لیس بعریضی ولا ممتلی ۔ ویدل علی سقوط القوۃ لکن لا بتمامہا ۔ مصنف کی تشبیہ یقیناً نظمی سے زیادہ بدیع ہے غالباً

۵ ازنالہام مرنج کہ آخر رسید کار
شمع خموشم و ز سرم دود میرود

دل لگی کی آرزو بیچین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بیرونقی سود چراغ کشتہ ہے

کیا کریں ہم کو دل لگی کی آرزو مجبور کرتی ہے ورنہ چراغ کی بیرونقی سے جیسے کہ اُسکو فائدہ پہونچتا ہے ایسے ہی عشق ترک کرنے سے ہمکو بھی فائدہ پہونچے گا۔

غرض یہ کہ دل لگی کی آرزو ہی ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہے اگر ہم اسے چھوڑ سکین تو نفع میں رہیں۔

اگرچہ بظاہر یہ زمین بڑی ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے مگر ہم نے دیکھا ہے کہ غالب نے مشکل سے مشکل زمین بھی ایسی اختیار کی ہے جسمیں اگر فکر کی جائے تو ہر شخص کچھ نہ کچھ اچھے شعر نکال لیگا اس سے غالب کے مذاق سلیم کا اندازہ ہوتا ہے۔ بخلاف دیگر حضرات کے کہ اونکی نکالی ہوئی سنگلاخ زمینیں گویا کہ انہیں کے واسطے تھیں۔ باقی ہیچ۔

بعض آدمیوں کا خیال ہوتا ہے کہ ہمیشہ سخت ترین زمینوں میں غزل لکھیں۔ مگر یاد رہے کہ وہ ہمیشہ اپنی طبیعت کو خراب کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مشکل زمینوں میں غزل لکھنے میں قافیہ پیمائی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا وہاں تو یہ فکر ہوتی ہے کہ مضمون کو کسی صورت سے اس قافیہ کے ساتھ گانٹھ دیا جائے باقی معانی کے لحاظ سے سوائے آورد کے آمد کا کہیں نام نہیں ہوتا۔ اور یہ ضرور ہے کہ آورد میں معانی آفرینی کسیقدر کر لیجئے مگر سادگی۔ اصلیت۔ جوش۔ اثر وغیرہ سے شعر بالکل علیحدہ رہتا ہے اور یہ شاعری ایسی ہے جیسے تیلی کا بیل رات بھر چلنے کے بعد بھی صبح کو اپنی ہی جگہ پر ملتا ہے۔

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

معشوق کی آنکھ اگرچہ خاموش ہے۔ مگر اس خاموشی میں بھی وہ گفتگو کرتی ہے اس پر یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ جو لوگ سرمہ کھا جاتے ہیں اونکی آواز نہیں نکلتی اور بستہ ہو جاتی ہے پھر آنکھ کہ جسمیں سرمہ موجود ہے اسکو آپ گفتگو کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ تو گویا دوسرا مصرعہ اس کا جواب ہے کہ سرمہ سرمہ نہیں ہے اس شمع کی آواز مثل ایک شعلہ کے ہے اور یہ مسلم ہے کہ شعلہ سے دھواں اُٹھتا ہے تو یہ سرمہ اُس شعلہ کا جما ہوا دھواں ہے

تو کو سے - تو گویی کا ترجمہ ہے -

بسکہ عشاق ساز طالع ناساز ہے — نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے

عشاق کے جسم گویا طالع ناساز کے لئے ساز ہیں اور نالہ اوسکے گردش ستارہ کی آواز ہے - حاصل یہ کہ عشاق طالع ناساز کے ہاتھ میں گویا ایک باجہ ہیں جس سے نالہ فریاد کی آواز نکلتی ہے - عشاق بھی فارسی میں ایک باجے کا نام ہے جیسے سعدی فرماتے ہیں -

ع در نالہ عشاق و نہاوند حجاز است - انجم سیارہ سے مراد ستارہ بد قسمتی ہے

دستگاہ دیدۂ خونبار مجنوں دیکھنا — یک بیاباں جلوۂ گل فرش پا انداز ہے

ذرا مجنوں کی چشم خونبار کی قدرت دیکھئے کہ تمام بیاباں کو اوسکی آنکھ کے خونی آنسووں نے گلزار بنا دیا ہے اور اس صورت سے گویا مجنوں کے قدموں کے نیچے ایک پھولوں کا فرش بچھا دیا ہے -

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

اسمیں سہی یہ معنی پیدا کرتا ہے کہ تو جو میرے عشق و محبت کو وحشت کہتا ہے اچھا میں بھی مانتا ہوں عشق نہ سہی وحشت ہی سہی - مگر یہ کیا کم ہے کہ میری وحشت سے تیری شہرت ہوتی ہے - نواب مصطفے خاں شیفتہ مرحوم یوں فرماتے ہیں

ع عشق ذلت ہے تو ذلت ہی سہی — میری ذلت تری عزت ہی سہی

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم سے قطع تعلق نہ کیجئے اگر محبت نہیں کرتے تو عداوت ہی کیجئے - اس مضمون کو مصنف نے بہت جگہ لکھا ہے - جیسے کہ ع

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو — کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو

اب جفا سے بھی محروم ہم اللہ اللہ — اسقدر دشمن ارباب وفا ہو جاتا

شیفتہ مرحوم اسی مضمون کو یوں باندھتے ہیں -

خاک ہونے پہ مرے دھیان تو ہے　　نہ سہی لطف کدورت ہی سہی

(۱۲)

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی　　اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

اے کا لفظ یہاں بطریق ندا نہیں ہے بلکہ ایک محاورہ ہے۔ مگر یہ محاورہ اکثر عورتوں میں مستعمل ہے مطلب یہ ہے۔ کہ آپ کہتے ہیں کہ تو ہمارے یہاں نہ آ اگر کوئی ہم مجلس تو کرتے نہیں ہیں اسیکا یہ جواب دیتا ہے۔ کہ اے صاحب وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی مگر میں ہوں گا تو آپ کی کیا رسوائی ہو جائے گی۔

؎ ہمیں دوست اٹھا دینے کی آخر وجہ بھی کوئی　　یہاں بیٹھے ہیں تو کچھ آپ کا نقصان کر لیا

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے　　غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

(۱۳)

اسکے معنے مولانا نظم اور حسرت صاحب نے یہ لکھے ہیں۔ کہ کیا ہم اپنے دشمن تھوڑی ہی ہیں کہ اس بات کا یقین کر کے کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے پھر بھی تجھ سے محبت کئے جائیں اور رشک رقابت میں جان دیں مگر غور کیا جائے۔ تو لفظ بھی۔ اور سہی۔ اس بات کے شاہد ہیں کہ مصنف یہ نہیں کہنا چاہتا جو کچھ سمجھا گیا بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے تو سہی۔ ہم بھی جانتے ہیں۔ مگر ہم بھی تو دشمن نہیں ہیں۔ ہم بھی تو اپنے ہی ہیں۔ ہمکو بھی تجھ سے محبت ہے پھر ہمکو اسکے مقابلہ پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے۔

شیفتہ مرحوم نے الفت کا قافیہ خوب کہا ہے۔

؎ میرے آزار کی ہمت ہی سہی　　تمکو الفت ہے تو الفت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو　　آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

یعنی جو کچھ حاصل کیجئے اپنی ذات سے حاصل کیجئے دوسرے کی منت پذیری بہت بری ہے۔ اسمیں ایک پہلو تصوف کا یہ بھی نکلتا ہے۔ کہ جو کچھ حاصل کرو اپنی ہستی اپنی ذات سے حاصل کرو۔ چاہے وہ غفلت ہی کیوں نہو اور جب اپنی ذات سے غفلت حاصل کی تو یہ عین آگاہی ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام | دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

اگرچہ عمر بہت جلد گذر جاتی ہے تو اتنی فرصت تو ہے کہ اپنے دل کو خون کر ڈالیں۔ برق بھی گویا ابر کا خوں شدہ دل ہے۔ یہ شعر بھی خوب ہے۔

شیفتہ۔ اگرچہ جام غم در شک حسرتاں | پھر بھی فرصت ہے تو فرصت ہی سہی

اگرچہ یہ شعر بھی بہت خوب ہے مگر غالب کے یہاں نیا مضمون ہے۔ اور شیفتہ مرحوم نے ایک خوبی کے ساتھ پرانے پامال مضمون کو باندھا ہے۔

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں | نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کیا یہ سمجھ کر عشق سر بسر مصیبت ہے۔ یا عشق میں سب ہی مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے ہم وفا ترک کر دیں گے ایسا نہیں ہو سکتا۔

س موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے | آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا

کچھ تو دے اے فلک ناانصاف | آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

اے آسمان ناانصاف مجھے کچھ تو دے۔ اگر میری مراد نہیں دیتا۔ تو آہ و فریاد کی اجازت تو دے تو نے وہ کیا ہے کہ س

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے | گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ایک جگہ یوں کہہ چکے ہیں س

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی | ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے

اس شعر میں حسرت و ارزو کا خاکہ کھینچ گیا ہے اور اگرچہ اسمیں لفظ رخصت استعمال کیا گیا ہے جو اردو میں بجائے اجازت کم مستعمل ہے مگر اس شعر میں نہایت لطیف ہے۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے | بے نیازی تری عادت ہی سہی

ابھی تو ہم یہ نہ سمجھے تھے کہ تو بے نیاز ہے اور عجز و نیاز وغیرہ سے کچھ کام نہیں چلتا ۔ اب معلوم ہوا کہ بے نیازی تیری عادت ہے لہٰذا اب ہم بھی تسلیم و رضا کی عادت ڈالیں گے کہ تیری بے نیازی کو بخوشی خاطر برداشت کرسکیں ۔

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

یار سے کچھ نہ کچھ چھیڑ چلی جائے کچھ نہیں تو اظہار حسرت و ارمان کی حسرت ہی سہی اس سے یہ لطیف معنے بھی پیدا ہوتے ہیں کہ ہم جو اسکو حال سنانے کے لئے مجبور کرتے ہیں تو وہ اسکو چھیڑ سمجھتا ہے ۔ اچھا خیر یہ چھیڑ جاری رہنی چاہیئے ۔

مومنؔ ہاں جوش تپش چھیڑ چلی جائے گر یہ تو
چھوٹ جائیں گے قفس سے جو کسی دام نہو گا
فرسودہ اگر دام نہو گے

اس زمین میں نواب مصطفے خاں شیفتہ کا مقطع اور کئی شعر قابل داد ہیں ۔ تفریح طبع ناظرین کے لئے لکھنے پر مجبور ہوں ۔

نہ لکھو نامہ نہ بھیجو پیغام
عشق کی آپ سے نسبت ہی سہی

دیکھنا غیر کا موقوف تو ہے
قتل کی میرے ندامت ہی سہی

سب فسانہ کا نہیں ہے جو دماغ
ایک چھوٹی سی حکایت ہی سہی

ناشکیبی کی دعا مانگیں گے
صبر کی ہمکو ضرورت ہی سہی

ہجر تو جائے جو ہو جائے وصال
وصل ممکن نہیں فرقت ہی سہی

کیجئے اغیار سے ملنا موقوف
مجھکو الفت نہیں غیرت ہی سہی

وصل اغیار سے بیوجہ نہیں
میرے مرجانے کی عبرت ہی سہی

دعوی الفت و بیتابی حیف
گر اذیت ہے اذیت ہی سہی

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں
غیر اون سے تمھیں نفرت ہی سہی

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے صبح وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

میں دیوانہ ہوں ۔ ہرزہ گردی ۔ اور بیاباں نوردی ۔ بے آرامی وغیرہ میرے لیے بہت ضروری چیزیں تھیں ان سب کو چھوڑ کر جو میں وطن میں بیٹھ رہا ہوں ۔ تو صبح وطن

میرے اوپر نہیں رہی ہے اور اُسکا ہنستا بجا ہے کیونکہ آرام دراصل میرے لئے نہیں بنا ہے یہی بات ہے جیسے دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے اور مضمون کو بالکل نیا کر دکھایا ہے ۔

؎ نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی — مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی — جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

ایسے گانے والے آتش نفس کا گانا سننے کو جی چاہتا ہے جسکی آواز میرے حواس ہوش عقل جان و دماغ کے ساتھ بجلی کا کام کر جائے ۔ یعنی آواز کا شعلہ مجھے پھونک دے یعنی ایسا مست و بیخود ہوں کہ میری ہستی کا نشان باقی نہ رہے مولانا حالی مرحوم ایک شعر لکھتے ہیں

ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب — دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال — تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

وادیِ خیال کو اس مستانہ روش سے طے کر رہا ہوں کہ اب مجھے اُس استغراق سے اپنے میں آنیکا ہوش ہی باقی نہیں ہے اور اس راستہ کو مستانہ طے کرنیکی وجہ بھی یہی ہے کہ میں کسی خیال میں غرق ہو کر پھر ہوش میں نہیں آنا چاہتا ۔ کروں ہوں متروک ہے ۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

چونکہ تو باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے ۔ اور نکہت گل اسکا حظ اُٹھاتی ہے اسی بنا پر اب مجھے نکہت گل سے شرم آتی ہے کہ وہ میری ایک کامیاب رقیب ہے ۔ اب میری نظر اسکے سامنے نہیں اُٹھتی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

چونکہ میں نے ہمیشہ عاشقانہ شعر پسند کئے ۔ لوگوں نے میرا حال دل اس سے معلوم کر لیا اور سب مجھکو عاشق سمجھ گئے نظیری نیشاپوری کہتا ہے ؎

راز دیرینہ زرخ پردہ برانداخت دریغ — حالِ ما شہرہ بانشائے غزل ساخت دریغ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

جب ہماری زندگی اس صورت سے گذری کہ کبھی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی کبھی کوئی حقیقی خوشی نصیب نہیں ہوئی تو ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ ہمارے کوئی خدا تھا۔ بالکل اسی مضمون کو فارسی میں لکھا ہے۔

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
میتوان گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

اگرچہ غیروں سے اونکے اشارے ہوتے رہے۔ مگر اُسکی محفل میں میں غیرت سے کام نہیں لے سکتا۔ مجبوراً بیٹھا رہا نہ بیٹھتا تو کیا ہوتا مجبوراً چلا اپنے گھر چلا آتا۔ اور یہ بھی مجھے منظور نہیں تھا۔

یا یہ کہ لوگ مجھ پر آوازے کستے رہے پھر بھی بیٹھا رہا

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

آخر تیرا فولاد تو ہے نہیں سینے کے پہلو میں بھی اک دل ہی گیا تھا اس ارادہ سے کہ تیرے در پر صدا دوں مگر دربان کمبخت کا خوف معلوم ہوا مجبوراً بغیر صدا دیئے ہوئے واپس چلا گیا ورنہ میں اور تیرے در سے بغیر فقیرانہ صدا لگائے ہوئے ٹل جاؤں (یہ) [illegible]

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

مدت سے آب و ہوائے بہاری کی دعوت نہیں کی اس سے مصلے اور عمامہ گرو رکھکر شراب خریدتا پھرتا ہوں۔

بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

عمر اگرچہ کتنی ہی طویل ہو مگر پھر بھی بےفائدہ ہی گذر جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت خضر بھی کل قیامت کے دن کہینگے کہ ہم اتنی طویل مدت تک دنیا میں رہے مگر ہم نے کیا کیا۔ اس میں

ہیں چار کاف ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں اچھے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم — تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

اگر مقدور ہو تو خاک سے یہ پوچھوں کہ اے لئیم اتنے خزانے تجھ میں دفن تھے تو نے ان سے کیا کام لیا۔ مقدور کا لفظ بتہ دیتا ہے کہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر دولت میرے پاس جمع ہو جاتی تو میں لوگوں کو فائدہ پہونچاتا اور زمین کو طعنہ دوں کہ آخر تو نے اسقدر خزانوں سے کیا کام لیا۔ کسی کو کیا فائدہ پہونچایا۔ ناظم صاحب گنجہائے گرانمایہ سے وہ معزز لوگ جو مدتوں ہو چکے ہیں مراد لیتے ہیں۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

جیسے فقرے تراشنا محاورہ ہے ایسے ہی تہمتیں تراشنا محاورہ ہے یعنی کس دن دشمنوں نے ہم پر تہمتیں نہیں لگائیں اور ہم پر ظلم نہیں کیا۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

وہ وصل میں بغیر التجا بوسہ دینے لگا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بری عادت رقیب نے سکھا دی ہو۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

اگر اس سے ضد پڑ جائے تو پھر اوسکا تو ذکر نہیں مگر واقعی اسکی عادت بری نہیں ہے اگر بھول گیا ہو تو بہتیرے اسی دفعہ اس نے وعدے پورے کر دیئے ہیں۔

غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا — مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

غالب تم جہاں اس بھروسہ پر ہو کہ وہ ہماری داستاں کو سن لینگے۔ اچھا یہ بھی مانا۔ تم نے اپنا قصہ ادا کیا اور انہوں نے سن بھی لیا۔ مگر کیا وہ کچھ جواب بھی دینگے۔ اور تم ہی سوچو تمہیں بتاؤ کہ تمہاری بے تکی باتوں کا وہ جواب کیا دینگے۔ یہ گویا کوئی غمخوار ہے جو غالب کو سمجھا رہا ہے۔

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے

اس ۔۔ دیکھا جائے کب تک طلوع دیکھا جا ہی مجھے

جیسے کہ گردشِ آفتاب سے جس میں صبح و شام کا ۔۔ ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا جس میں اکثر

سال کا حساب کیا جاتا ہے اسی طرح سال عمر کا حساب ۔۔ برق مرحوم نے خوب خوب غزلیں لکھی ہیں

طرح تیز گذر جاتے ہیں۔ کیونکہ عمر کی رفتار ۔۔ راہ کی زمین میں مطلع سناتے ہیں۔ دیکھیے ہر شخص نے

کو آفتاب بنا کر اوس سے حساب کرنا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک نے ایسا کہا ہے کہ ایک سے بہتر دوسرا

مینائے مے ہے سرو نشاطِ بہار سے ۔۔ دلی آگے ہے نہ پیچھے ۔۔ برابر ہیں۔

پھر بھڑکا گئے ہو ۔۔ مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

بہار کی خوشی میں مینائے سرو آ جاتا ہے ۔۔ تھا متا ہوں لکو دل ہاتھ سے نکلا جائے ہے

بال کشائی تدرو معلوم ہوتی ہے تم

ردیف ب میں ذکر کیا ہے۔ ساغر اندیشہ میں ۔۔ آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

سے پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب ۔۔ اور ایسی ہی آتش گرمی ہے تو دل سے ہاتھ دھو لینا چاہیے کیونکہ

صلو ۔۔ جگہ اور مینائے مے کو ۔۔ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ایک ایسی تیز شراب ہے جسے مینا کہا جا سکتا

۔۔ قطرہ آب رنگ ۔۔ صاحب نے ادا کیا ہے فرماتے ہیں سے

۔۔ ہے اس سے تشبیہ

۔۔ ہے سرشتہ ۔۔ یعنی یہ ہے

۔۔ مضامین آفرینی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہے۔ اور جس ۔۔ نکلتا ہے ۔۔ عجز کر رہا ہے

ہے پا شنہ پائے ثبات کا ۔۔ نے بھاگنے کی گوں اقامت کی

دوسرے ایک شعر میں گویا مصنف نے اسکی شرح خود لکھی ہے فرماتے ہیں کہ

ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی ۔۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

یہاں پائے ثبات کہکر اور زیادہ نازک مضمون کر دیا ہے۔

جا داد بادہ نوشی رنداں ہے شش جہت ۔۔ غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

دنیا رنداں بادہ نوش کی جاگیر داد ہے اور غافلوں کا گمان یہ ہے کہ وہ گیتی

ایک نگاہ ۔۔ دے

شوق کو آرائی وحدت ہی پرستاری وہم کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

یعنی وحدت کو لباس کثرت میں آراستہ کرنا اور وحدت کے ساتھ کثرت کا شمار رکھنا یہ وہم کے سوا اور کچھ حقیقت نہیں رکھتا ہے - اور انہیں خیالی اصنام نے مجھے کافر بنا دیا ہے یعنی وحدت کے ساتھ ہی ساتھ کثرت کا خیال آتا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ جب وحدت کے ساتھ کوئی دوسرا خیال آیا تو حقیقتاً وحدت کو وحدت نہ سمجھا - اور یہی علامت کفر ہے - یا یہ کہ یہ خیال کرنا کہ کثرت وحدت سے ہے تو یہ پرستاری وہم اور باعث کفر ہے کہ نہیں ایک کے ساتھ دوسرے کا ذکر نہ کرنا چاہیے -

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا خواب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

اب کبھی مجھے خیال میں بھی سیر گل و گلستان کا خیال نہیں آتا - میری بے پروبالی نے مجھے بہت آرام دیا سودا سے

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے کہ جنے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

وہ ... ہیں لالہ داغ ساماں ہے برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

... ہم نے خود ان تینوں شعروں کا جو دیباچہ ہیں مطلب بیان کیا ہے ... مناسبت ہے داغ ساماں مثل انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جسکا ... ت لالہ کی منحصر نمایش داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا اگر پھول ... میں ... شہید سمجھ بیٹھے کہ پھول کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے ... کا بیج ... میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم غالب ... یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے مزار رنج کا - وہ لہو جو کشت ... مناسبت آپ ... کی راحت کے خرمن کا برق ہے حاصل موجودیت داغ مانا - ہم نے ... اور صورت رنج ہے تھی اسی مضمون کا شعر گذر چکا ہے بھی دیکھیے - ... اوسکا بھی یہی ہے -

گویا کوئی غمخوار ... مضمر ہے اک صورت خرابی کا ہیولے برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم　　باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے

یعنی کلی جب تک نہ کھلے کہاں سازوبرگ عافیت کا حاصل ہونا یعنی آفت سے اس کا محفوظ رہنا کہاں سے معلوم ہے جب یہ حال ہوا تو گل کو باوجود دلجمعی پریشانی ہے اور غنچہ کو دل سے تشبیہ ہے اور جمعیت دل کی صورت بھی اس سے ظاہر ہے اسیطرح گل شگفتہ کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا پریشانی کی صورت ظاہر کر رہا ہے اور گل کی خاموشی اور بے حجابانہ رنگی خواب کا عالم دکھا رہی ہے غرض یہ کہ تینوں حالتیں گل پر طاری رہتی ہیں تو باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں رہتا ہے اور سبب پریشانی کا یہ ہے کہ اسے اندیشہ ہے کہ دیکھئے سازوبرگ عافیت اس دار بلا میں ممکن ہوتا ہے یا نہیں - ایسا ہی مضمون ہے جیسے دوسرے لباس میں یوں جلوہ گر کر چکے ہیں -

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہمسے رنج بیتابی کسطرح اٹھایا جائے　　داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

مطلب یہ کہ اس رنج کی تاب ہمسے نہ ہو سکے گی اور یہ ہلاک کر دے گا دست عجز سے وہ ہاتھ مراد ہے جو صدمہ کے دفع کرنے سے عجز رکھتا ہے - اسی سبب سے اُسے خس سے تشبیہ دی ہے اور داغ کو شعلہ سے پشت دست زمیں پر رکھنا عاجزی کرنے کے معنی پر ہے یہ ظاہر ہے کہ شعلہ کی آفت کو خس نہیں اٹھا سکتا وہ اُسے جلا کر فنا کر دیتا ہے - اور خس بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز کے معنی پر ہے یہ دوسرا پہلو اس شعر کے معنی میں نکلتا ہے یعنی میرے دست عجز کا داغ شعلۂ خس بدنداں ہے کہ میری طرف سے اظہار عجز کر رہا ہے کہ رنج بیتابی اس سے نہ اٹھ سکے گا -

یہ وہی اشعار ہیں جو مرزا مرحوم نے بیدل اسیر و شوکت کے رنگ میں کہے تھے اور جنمیں سے چند شعر اس دیوان میں باقی رہ گئے ہیں -

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب　　ہم بیاباں میں ہیں اور رضا مند گئی

ہم جنگلوں میں خاک اڑاتے پھرتے ہیں یہی ثابت ہوا اور تیری ایک نگاہ نے

پلنے دیا

سبزہ جما ہوا ہے گویا بہار آئی ہے۔ اس سے دو پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایسے دیوانہ ہیں کہ بہار کو چھوڑ کر جنگلوں میں پھرتے ہیں اور بہار کی بھی پروا نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ گھر کو چھوڑے ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا کہ اب وہ جنگل بن گیا ہے۔ مثل شعر کہا ہے۔ اس مضمون کو بھی مختلف پیرایوں میں مصنف نے کئی جگہ لکھا ہے۔ مثلاً

اگا ہے گھر میں سبزہ میری ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

سادگی پر اسکی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

میں چاہتا ہوں کہ اسکی سادگی پر اپنی جان دیدوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں کہ وہ ہاتھ میں قتل کرنیکے لئے خنجر لئے ہوئے ہے اور میری سادگی پر مر جانے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی جاتی ہے۔ سادگی سے مراد یہی ہے کہ خنجر اسکے ہاتھ میں نہو۔ پھر سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ کئی مرتبہ سادگی پر مر لینے کا ارادہ کر چکے ہیں مگر وہ ایسا ظالم ہے کہ جب انہیں دیکھتا ہے خنجر ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ ایک جگہ صاف الفاظ میں یوں کہہ چکے ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

گویا مصنف کے نزدیک سادگی خنجر سے زیادہ قاتل ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میں اسکی لذتِ تقریر میں اتنا محو ہوں کہ جو کچھ وہ کہتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات میرے دل میں تھی یعنی یہ کہ جو بات وہ کہتا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ اسی بات کے سننے کی مجھے حسرت ہے۔ یا یہ کہ اوسکی ہر ایک بات اتنی دلفریب ہے کہ اوسکے ہونٹوں سے نکلتے ہی میرے دل میں اتر جاتی ہے۔

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

مانا۔ تم نے ابھی میرا ذکر برائی سے کیا اور کیا جاتا ہے مگر باوجود ان سب باتوں کے میرا ذکر مجھ سے بہتر ہے کیونکہ اوس کی محفل میں اوسکا ذکر پہنچ تو گیا۔ میں تو کسی طرح وہاں جا ہی نہ سکا۔

گویا کوئی غمخوار [illegible] ضمر ہے اک صورت خرابی کی

بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائیگی   یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

اے ہجومِ یاس و نا امیدی میرے حالِ زار پر ترس کھا اور میرے دل میں تمنا اژدحام نکر۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ ہماری سعی بے حاصل ہو مگر ہمکو اسی میں اک لطف آرہا ہے۔ تو اسے پامال نکر۔

رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے   اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

میں جہاں تھک کر بیٹھ جاتا ہوں وہی اپنی منزل خیال کرتا ہوں اور میری واماندگی کو اسی منزل سے جو فی الحقیقت منزل نہیں ہو عشق ہو۔ اسی کی وجہ سے جو قدم منزل پڑ پڑا ہے وہ پھر اٹھ نہیں سکتا۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی   فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

یہ خاص مصنف کا طرزِ بیان ہو اور مضمون ایسی خوبصورتی سے ادا کرنے میں مرزا غالب مرحوم کو ید طولیٰ حاصل ہو۔ کہتے ہیں کہ اچھا آپ ہمکو فرماتے ہیں کہ تیرے دل میں تو ایک دوزخ بھری ہے اور وہ بھڑک رہی ہے مگر یہ بھی تو مہربانی کرکے بتا دیجیے کہ فتنہ شورِ قیامت کون ہو وہ حضور ہیں نہ آپ سراپا حشر ہوتے نہ ہمارے دل میں دوزخ ہوتی۔ یعنی دوزخ تو یقینی قیامت سے کو بھڑکائی جائیگی اسی اندازِ بیان کا ایک شعر مصنف کا فارسی میں ہے۔

سہ ہیچ و بوقت ذبح طپیدن گناہ ما   داشتہ دشنہ تیز شکر ول گناہ کیست

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب   رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

غالب کا دل دل نہیں ہو بلکہ طلسم پیچ و تاب ہے اور اسی میں تیری تمنا ہو لہذا اگر تو غالب کے دل پر رحم نہیں کرتا تو نکر اپنی تمنا پر تو رحم کر کہ کس مشکل میں ہے۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی   دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

تیری نگاہ کا تیر ایسا دلدوز تھا جو جگر دوز بھی ثابت ہوا اور تیری ایک نگاہ دے

لیکر چلا یک جلی گئی چونکہ دونوں آسکے منتظر تھے لہٰذا دونوں رضامند ہو گئے۔

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراق　　تکلیف پردہ داری زخم جگر گئی

لذت فراق بڑی اچھی چیز ہے جس سے ہمارے چھاتی شق ہو گئی ہے اور ہمیں زخم جگر کی پردہ داری سے نجات ملگئی۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اب وہ شراب جوانی کا نشہ باقی نہیں رہا ہے اب لہٰذا ہمکو بیدار ہونا چاہیئے بادۂ شبانہ استعارہ ہے جوانی سے اور سرمستیاں جوانی کے افعال سے خواب سحر بھی جوانی کی بیخبری استعارہ کیا ہے اسواسطے کہ صبح کی نیند میں بھی ایسی ہی غفلت ہوتی ہے جیسی کہ جوانی میں

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں　　بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

میری خاک یار کی گلی میں اڑتی پھرتی ہے شکر ہے اے ہوا میں تیرا ممنون ہوں کہ میرے دل سے بال و پر کی ہوس جاتی رہی۔ یعنی ظاہر ہے کہ اگر تو مجھکو نہ اڑاتی تو بال و پر کی حسرت ہوتی ہے۔

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا　　موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

گل کترنا۔ کوئی تعجب کا کام کرنا۔ یا ایسا کام کرنا جس میں فتنہ و فساد پیدا ہو یہاں پہلے معنی لیے گئے ہیں مصنف کہتا ہے کہ ذرا آسکے انداز نقش پا کی دلفریبی دیکھئے کہ اسکی موج خرام نے رستے میں کیسے گل کترے ہیں۔ یعنی قدم قدم پر چمن تیار بنا دیا ہے۔ کہ دل کے دل اور سیر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

میری نظارہ نے بھی وہاں نقاب کا کام کیا۔ اسطرح سے کہ جب وہ رخ پر پہونچا تو

مست ہوگیا اور وہیں منتشر ہوکر ڈھیر ہوگیا - اس صورت سے نظارہ نقاب بنا - بہت خوب شعر کہا ہے ۳
اور اسمیں عاشق کی محرومی کا نقشہ علی وجہ الکمال کھینچ دیا ہے - یعنی جب نظارہ جمال یار کا نقاب ہو
تو پھر اب اوسکے دیکھنے کی کیا توقع ہے -

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

یعنی اب بوالہوس بھی عاشق بن گئے تو اصلی عاشقوں کی کیا عزت رہیگی -
غالب ہمہ فریاد کہ عاشق ز ہوسناک ندانی
در پیش تو استاد و نو آموز مساویست

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

دی روز گذشتہ کل - اور فردا آنے والی کل - جس سے شعرا کے یہاں اکثر قیامت مراد
لی جاتی ہے کہتا ہے کہ کل جب تم گئے تو ہماری نظر سے - فردا اور دی کا فرق مٹ گیا - اور
گذشتہ کل ہی فردائے قیامت ہوگئی -

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

ہائے اسد اللہ خاں زمانہ نے تمکو مار دیا ارے اب وہ تمھارے ولولے اور تمھاری
وہ جوانی کیا ہوگئی اسد اللہ خاں اسوجہ سے کہا ہے جس سے اس وقت کا سطوت جبروت ظاہر ہو
بہت ہی خوب شعر کہا ہے - اسکی صفائی اور چستی بندش نے اسمیں کوٹ کوٹ
کر مضمون بھر دیا ہے -

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

ہمکو تسکین دل کی فکر نہیں ہے دل کو تسلی ہو یا نہ ہو - چاہتے یہ ہیں کہ بہشت کی
حوروں میں کوئی تیری سی صورت مل جائے - اگر ایسا ہو تو تسکین ہو یا نہ ہو ذوق نظر تو
ہوگا - ہم اسی پر قناعت کرینگے -

اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

تو اپنی گلی میں مجھے دفن نہ کر ورنہ تو دنیا میں قاتل مشہور ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں نہیں چاہتا کہ تیرے پاس رقیب آئیں اور میری قبر کا پتہ پوچھتے پوچھتے آئیں گے میرا رشک اسے گوارا نہیں کرتا۔ تیسرے یہ کہ تیرے نام کے ساتھ میں اپنا نام رکھنا نہیں چاہتا۔ یعنی تیرے وجود کے سامنے میں اپنی ہستی اور اپنی قبر تک کے نام مٹا دینے کے واسطے بھی تیار ہوں۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

گویا معشوق ساقی بزم ہے اور یہ بلا نوشی اور خم آشامی پر اتر آئے ہیں وہ دو چار جام ان کو پلا چکا اور ان کا دل سیر نہیں ہوا برابر سوال جاری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بس جتنی تو پیتا ہے اسکے موافق ہم تجھکو پلا چکے اب نہ دینگے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اے ندیم خیر تجھ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر اتنا کہ اگر کہیں نامہ بر ملجائے تو ذرا ہمارا اسلام کہدینا۔ کہ واہ خوب ہمارے خط کا جواب لائے کیا خوب شعر کہا ہے اور بھی کئی پہلو اسمیں جدید ہیں

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

مجنوں کی تعریفیں کیا ہمارے سامنے بیان کرتے ہو۔ وہ آزاد تھا کہ جنگلوں وغیرہ میں نکل گیا۔ مگر ہم کو تو غم پنہاں روک روک کر رکھتا ہے اگر اس سے ذرا ہمیں فرصت ملے تو ہم بھی تمکو بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا۔ اس سے دو مطلب پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ مجنوں نا حرکات کا تماشہ تم کو دکھائیں۔ ایک یہ کہ ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا تھا اور ہم کیا کرتے ہیں گویا مجنوں نے ہمارے مقابلہ پر کچھ بھی نہ کیا تھا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

ہمکو اسکی ضرورت نہیں ہے کہ خضر علیہ السلام کی پیروی کریں۔ ہم ان کے ساتھ رہنے کو صرف اپنا ہم رتبہ سمجھنے پر انحصار کئے ہوئے ہیں۔ جیسے ہم ایسے وہ۔ حاصل یہ کہ ہم نے خضر کے برابر جنگلوں کی سیر کی ہے۔

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا   تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار ذرا دیکھنا اگر تمکو کہیں غالب مل جائے۔ اسمیں لفظ دیکھنا کثیر المعنی لفظ ہے جس سے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ذرا اوسکی حالت زار دیکھنا۔ یا ذرا دیکھنا وہ آج کس رنگ میں ہے۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اگر ہماری زندگی کچھ دنوں باقی رہی تو ہم نے بھی اب اپنے دل میں کچھ اور ٹھان رکھی ہے دوسرے مصرع سے بہت سے معانی نکلتے ہیں۔ اور یہ کمال فصاحت ہے۔ حسب الارشاد جناب مولانا نظم صاحب کہ اسمیں المعنی فی بطن الشاعر ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ دوسرے مصرع میں لائے گئے ہیں یہ زبانزد عوام ہیں کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو ہمارا بھی ایسا ارادہ ہے یعنی تمکو کسی نہ کسی صورت سے اسکا بدلہ دینگے۔ یا یہ کہ ہم بھی مر جائینگے۔ اور اس قسم کے ہزار ہا الفاظ مروج اور داخل روزمرہ ہیں۔ جیسے اچھا ہم تو تمکو مزا چکھا دینگے۔ یا ہم بھی تمکو دکھا دینگے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسمیں شک نہیں کہ اسکی بندش نہایت چست ہے مگر غلطی کو چستی بندش نہیں مٹا سکتی۔

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں   سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

یعنی سوزِ غم آتش دوزخ سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور حرارت میں بڑھا ہوا ہے

بارہا دیکھی ہیں اون کی رنجشیں   پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

ہم نے اونکی رنجشیں کئی مرتبہ دیکھی ہیں مگر اسمرتبہ بیطرح خفا ہوئے ہیں سو خدا ہی خیر کرے آج رنگ بیڈھب ہے کھٹک رہا تھا کئی دن سے آبلہ دل کا۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر   کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

نامہ بر خط دیکر میرا منہ دیکھ رہا ہے کچھ نہ کچھ پیغام اوسنے اور بھی کہا ہے۔

یعنی ضرور مجھے برا بھلا کہلا بھیجا ہے - یا یہ کہدیا ہے کہ اب تو میں نے جواب دیدیا ہے آئندہ سے میرے پاس کوئی خط نہ لکھنا وغیرہ وغیرہ مصرع ثانی سے بہت سے پہلو نکل سکتے ہیں -

۵ قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم   وہ بلائے آسمانی اور ہے

ستارے اکثر عمروں کو قطع کرتے ہیں - یعنی ان کی گردش شبانہ روز سے زندگی کا اختتام ہوتا ہے مگر میرا معشوق جدا بلا ہی ہے - وہ زندگی کو بھی موت سے بدتر بنا دیتا ہے -

۶ ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

غالبؔ اب سب مشقتیں اور تو سب بلائیں ہم اٹھا چکے بس اب ایک یہ باقی رہگیا ہے کہ کبھی صدمہ میں کسی دن یکایک موت آجائے -

تمام غزل کے اشعار میں جستی بندش اور روزمرہ زبان وغیرہ کی داد نہیں دیجا سکتی - جو لوگ غالبؔ کو مشکل گو تصور کرتے ہیں انکو عبرت پکڑنی چاہیئے - یا جو لوگ بزعم خود غالبؔ کا اتباع کرتے ہیں اور بڑے بڑے موٹے الفاظ ٹھونس دیتے ہیں انکو ایسی غزلیں دیکھنی چاہئیں -

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

میری کوئی امید پوری نہیں ہوتی نہ کوئی امید پوری ہونیکی صورت معلوم ہوتی ہے یا یہ کہ اپنی امید ہی پوری نہیں ہوتی کہ کوئی صورت یعنی معشوق کی صورت نظر آجائے - یا کوئی صورت نظر نہیں آتی جس سے امید پوری ہونے کی امید ہو -

موت کا ایک دن معین ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

موت تو یوں نہیں آتی اوسکا ایک وقت مقرر ہے وہ اپنے وقت معینہ پر آئیگی مگر نیند کو آنے میں کیا عذر ہے وہ رات بھر کیوں نہیں آتی یا یہ کہ موت اپنے وقت پر آکر رہیگی - آخر نیند اسکے فکر میں کیوں اڑ گئی ہے -

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

میرا غم شب و روز ترقی پر ہے۔ پہلے یہ حالت تھی کہ اور کسی بات پر نہیں مگر اپنے دل کی دیوانگی پر ضرور مجھے ہنسی آ جاتی تھی اب یہ عالم ہے کہ اس پر بھی ہنسی نہیں آتی۔ اس شعر کی تعریف غیر ممکن ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہ نہیں ہے کہ میں زہد و اتقا کے ثواب سے نا واقف ہوں نہیں ان کے ثواب کو جانتا ہوں۔ مگر بد قسمت ہوں طبیعت افعال بد کی طرف رجوع ہوتی ہے ادھر طبیعت کو رغبت نہیں ہوتی۔ اس کے اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ایمان کے لئے کچھ تصدیق بالقلب ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اقرار باللسان بھی ضروری ہے۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

پہلے مصرع کی تعریف نہیں ہو سکتی جس کے کئی پہلو نکلتے ہیں یعنی۔ میرا خاموش رہنا ہی اچھا ہے اسی میں مصلحت ہے ممکن ہے کہ میں کچھ کہوں اور انہیں دلی کوئی شکایت اور گلہ لگ جائے اور وہ ناراض ہو جائیں یا ایک بے ہودگی کو پہنچے گا۔ یا معشوق نے مجھکو منع کر دیا ہے تو یہ مجھے بولنے کی طاقت باقی نہیں رکھی ہے۔ غرض ایسے ہی کچھ اسباب پیدا ہو گئے ہیں کہ چپ ہوں ورنہ میں بھی زبان رکھتا ہوں۔ جاتے اور پاس نہ آ سکینگے

یاد ہے کہ ... کا مضمون

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں مقصد یہ ہے کہ فرشتوں کی جانب سے

اگر میں نہیں روتا تو وہ مجھے یاد کرتے ہیں کہ او کم از کم ایسے موقع پر چیخ ... دلاز صورت حال و فریاد کرنا کیا معلوم ہوتا ہے از سر جانا کیا ایسا لکھ چکے ہیں مثلاً۔ روتا تو وہ مجھے یاد کرتے یعنی بلا لیتے ہیں اور مجھے کشتی کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ... کے لئے یاد کرتے ہیں۔

باغ بھی ہے سبز کھولوں ترا نشلوار شیشہ
چاہیے میرے لئے آئینہ خانہ وصل
شور کرتا ہے جو پازیب کا وا نشہ وصل

داغ دل گر نظر نہیں آتا بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

مرد ہے جو کہ ہم کو سر پیلا رکھے آ رہی ہے ... گنجائش نہیں ہے نہ کچھ پہلے تھی۔ چنانچہ

اگر تجھے میرا داغ دل دکھائی نہیں دیتا تو کیا تجھے داغ کی بو بھی نہیں آتی - یعنی میری محبت سے انکار ہے تو کیا تو میرے انداز مجنونانہ سے نہیں پہچان سکتا -

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی   کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یعنی اب ہمارا یہ حال ہے کہ اپنے حال کی بھی خبر نہیں دوسروں کی تو کیا خبر ہے -

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی

میں کثرت شوق و انتظار موت سے مرا جاتا ہوں - مجھے موت آتی ہے مگر موت نہیں آتی -

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب   شرم تمکو مگر نہیں آتی

کیوں غالب کعبہ کا جو ارادہ کر رہے ہو وہاں جاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی کہ ساری عمر بت پرستی میں صرف کرتے رہے ہو اب تم ہرگز اس قابل باقی نہیں رہے ہو کہ تم کعبہ جاؤ ذرا شرم کرو -

کوئی امید ... تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

میری کوئی امید پوری کیا ہو گیا ہے آخر تیرے اس مرض کی تیری اس وحشت کی کیا دوا

یا یہ کہ اتنی امید بھی پوری نہیں ہوتی یہ کہتا ہے کہ حضرت دل آپ جو مجھے کہتے ہیں کہ میرا علاج کرو

صورت نظر نہیں آتی جس سے امید پوری ہو ہوا کیا ہے کہ جس کی کچھ دوا کیجائے - یا فرض کیجیے

ہیں تو اس مرض کی دوا ہے کہاں کہ میں علاج کروں

موت کا ایک دن معین ہے   ہے کہ کم بخت تو اپنا مرض تو بتا - تجھے یہ کیا ہو گیا

موت تو یوں نہیں آتی اوسکا ایک وقت مقرر ہے اپنے مرض کی روداد بتا کہ اوسکا علاج کروں

آنے میں کیا عذر ہے وہ رات بھر کیوں نہیں آتی یا یہ کہ

اسکے ذکر میں کیوں الجھ گئی ہے -

الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی   اب - مگر یہاں عجب حالت ہے کہ ہم اسکے

مشتاق ہیں اور وہ ہم سے بیزار ہے ۔ میں ہوں اور عجب میں طاقت [illegible] نہیں

ہم اسکو چاہتے ہیں وہ ہم سے خفا ہو یہاں آ جائے جا ہے میں [illegible] کچھ اسکو

میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں

دو دل ظرف اسی قافیہ کو لکھتے ہیں
کیا آئے وہ گر ذبیح پر چھری پھیر کر آئے

آتا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

عاشق بربنائے رعب حسن بزم معشوق میں بھی
ہے ہمیں شبہ کے مٹانے کے لیے اتنا ہی ۔ کہ جو تم نے
کبھی ہے کاش کسی روز تم میرا مدعائے دل مجھ سے پوچھو ہے جسے تم آنے سے مشابہ کر سکتا ہوں شعلہ و سیماب
یا یہ کہ غیر کا حال تم پوچھتے ہو کاش تم کسی دن نہیں ویسے ہی آ سے بھی نہیں ۔ لہذا سکتا آتا کی
دل میں (آتا ہی) مصدر کے بجائے حال یعنی آتا کر

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود

ہے کہ میرا عالم وہی شعلہ و سیماب کا سا ہے
ایک مدا جب تیرے سوائے اور کوئی ہے آتا ہے کہ وہ نہیں آتا ۔ اب جا ہے آ ہی جائے
اسقدر دلفریب کیوں ہے ۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

ہاں منھ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

یہ حسینان جہان کیسے ہیں اور یہ اتنے [illegible] پرستش سے بچتے ہوں تو بجز یہ ہوا گنبگے مگر جونکے
منھ کی بدبو سے بھاگ جائیں گے اور پاس نہ آسکینگے

شکن زلف عنبریں کیوں ہے

جو آ سے مولانا نظم نے لکھا ہے کہ مضمون ہے جو آنے کا مضمون
زلف پیچدار کی شکن اسقدر عنبریں یہ صحیح ہے اسمیں بڑا نقصان تو یہ ہے کہ فرشتوں کی عاجزی
وہ نہایت رکیک ہے کم از کم ایسے مرشا میں سے احتیاط لازم

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

بعض لوگ تو خدا جانے کیا کیا لکھ جاتے ہیں مثلاً

یہ لہلہاتا سبزہ ۔ پھولوں کے رنگ ۔ بھی ہیں کس پر کھر
یہ کیا چیز ہیں ۔ حاصل یہ ہے کہ جو حیرت ہے مجھ کو
ہونا چاہیے کہ جو دلفریبیاں تماشا ہے یہ [illegible]
تو آخر یہ کیا بلا ہیں ۔ نہیں تو کہتا ہی وہ شوخ

باندھی ہے جو سیر کر کے لوں ترا شعلہ ارشد
چاہیے میرے سے لئے آئینہ خانہ شب وصل
شعور کرتا ہے جو پازیب کا دامن شب وصل
مرد ہے وہ کہ جو ہمکو میسر ہو کے

انسان صانع حقیقی کی طرف ۔ نہیں ہیں کہ اجکل شاعری میں انکی گنجایش نہیں ہے اور پہلے تھی ۔ چنانچہ

کامل ظاہروں کے دلدادہ ہیں اسلئے شاہد ہیں - اب بالکل قابل ترک ہیں -

جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہر شخص میں تجھی کو دیکھتے ہیں لہذا نہ جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے ہیں گویا تو نے اپنا بھیس بدل لیا ہے - مگر اس تبدیل لباس سے ہم دھوکا نہیں کھاتے -

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت را مے شناسم

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اے اہل طلب جب باوجود تلاش وہ ہمکو نہ ملا تو ہم اسقدر حیران ہوئے کہ خود کھوئے گئے اور کسی صورت میں اچھے رہے - ورنہ لوگ یہ طعنہ دیتے کہ ڈھونڈھا اور نہ پایا - ہاں یہ تاکید و تنبیہ کے لئے ہے یعنی ایسا ہی چاہیئے -

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

ہمارا شعار یہ ہی کہ آرام سے نہ بیٹھیں اسکو ڈھونڈھنے گئے تھے وہ نہ ملا کعبہ کو چلے گئے - گویا کعبہ کا جانا کسی ثواب کے حصول کی نیت سے نہ تھا - بلکہ ایک وقت گذارنا مقصود تھا یا ہرزہ گردی گویا ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

میرے دوستوں نے اس سے میرے نالہ کی بے اثری کے بارہ میں تقریر کی - کہ وہ غریب رات دن روتا ہے اور اس پر اس کو یہ ثابت ہو گیا کہ وہ بے اثر ہیں - یعنی سمجھے کہ وہ اتنا روتا ہے اور پھر بھی تم پر کوئی اثر نہیں ہے تو یقیناً نالہ کی بے اثری کا اظہار اس پر ہوا - تو اس حساب سے دوست تو اچھے رہے کہ انہوں نے میرے اوپر اپنا احسان ثابت کر دیا - مگر مجھے ڈبو دیا - یعنی کبھی کبھی جو میں اسکو اپنے نالہ و فریاد کے اثر کی دھمکی دیتا تھا اب وہ بھی گئی -

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب — ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

اُس محفل کی کیا بات ہے ہم بھی وہاں گئے تھے اور غالب تیری تقدیر کو رو آئے یعنی آہ آہ کھینچ کر آئے کہ ہائے ایسی انجمن ناز میں اور تیرا اُسکا گذر نہیں - یا یہ کہ اوس سے قصہ بیان کرنے کی طرز مرحوم نے اسی قافیہ کو یوں کہا ہے ؎

خوش ہونا کہاں جبکہ نصیبوں میں ہو رونا — ہم شمع صفت محفل شادی میں بھی رو آئے

پھر کچھ اک دلکو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے

پھر دلکو کچھ اک بیقراری سی ہے ہمارا سینہ زخم کاری کو ڈھونڈھتا ہے۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمد فصل لالہ کاری ہے

فصل بہار کی آمد ہے ہمارے ناخن پھر جگر کو کھودنے لگے - یا یہ کہ جگر کے زخمی ہونے نے لالہ کاری بنائی ہے - جگر کھودنا - جگر کاوی کا ترجمہ ہے -

قبلہ مقصد نگاہ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے

پھر اُسی عماری کا پردہ ہمارا نیاز کشی کا قبلہ اور کعبہ بنا ہوا ہے -

چشم دلال جنس رسوائی — دل خریدار ذوق خواری ہے

دل ذوق خواری اور رسوائی کا خریدار بننا چاہتا ہے اور آنکھ اوسکی دلالی کر رہی ہے ظاہر ہے کہ آنکھ ہی پھنساتی ہے -

وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ بیقراری ہے

وہی طرح طرح کے نالہ کرنا - اور وہی سو طرح سے بیقرار ہونا - پھر شعار ہو گیا ہے -

دل ہوائے خرام ناز سے پھر — محشرستان بیقراری ہے

خرام ناز کی خواہش نے پھر دل میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔ چونکہ خرام ناز کا کام قیامت برپا کرنا ہے لہذا اُسکے خیال نے بھی قیامتیں اُٹھا رکھی ہیں۔

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے　　　روز بازارِ جاں سپاری ہے

جلوہ یار نے ظاہر ہوکر پھر بازار جاں سپاری عشاق کو آب و تاب اور رونق دی ہے اور جاں سپاری کا بازار گرم ہے۔

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں　　　پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر اُسی بیوفا پر ہم اپنی جان دیتے ہیں پھر ہماری زندگی کا وہی طرز ہے۔

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز　　　گرم بازارِ فوجداری ہے

عدالت ناز کے پھر اجلاس ہو رہے ہیں اور فوجداری کے مقدمات روزانہ دائر ہوتے ہیں یا پیش ہوتے ہیں۔ یا فوجداری کی وارداتیں روز ہوتی ہیں۔

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

آجکل زلف سرشتہ دار یعنی پیشکار ہے اور اُسکے ظلم و ستم سے جہان میں ایک اندھیر ہو رہا ہے سرشتہ اور اندھیر وغیرہ یہ سب زلف کے مناسبات سے ہیں۔

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال　　　ایک فریاد و آہ و زاری ہے

سوال دینا اصطلاح وکلا در عدالت میں درخواست کو کہتے ہیں جو مقدمہ کے دائر کرنے کے وقت دیتے ہیں۔ مقدمہ دائر کرنے والے یا درخواست دینے والے کو سائل اور جب درخواست دیتے ہیں یا حکام درخواستیں لیتے ہیں اُس وقت کو سوال و جوابی کا وقت کہتے ہیں یعنی پارۂ دل نے پھر آہ و زاری و فریاد کے خلاف درخواست دی ہے۔ ایک فریاد یعنی کثرت فریاد

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب　　　اشکباری کا حکم جاری ہے

اسی درخواست کے اوپر گواہ عشق پھر طلب ہوئے ہیں - اور پھر اشکباری کا حکم جاری ہوا ہے - یعنی آنسو پھر طلب ہوئے ہیں -

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا   آج پھر اسکی روبکاری ہے

دل اور مژگاں کی جو خصومت تھی آج پھر وہ مقدمہ پیش ہے -

بے خودی بے سبب نہیں غالب   کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

اگرچہ مقطع اس قطعہ سے علیحدہ معلوم ہوتا ہے مگر در اصل یہ بھی اُسی میں شامل ہے گویا پوچھا گیا ہے کہ اگر تمکو مژگاں نے ستایا ہے - تو تم یہ بتاؤ کہ بیخود کیوں ہو معلوم ہوتا ہے کہ قصور تمہارا ہے اور تم اسکو چھپاتے ہو - یعنی تمکو عشق ہے - اور اسی وجہ سے تمکو بیخودی ہے اور اس حالت میں مژگاں کا کوئی قصور نہیں ہے - اگرچہ اس قطعہ میں جو الفاظ ہیں وہ اردو کے ہیں مگر چونکہ وہ الفاظ زبان فارسی سے لیکر اپنے یہاں کے خاص خاص معنوں میں مستعمل کر لئے گئے ہیں اسوجہ سے اونکی ترکیب فارسی الفاظ کے ساتھ نامناسب نہیں کہی جا سکتی - پھر کے لفظ سے یہ ثابت کیا ہے کہ ایسا اکثر مرتبہ ہو چکا ہے -

جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی   نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

اے جنون چونکہ ہم نے کچھ خوشی کی ہے تو تجھ پر اس سے تسکین کی تہمت جو تیرے لیئے باعث ننگ ہے نہیں رکھی جا سکتی - بلکہ اگر ہم نے لذت زندگی کچھ اٹھائی ہے تو وہ اسلیئے اٹھائی ہے کہ کچھ دیر بعد جو وہ ہم سے چھن جائیگی یا ہم اُسکو چھوڑ دینگے تو وہ اور بھی ہمارے زخم دل کے لیئے باعث نمک پاشی ہو جائیگی - اور یہ ظاہر ہے کہ جو عیش فانی ہو - وہ اور بھی باعث تکلیف ہے -

دوسرے یہ کہ اے جنوں تسکیں کی تہمت میری شادمانی کرنے سے تجھپر نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ لذت زندگانی کو دیکھکر میں اُن لذتوں سے خوش نہیں ہوتا جو اُن میں موجود ہیں بلکہ اس کا افسوس کرتا ہوں کہ یہ مجھکو میسر نہیں ہیں - اور اس سے میرے دل پر نمک چھڑکا جاتا ہے - اور یہ نمک پاشی میرے ایذا دوست دل کے لیے باعث شادمانی - اور دوسر

شادمانی سے تو مبہم ہے شادمانی حقیقی نہیں ہو سکتا۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

کشاکش علائق ہستی سے سعی آزادی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ یعنی کوئی اس سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ جیسے کہ پانی جسکی روانی آزادی سے تعبیر کیجا سکتی۔ مگر اسپر بھی زنجیر ہائے تموج میں گرفتار رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہاں کی آزادی بھی گرفتاری ہے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارتگاہ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

تیرا دیوانہ مرنے کے بعد بھی لڑکوں کی زیارت گاہ بنا رہا۔ اور میری قبر پر پتھر مارتے رہے جن کے شراروں سے گویا میری قبر پر پھول چڑھائے۔

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

جو اپنے معشوق کی فریاد کرنے کا ارادہ کرے اگر اسکو ملامت کیجائے تو بجا ہے اور یہی اوسکی سزا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح محشر خندہ دنداں نما ہو کیونکہ وہ فریاد اور عدالت کا دن ہے اسی مضمون کو مصنف نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے جیسا کہ ایک جگہ ہم لکھ چکے ہیں۔

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

یہ ایک مشہور قصہ ہے کہ فصد کھلی تو ادھر فصد لیلےٰ کے یہاں مجنوں کے خون نکلا۔ اوسکی تلمیح کرکے مصنف نے یہ شعر لکھا ہے کہتا ہے کہ اتحاد حسن وعشق کی یہ تاثیر ہے کہ اگر دشت نجد میں دہقان بجائے دانہ کے نوک نشتر بوئے تو یقین ہے کہ لیلیٰ کی رگ میں اوسکا اثر محسوس ہو۔ کیونکہ وہ نوک نشتر مجنوں کے پاؤں کو زخمی کریگی۔ ادھر اسکے خون نکلے گا اُدھر اُسکا جسم مجروح ہوگا۔ یا یہ کہ رابطہ حسن وعشق اسی کا نام ہے کہ عاشق کی اذیت تکلیف معشوق کو اور معشوق کی عاشق کو محسوس ہوتی ہے۔ خاک دشت مجنوں کو مجنوں سے صرف اسقدر تعلق ہے کہ وہ اسپر سے گذرتا ہے۔ مگر اُس خاک میں اگر دہقان نوک نشتر چھبو دے تو لیلےٰ پر اُسکا اثر پہونچے گا۔ مولانا نظم لکھتے ہیں کہ ممکن ہے مصنف نے دست ہا تھہ کے معنے میں لکھا ہو۔ مگر واضح ہو

کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اُس سے نہ لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ نہ لفظ بامعنی رہتا ہے۔

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا ہوئی محفل کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

پروانہ کا پر شاید کشتی مے کے لئے بادبان تھا۔ جو گرمی محفل کی دلیل تھا۔ اور محفل کی گرمی روانی دور ساغر کا باعث تھی تو اس صورت میں پر پروانہ بادبان کشتی سے ٹھہرا اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں محفل گرم ہوتی ہے وہاں پروانہ ضرور پہونچتا ہے اور اس صورت میں پروانہ گرمی محفل کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ اس از دم موجودگی سے وہ باعث گرمی محفل کے درجہ پر پہونچ گیا ہے۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی طاقت اُڑ گئی ہے جس نے مجھے بے بس کر دیا اب اُڑ نہیں سکتا ہوں۔ اسی وجہ سے شوق پرفشانی کے وہ بیداد جو مجھ پر ہو رہے ہیں کہ میں عرض نہیں کر سکتا۔

کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اُس کے خیمہ کے پیچھے کہاں تک روتے جاؤں۔ اے خدا میری قسمت میں کیا کوئی پتھر کی دیوار نہ تھی کہ اس سے اپنا سر پھوڑ کر مر رہتا اور اس رونے کی زحمت سے نجات پاتا۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

اپنی بے اعتدالیوں کے سبب سب کی نظروں میں ہم سبک ہو گئے ہیں یوں سمجھئے کہ جتنے ادھر بڑھتے گئے اسی قدر ہمارا وقار کم ہوتا گیا۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہمارے آشیانے کے بہت قریب ہی صیاد نے جال بچھا دیا۔ یہاں تک کہ ہم اُڑنے کا ارادہ کرتے تھے کہ جال میں پھنس گئے اور اُڑنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ایسا ہی کسی اور شاعر کا شعر ہے۔

صیاد نے کس وقت لگایا ہے نشانہ جب اُڑنے کو ہم شاخ پہ پر تول رہے تھے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

ہماری ہستی ضرور ہے مگر وہ محض برائے نام ہے۔ اور اتنی ہے کہ ہم اپنی ہستی کی قسم کھا سکتے ہیں یعنی بس قسم کھانے کے لئے باقی ہیں ورنہ بالکل فنا ہو چکے۔

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

جو لوگ مدتوں عشق کی سختیاں کھینچتے رہے وہ سراپا الم بن گئے اور اب انکا وجود بالکل غیر مرئی اور نا محسوس ہے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

خون کی حکایات خونچکاں لکھتے ہیں اگرچہ ہمارے ہاتھ تک قلم ہوئے مگر ہم لکھتے ضرور رہے یعنی ان حکایتوں کا لکھنا ہمکو اسقدر پیارا تھا کہ ہاتھ قلم ہونے منظور کر لئے مگر یہ منظور نہ کیا کہ ہم یہ حکایات نہ لکھیں۔ اور یہ بھی ایک جنون ہے۔

اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اللہ ری بد مزاجی اور تندیٔ خو جسکی دہشت اور خوف سے میرے نالہ کے اجزا دل کے دل ہی میں تحلیل ہو گئے اور ایک دوسرے کے رزق بن گئے۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

اہل ہوس کی فتح یہی ہے کہ وہ میدان عشق سے بھاگ جائیں اور انکے جو پاؤں اٹھ گئے گویا وہی ان کے علم فتح بلند ہوئے ہیں۔ پاؤں اٹھنا محاورہ ہے جو بھاگ جانے کے معنے میں ہے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

عدم میں چند نالے کھینچنے کیلئے ہماری سپرد ہوئے تھے جو ہم وہاں ختم نہ کر سکے اور نہ کھینچ سکے اور وہاں کے رہنے کی مدت ختم ہو گئی وہ یہاں بصورت انفاس تبدیل ہو گئے۔ حاصل یہ ہے کہ ہماری

زندگی محض نالہ کشی کے لئے ہے اور جسکو لوگ سانس سمجھے ہوئے ہیں سانس نہیں ہیں بلکہ نالہ ہے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی ۔۔۔ سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

عاشقی اور دل لگی کی عادت ان برے حالوں یعنی فقیری میں بھی نہ چھوڑی، ہم فقیر ہوئے تو اہل کرم کے عاشق ہوگئے اور انکی تلاش میں مارے مارے پھرے۔

بدلکر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ ۔۔۔ تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۔۔۔ تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

اگر میرے داغِ دل کی شعلہ سوزِ عشق حفاظت نہ کرے تو افسردگی اس زرِ داغ کو اڑا لیجائے کہ وہ اسکی گھات میں چھپی ہوئی ہے۔ یعنی ہم وہ بدنصیب ہیں کہ کسی صورت سے ہمارے آرام کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اگر داغِ دل کی چمک دمک باقی نہ رہے تو افسردگی پیدا ہوجائے اور یہ ظاہر ہے کہ جیسی وہ بری ہے ویسی ہی یہ بھی ہے یعنی افسردگی و جلا رہ داغِ عشق دونوں یکساں ہیں۔ مولانا طباطبائی لکھتے ہیں کہ تشبیہیں لطیف ہیں حاصل شعر کا کچھ بھی نہیں ہے حالانکہ مصنف نے مضمون آفرینی کی ہے اور نہایت عمدہ حاصل اسکا نکالا ہے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی ۔۔۔ کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

میرا نصیب ہی خراب ہے کیونکر یہ امید رکھوں کہ جوان ہوکر وہ میرے دل کی تمنائیں پوری کریگا جس نے کبھی بچپن میں میری کہانی بھی نہیں سنی حالانکہ بچپن کے زمانہ میں کہانی سننے کا بہت بچوں کو شوق ہوتا ہے۔

یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا ۔۔۔ کہ مرے عدو کو یا رب ملے میری زندگانی

بلا وجہ کسی کو دکھ دینا کچھ اچھا نہیں ہے ورنہ یہ دعا مانگا کرتا کہ خدا میری زندگی میرے دشمن کو دیدے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر اسکو میری زندگی ملتی تو وہ بھی بلاؤں میں پھنس جاتا۔ ایک جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔ یہاں زندگی نہ دینے کی وجہ بلا وجہ کسی کو ستانا رکھا مگر وہاں دوسرا سبب ہے۔

ع دریغ از حسرت دیدار رندے جاں آں دارد — کہ بے رویت بدشمن دادہ باشم زندگانی را

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

میرے ظلمت کدے میں شبِ غم کا جوش ہے۔ یعنی ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے اور صبح کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے بلکہ کوئی ایسی شے بھی نہیں ہے جس سے صبح پیدا ہونے کے کچھ آثار ظاہر ہوں۔ مگر ہے تو شمع جو بجھی ہوئی ہے وہ دلیلِ سحر ہے کیونکہ شمع صبح کے وقت بجھ جایا کرتی ہے سو وہ خاموش ہے۔ پھر خیال کیجیے کہ جہاں دلیلِ سحر بھی موید و معینِ تاریکی ہو اُس گھر کی تاریکی کی کیا حد ہے۔ اسی مضمون کے دو شعر لکھے جاتے ہیں۔ ذوق مرحوم کہتے ہیں۔

ع درد دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانے میں — شمع ہے اک سوزنِ گم گشتہ کاشانے میں
مژدۂ صبح دریں تیرہ شباں ما دادند — شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

نہ مدت سے کوئی وصال کی خوشخبری سنی اور نہ اس کا جمال آنکھوں سے دیکھا۔ گویا کان اور آنکھ کی صلح ہو گئی ہے نہ اسکو اس پر رشک کا موقع ہے نہ اس کو اس پر۔ ورنہ ایک زمانہ میں کبھی جمال دیکھتے تھے کبھی مژدۂ وصال سنتے تھے۔ اور آنکھ کان سے کان آنکھ سے دشمنی رکھتا تھا۔ بلکہ اسی مضمون کا شعر ناسخ کا ہے مگر حق یہ ہے کہ غالب مرحوم نے اس صفائی سے اسکو نظم کیا ہے کہ ناسخ کے یہاں اس کا نام بھی نہیں ہے۔

ناسخ ع شکل نظر نہیں پڑی آیا نہیں پیام بھی — برسوں ہوئے کہ ایک سی حالت چشم و گوش ہے

مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب — اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

حسنِ خود آرا کو مے نے بے حجاب کر دیا ہے اے شوق اس وقت اجازت ہے کہ اپنے ہوش و حواس اسکے حوالہ کر دے یعنی تو بھی بیخود ہو جا۔

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

وہاں موتی معشوقوں کے ہار تک پہونچتا ہے ذرا ستارۂ جوہری کا اوج اور بلندی دیکھیے کہ کس جگہ

یوں کہا ہے سو تیر سے جو ہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں ÷ ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں ÷
ذرا سے فرق سے دونوں مضامین میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست — بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

ہماری بزم خیال ایک ایسا میخانہ ہے جس میں شور و شر کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ یہاں دیدار شراب ہے حوصلہ ساقی ہے کہ ہر ایک کے اندازہ کے موافق اسکو شراب پلاتا ہے۔ نگاہ ایک مست بیہوش ہے کہ پیتی چلی جاتی ہے۔ مصرع اولیٰ میں اضافت نہیں ہے۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

اے وہ لوگو کہ فرش خواہش دل پر ابھی ابھی آکر بیٹھے ہو۔ اور اس بزم میں نو وارد ہو۔ ذرا خبردار ہو اگر تمہیں نغمہ و سرود اور شراب نوشی کی تمنا ہے۔ یہ نو جوانوں سے خطاب ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

تم اپنے ارادوں کو پورا کرنا مگر جو تمہاری آنکھ عبرت بین ہے اور اگر تمہارے کان میں نصیحت سننے کا مادہ اور قابلیت ہے تو مجھے دیکھو۔ اور میری نصیحت سنو۔

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

ساقی کو نہ دیکھو اسکا جلوہ ایمان و عقل کا دشمن ہے مطرب کے نغمہ نہ سنو یہ تمکین و ہوش کے رہزن ہیں میر کہتے ہیں سو خلوت دل میں کر دیا اپنے حواس میں خلل پیدا کر دیتا ہے نغمہ خیال گوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

تم نے شب کو بھی بزم کی حالت دیکھی ہوگی کہ ہر گوشہ بساط پر پھولوں کا انبار تھا جس سے فرش انجمن باغبان کا دامن اور گلفروش کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

... دشوار ہے

خرام ناز ساقی کے دیکھنے اور چنگ کی مستانہ آواز سے نگاہ اور کانوں کو جنت کا مزا آرہا تھا

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

رات یہ کیفیت تھی مگر صبح کے وقت جو آکر دیکھا نہ وہ خوشی کا عالم ہے نہ وہ چہل پہل ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اب بجائے اوس خوشی کے سامان کے ایک شمع خاموش محفل میں نظر آتی ہے جسکو صحبت شب کی جدائی کے داغ نے جلا دیا ہے اور وہ چپ بیٹھی ہوئی ہے۔

مصنف نے اس قطعہ میں سحر نگاری کی ہے۔ جواب نہیں ہو سکتا۔ بزم کے سرور کی بھی کیفیت دو شعروں میں دکھا دی ہے اور رنج و غم کا بھی فوٹو کھینچ دیا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یہ مضامین جو میں لکھتا ہوں یہ سب غیب سے میرے خیال میں آتے ہیں اور گویا خامہ کی صریر فرشتہ غیب کی آواز ہے۔ یہ خیال تاب کا موقعہ، سروش سے تشبیہ دینا لطف سے خالی نہیں ہے سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں۔

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

اب تو جلد آ اور میری خبر لے کہ میری جان آسی بیقرار ہو گئی ہے کہ مجھ میں تاب انتظار باقی نہیں رہی ہے۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے — نشہ باندازہ خمار نہیں ہے

ظاہر ہے کہ جنت حیات دہر کے بعد ملیگی۔ مگر مصنف کہتا ہے کہ اگرچہ اقتضائے زمانہ زندگی کے بعد لوگوں کو جنت دیجاتی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس خمار کے مقابلہ میں وہ شراب بہت کم ہے یعنی یہاں جسقدر تکالیف کا سامنا ہوا ہے اوس کی اس عیش ابد سے تسلی نہیں ہو سکتی

مہری کالج ادنا۔۔۔

گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھکو   ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

نالہ و فریاد مجھے تیری بزم سے نکالتی ہے۔ ہائے افسوس کہ رونے پر مجھکو اختیار نہیں رہا۔
یعنی ضبط کی طاقت مجھ میں باقی نہیں ہے۔

ہم سے عبث ہے گمان رنجش خاطر   خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

ہمارے مرجانے پر تو خیال کرتا ہے کہ یہ رنجیدہ ہو گیا یہ گمان غلط ہے۔ ہماری خاک میں
رنج وغیرہ کا بالکل نام و نشاں بھی نہیں ہے۔ لہذا یہ خیال فضول ہے۔ خاک اور غبار کا تناسب خوب ہے

دل سے اٹھا لطف جلوہ ہائے معانی   غیر گل آئینہ بہار نہیں ہے

اگر معانی کا لطف حاصل کرنا چاہتا ہے تو دل سے حاصل کر۔ کیونکہ بہار کا مزا بغیر آئینہ
گل کے نہیں آسکتا یعنی گل ایک آئینہ ہے جس میں گل کی تصویر نظر آتی ہے اسی صورت سے دل آئینہ
ہے جس میں شاہدان معانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے   وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

خیر خدا کا شکر ہے کہ اس نے میرے قتل کرنے کا عہد تو کر لیا ہے اگر جو اور پیمانوں کی طرح یہ پیمان
بھی بودا ہے تو افسوس ہے۔ نہایت خوب شعر ہے۔

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب   تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

تو نے غالب مے نوشی سے قسم تو ضرور کھائی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے
آج توبہ کی ہے کل توڑ دے گا۔

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھکو حاصل ہے   کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

غم کے بوجھ کی کثرت سے میری گردن اسقدر جھکی ہوئی ہے کہ میرے دامن اور نظر کے
تار کا فرق معلوم کرنا بہت دشوار ہے۔ یعنی دونوں مل رہے ہیں۔

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی　　سمجھنا مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

زخم کا رفو کرنے سے یہ مطلب ہے کہ سوئی سے جو تازہ زخم ہوں اونکی بھی لذت اٹھاؤں۔ کہیں اس رفو کا یہ مطلب نہ سمجھنا کہ دیوانہ کو اب درد کا خیال نہیں رہا۔ اسی مضمون کا شعر گذر چکا ہے۔

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب　　چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

وہ گل جس باغ میں جائے وہاں غنچے کے چٹکنے کو خندۂ دل کی صدا سمجھنا چاہیے جس سے باغ کی خوشی کا پتہ چلتا ہے۔ گل خاص گلاب کے پھول کو کہتے ہیں۔ اور اسکی کلی دل سے مشابہ۔ اس کے چٹکنے کو شعرا خندہ اور گریہ دونوں سے استعارہ کرتے ہیں۔

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد　　خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

میں صحرا نورد تھا اور اب پاؤں میں کانٹے چبھنے سے تھک کر بیٹھ گیا ہوں تو خار پا میرے واسطے آئینۂ زانو بن گئے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ زانو کو شعرا آئینہ سے استعارہ کرتے ہیں۔ لطیف بات اس میں یہ ہے کہ میرے پاؤں میں ایسے کانٹے چبھے ہیں جنکا اثر زانو تک محسوس ہو رہا ہے یہاں زانو کو آئینہ سے استعارہ خاص اس وجہ سے کیا گیا ہے جس سے سرنگونی کا پتہ چلے۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت　　ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

میرے دل کی حالت کا ہم آغوشی کے وقت اندازہ کرنا۔ کیونکہ تیرا بال بال میرے دل سے آشنا ہے کیونکہ دل مدتوں تیری زلف میں اسیر رہ چکا ہے اس وجہ سے ہر ایک سر مو ہم آغوشی کے وقت نگاہ آشنا کا کام دے گا۔

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ　　ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

میں ایک ایسا باجہ ہوں جسمیں شکایتوں کا راگ بھرا ہوا ہے مناسب یہی ہے کہ لوگوں میں تو مجھکو نہ چھیڑے۔ ورنہ معلوم نہیں کہ میری زبان سے کیا کیا نکل جائے گا اسی مضمون کا دوسرا

شعر مرزا نے لکھا ہے ~

پُر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا — اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ہیں سرود و نغمہ جانسوز مجذوبان عشق — چھیڑ دے اور چھیڑ کر اک دل لگی دیکھا کرے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

تو جس محفل میں ناز سے باتیں کرے۔ تو چونکہ تیری باتیں معجز نما ہیں اور انمیں جان بخشی کا اثر ہے اس لئے وہ کالبد جو صورت دیوار یعنی بالکل مردہ ہیں اونمیں جان آجائے تو تعجب نہیں ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

اگر تیرا قد دلکش باغ میں آئے تو سرو و صنوبر بہ نہایت عشق سے تیرے سایہ کی طرح ساتھ ساتھ پھریں

تب ناز گرانمایگی اشک بجا ہے — جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے

اشک اوس حالت میں اپنی گراں مائگی پر بہتنا جا ہیں ناز کریں جب دیدۂ خونبار میں لخت جگر آئے۔

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اے ظالم تو مجھے شکایت کی اجازت دے کہ ذرا تجھے میرے ستانے میں لطف آئے۔ بیوجہ ستانے میں کوئی لطف نہیں ہے یعنی تو مجھپر ظلم کرے اور میں تیری شکایت کروں تو اور بھی تو مجھپر ستم کرے اس شعر میں حد عاشقی کا انتہا سے زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ یعنی عاشق چاہتا ہے کہ معشوق کا جی خوش ہو اپنی تکلیف کا کوئی خیال نہیں ہے دیکھئے ایک جگہ رونیکی اجازت اس لئے حاصل کی ہے۔

رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — تیرے چہرے سے عیاں ہو غم پنہاں میرا

اس چشم فسونگر کا اگر پائے اشارا — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

اگر وہ چشم فسونگر اشارا کردے تو آئینہ طوطی خوش گفتار کی طرح باتیں کرنے لگے۔ کیونکہ اوسکی آنکھ کا اشارہ سحر کا مرتبہ رکھتا ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ایک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے

ایسے کانٹوں نے پیاس کے مارے زبانیں نکالدی ہیں اور انکی زبانیں خشک ہورہی ہیں ایسے میں کسی آبلہ پا کو بھیجدے کہ ان کی پیاس بجھے۔ در پردہ قید سے اپنی رہائی کی دعا ہے۔

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک آغوش خم حلقہ زنار میں آوے

میں رشک سے کیونکر نہ مروں جب اسکے جسم نازک کو حلقہ زنار اپنی آغوش میں لے حسب عادت شعرا متصنفہ زنار نے معشوق کو ہندو قرار دیا ہے۔

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

اگر حرص زر غارت گر ناموس نہ ہو تو پھول اپنے وطن یعنی باغ سے نکل کر بازار میں کیوں آئے اور اپنی عزت کو برباد کرے یعنی پھول کو باغ سے بازار میں زر حاصل کرنے کے لئے لاتے ہیں اور اس وجہ سے گل غارت گر ناموس ہے۔ مولانا نظم اسکا یہ مطلب نکالتے ہیں کہ گلاب کا کھلنا اور زر گل کا کھلنا گویا زر کی ہوس میں ہاتھ پھیلانا ہے جس کا انجام یہ ہوا کہ سر بازار آنا پڑا نہیں تو بربادی ناموس کا کیوں سامنا ہوتا۔ غنچہ کی طرح بند مٹھی چلا گیا ہوتا جب ہاتھ پھیلا کر زر لیا تو شاہد بازاری ہوگیا اور ناموس عزت برباد گئی۔

تب چاک گریباں کا مزا ہے دل نالاں جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

اے دل چاک گریباں کا لطف جب ہے کہ جب تار نفس بھی اسی تار گریباں میں الجھا ہوا آئے یعنی تار نفس کا بھی تار گریبان کے ساتھ خاتمہ ہو۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

میرے سینہ کو راز نہاں عشق نے آتش کدہ بنا رکھا ہے اور میں اس سے پھنکا جاتا ہوں افسوس ہے کہ اگر وہ راز کھل جائے تو دنیا کو پھونک دے گا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اے غالب جو لفظ میرے شعر میں آئیں وہ خزانۂ معنی کے طلسم ہیں۔ یعنی میرے شعر کا ہر ایک لفظ کثیر المعنی ہے جس سے عجیب عجیب معانی پیدا ہوتے ہیں۔

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے — اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

ہم اسکو مانتے ہیں کہ چودھویں کے چاند کا حسن اچھا ہو مگر میرا معشوق خورشید جمال اس سے بہت اچھا ہے اسلیے کہ از مہر تو بود ماہ را۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

بوسہ جو دل کی قیمت ہے اسکے دینے میں تو لیت و لعل کرتے ہیں اور دل کو تاکتے ہیں جی میں کہہ رہا ہوگا کہ اگر مفت ملجائے تو مال اچھا ہے۔

اور بازار سے لے آئینگے گر ٹوٹ گیا — ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے ۱

یعنی ایسی چیز کی کیوں جستجو کیجائے جسکی جستجو کی تکلیف اوسکی عیش سے زیادہ ہو ساغر جم کو کیوں ڈھونڈھیں

ف ہم اپنی خستہ دلی پہ بے بھکاری ڈال کے جیتے" ہمارا مٹی کا پیالہ اوس سے اچھا ہے اگر ٹوٹ جائیگا تو پھر بھی دوبارہ بازار سے مل سکتا ہے اور وہ خراب ہونے ٹوٹنے پھوٹنے کے بعد میں میسر نہیں ہو سکتا۔
بعض نسخوں میں پہلا مصرع یوں ہے ف اور بازار سے آ جائیگا گر ٹوٹ گیا۔ مضمون دونوں کا ایک ہی ہے
اسی مضمون کو منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کا شعر ہے جسمیں زبان کی شوخی کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا ہے انصاف یہ ہے کہ منشی صاحب کا شعر اس سے کم نہیں ہے۔

ف ساغر جم ہی پہ موقوف نہیں بادہ کشی — ٹوٹا پھوٹا کوئی مٹی کا پیالہ ہوتا۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جسکو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان دونوں مصرعوں میں تقابل سائل و مسئول ختم کیا گیا ہے۔ یعنی جو لوگ بغیر مانگے ...

دیدیتے ہیں اوسمیں اُن کو اُس سے زیادہ مزا آتا ہے کہ مانگنے سے سائل کو کچھ دیں۔ ایسے ہی فقیر جسے مانگنے کی عادت نہو مانگنے والے سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔ مطلب یہ کہ سائل کو سوال اور تونگر کو انتظار سوال نہ کرنا چاہیئے۔

نظم صاحب اسکا مطلب یہ لکھتے ہیں کہ مانگنے سے ملا تو کیا رہ گئی جو قسمت میں ہے وہ ملے گا ضرور اگر بے سوال ملا تو کیا پوچھنا اوس ملنے سے کیسا دل خوش ہوجاتا ہے۔ سوال کی مذمت کیا اچھی طرح سے کی گئی

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اسمیں اپنی بدقسمتی کا اظہار مقصود ہے کہ جب وہ رحم کھاکر میرا حال زار دیکھنے کے لئے آتے ہیں تو میرا چہرہ بحال ہوجاتا ہے۔ اور اس حالت میں وہ میرے درد و غم کو محض بناوٹ سمجھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یہ مضمون نہایت لطیف ہے اور خوب لکھا ہے۔ فارسی کا ایک شعر اسی مضمون کا ہے۔

شعر ۔۔۔ با وجو میرسیم آسودہ میشوم ازدور ۔۔۔ ندیدہ حال مرا وقت بیقراری حیف

شعر ۔۔۔ مرے دل کے دھڑکنے کا انھیں کیونکر یقین آئے ۔۔۔ ٹھہر جاتا ہے دل جب ہاتھ وہ سینہ پر دھرتے ہیں

غالب کا یہ قافیہ نہایت مقبول ہے۔ اور اس شعر کو عوام نے بیت الغزل مان لیا ہے۔ مرزا داغ نے اس قافیہ کو خوب لکھا ہے۔ سلاست زبان نے چار چاند لگا دئے ہیں۔

شعر ۔۔۔ آپ پچھتائیں نہیں ظلم سے توبہ نکریں ۔۔۔ آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض ۔۔۔ اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

گویا عاشق اپنے زعم میں نفع نقصان دنیا کو محض معشوقوں کی جفا و وفا تک محدود سمجھتا ہے اسی بنا پر کہتا ہے کہ دیکھئے ایک نجومی نے اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ یہ سال اچھا ہے اب دیکھئے بتوں یعنی معشوقوں سے عاشقوں کیا فائدہ پہونچتا ہے۔ یہ ہوا تو کچھ بھی نہیں۔

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا ۔۔۔ جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

مصنف دعوے کرتا ہے کہ کمال جیسا بھی ہو وہ اچھا ہے اور اسکے ثبوت میں فرہاد کا مشہور فن اور قصہ پیش کرتا ہے کہ دیکھو فرہاد کا شیریں سے ہمکلام ہونا سخت دشوار تھا۔ مگر تیشہ نے

اوسکو بُت سے ہمکلام کرایا - یعنی اوسکو کوہکنی میں کمال تھا - اور کوہکنی کے لئے تیشہ ضرور چاہیئے -
لہذا کمال کسی شئے کا کیوں نہ ہو وہ اچھا ہے -

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی　　　کس بے کمال ہیچ نیرزد عزیز من

مولانا نظم نے اس شعر میں تین نقص نکالے ہیں - پہلے مصرع کو گنجلک - دوسرے یہ ہے تنافر تیسرے
مضمون کچھ اچھا نہیں - اور یہی اسلی شرح کی ہے - تنافر بعض حروف کے یکجا جمع ہونے سے ہوتا ہے مگر
مسلم تنافر کا یہ کلیہ ہے کہ جو طبیعت پر گراں گذرے وہی تنافر ہے ورنہ کچھ نہیں - جیسے کہ تین چار
اضافتیں متواتر جمع ہونا برا ہے مگر بعض جگہ کثرت اضافت لطف دیجاتی ہے - معانی شعر میں نے
بیان کیے جو اخلاقی ہیں - نہ پہلے مصرع میں کوئی زیادہ گنجلک معلوم ہوتی ہے کہ سمجھنے والا سمجھ سکے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے　　　کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

اسمیں بھی مصنف نے ایک اخلاقی سبق دیا ہے - یعنی جو کام کہ اس کا مآل اچھا ہو وہ اچھا ہے
جیسے کہ قطرہ خود تو دریا میں ملکر مٹتا ہے مگر اوسکا انجام اچھا ہوتا ہے کہ دریا بنجاتا ہے -

ع　عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز　　　شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

خضر سلطان نام ہے فرزند بہادر شاہ ظفر مرحوم کا اوسکی مدح میں یہ شعر ہے - تازہ نہال سے
نوجوانی مقصود ہے اس شعر میں خضر - سرسبز باغ تازہ نہال وغیرہ الفاظ مناسب ہیں جو تجنیس و
خوبیٔ نظم ہو گئے ہیں یا کئے گئے ہیں -

ہمکو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　　دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غالب جنت کی حقیقت ہمکو معلوم ہے - اور وہ صرف اتنی ہی ہے کہ اس سے دل خوش رہتا ہے -
یعنی جنت محض اک سبز باغ ہے جو اکثر زاہد دکھاتے ہیں - فارسی میں اس مضمون کو یوں فرماتے ہیں -

ع　فردوس جوئے عمر نو سواس [illegible]　　　سرمایہ نیز در سرایں سود میسر ود
ع　غالب خوش نشست ز صحبت ہموم و فکر عیش　　　تا رسے کہ نیست در سرایں بود میرود

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

بے مثل شعر کہا ہے۔ کہ اے ظالم اگر میرے مرجانے سے تیری تسلی نہ ہوئی اور تو ہنوز اور امتحان کی فکر میں ہے تو میں بھی خوش ہوں خوشی سے اور امتحان لے میں تیار ہوں۔ ایک شاعر مرنے کے بعد اپنی تباہی کا یوں اظہار کرتا ہے۔

فلک را کار با ما باقی است با مشت غبار من — کہ بازیگاہ طفلاں ہست خاک مزار من

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے — شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

اگر میرے شوق کو گلچینی گلستان تسلی حاصل نہیں ہے تو یہ کیا کم ہے کہ خار خار حسرت دیدار تو ہے بہر حال کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ حالی۔

یارب طرب وصل ہو یا ہو طلب وصل — جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے — ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

اے میکشو ساقی ہوتا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ وہ جام بھر بھر کر پلاتا۔ اب ساقی نہیں ہے تو خم مے منہ سے لگا کر آپ پی لو۔ ایک دن ساقی نہ ہوا نہ سہی مطلب پینے اور جی بھر کر پینے سے ہے

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا — گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

آہ شعلہ بار قیس چشم و چراغ صحرا روشن ہو رہے ہیں۔ اگر یہ شمع سیہ خانۂ لیلیٰ میں نہیں تو نہ سہی۔ لیلیٰ چونکہ رات کو کہتے ہیں اور لیلیٰ سیہ فام بھی اس واسطے سیہ خانہ کہا گیا یعنی آہ کے لیلیٰ دل کے لیے یہ شمع نورانی کام نہیں دیتی تو نہ دے کچھ پرواہ نہیں ہے۔ جنگل تو اس سے آراستہ ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

یہ شعر بہت خوب کہا ہے۔ یعنی گھر میں ایک ہنگامہ ہونے سے گھر کی رونق ہوتی ہے اگر نغمۂ شادی نہ ہو تو نوحۂ غم میں بھی ایک شان نکلتی ہے۔ یہ کمال مجبوری عاشق کا خیال ہے۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

نہ کسی سے داد ملنے کی پروا ہے نہ صلہ و انعام کی خواہش ہے۔ لوگ میرے اشعار کو بے معنی قرار دیتے ہیں تو دیں اور کوئی مجھے داد دیتا ہو تو نہ دے۔

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو — نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

غالب اگرچہ بصد جہاں عشق و محبت نے ہم کو عمر طبیعی تک نہ پہنچنے دیا۔ اگر نہیں پہنچے نہ سہی یہ کیا کچھ کم ہے کہ جتنی عمر ہوئی وہ معشوقوں کی صحبت میں بسر ہوئی۔ طبیعی اور طبعی دونوں ایک معنے میں مستعمل ہیں۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے — کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

یہ عجیب خوشی ہے کہ ہم جلاد کے آگے جا رہے ہیں۔ کہ سایہ کی وجہ سے ہمارا پاؤں سے دو قدم آگے ہے اور یہیں سے ہماری خوشی قتل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت — فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

روز ازل کاتب تقدیر نے چاہا تھا کہ خراب بادہ الفت مجھے لکھ دے۔ لیکن صرف خراب لکھا تھا کہ آگے قلم نہ اٹھ سکا۔ لہذا اب میری خرابی کو خرابی الفت کوئی نہیں کہتا۔ صرف خراب و سرگشتہ سمجھتے ہیں۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی — وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذت الم آگے

زمانہ کے غموں نے سب ہمارا نشہ ہرن کر دیا۔ وگرنہ عشق میں جو ہمکو رنج ہوتے تھے ان سے حصول لذت کرتے تھے مگر غم زمانہ نے سب بھلا دیا۔

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا — کہ اسکے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

خدا کے لیے کوئی ہمارے اس شوق کی جس نے ہمکو مجنوں بنا دیا ہے داد دیتا۔ کہ دیکھ نامہ بر کو

خط دیتے ہیں ادھر جواب کے شوق میں اسکے دروازہ پر نامہ بر سے پہلے جا پہونچتے ہیں۔ مضمون شعر نہایت اچھا ہے لیکن وزن شعر ناموزوں ہے اس وجہ سے لوگوں کی توجہ اسطرف نہیں ہوتی۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرۂ ہائے خم بہ خم آگے

یہ ساری عمر جو تمہارے ہاتھوں سے ہم نے پریشانیاں اٹھائی ہیں خدا کرے اے گیسوئے خمدار تمہارے آگے آئیں آگے آنا۔ نتیجہ اٹھانا۔ بدلہ پانا۔

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

ہم دل و جگر میں یہ سمجھے تھے کہ موج خون خوش رہتی ہے بلکہ سانس سمجھتے تھے اب معلوم ہوا کہ یہ موج خون تھی جسے غم عشق نے اہو شاکر ہوا دیا۔ اور وہ دل و جگر کا خون ہے۔ سانس نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خون کی روانی وغیرہ سے انکی زندگی ہے۔ اور سانس بھی اسکا کرشمہ ہے۔ ہر چند کہ سانس کا مقام پھیپھڑا ہے مگر شاعروں کے یہاں سب کام قلب و جگر سے متعلق کیا جاتا ہے۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

اللہ اللہ زمانہ کا کیا انقلاب ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ وہ ہمیشہ میری جان کی قسم کھاتے تھے اور ایک آج یہ وقت ہے کہ وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم بھی اسکے جنازہ پر ضرور آئیں گے۔ یا آج انہیں جنازہ پر آنے سے انکار ہے۔

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

شکوہ کا اگر نام بھی لیتا ہوں تو وہ بے وفا خفا ہو جاتا ہے بلکہ اتنی بات کے کہنے سے بھی گلا کرتا ہے یا یہ کہ یہ بھی جو میں کہتا ہوں تو یہ بھی گلہ سمجھا جاتا ہے مضمون شعر اور بندش نہایت چست ہے اسی مضمون کو غالب کے شاگرد رشید جناب سخن دہلوی نے کہا ہے

یوں کسی پر کوئی سرگرم جفا ہوتا ہے
پھر بھی اے یار جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ابھی دو غزلوں پہلے ہی اس مضمون کا شعر گذر چکا ہے۔ کہتا ہے کہ میں شکووں سے ایسا بھرا ہوا ہوں جیسے راگ سے باجا بھرا ہوتا ہے۔ ایک ذرا چھیڑ دیجئے پھر مزا دیکھئے۔

مصحفی ؎ شیشہ کے طرح سے ساقی
چھیڑ تا مت کہ بھرے بیٹھے ہیں

گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
شکوہ کے نام سے سرگرم جفا ہوتا ہے

اگرچہ میرے شکوے کو وہ کم سنی یا نہ سمجھنے کی وجہ سے سمجھتے نہیں ہیں۔ مگر اسکی تلافی اس طرح کرتے ہیں کہ جفائیں کرنے لگتے ہیں بقول مومن

؎ اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

مکوکب یعنی کوکب دار عشق کی راہ میں کم بخت آسماں کی ایسی سست چال ہے جیسے اس کے پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے ہیں ستاروں کو چھالے قرار دیا ہے۔ اور سست روی اس سے ثابت کی ہے سست رفتار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آسماں کی گردش سے رات دن ہوتے ہیں۔ مگر جدائی کے دن اور راتیں پہاڑ سی ہوتی ہیں اور درازی کیوجہ سے انکا کاٹنا دشوار ہوتا ہے۔

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

آخر ہم پر ظلم و ستم کیوں نہ ہوں۔ اگر اس سفاک کا کوئی تیر خطا ہوتا ہے تو ہم خود اسکو اٹھا کر لا دیتے ہیں کہ لے پھر ہمارے سینہ پر لگا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ بینمش
؎ آرم اعتراف گناہ نبودہ را

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

اگر پہلے سے ہم اپنے بدخواہ ہوتے تو بڑا اچھا تھا۔ کہ اپنا بھلا چاہتے ہیں تو برا ہوتا ہے برا چاہتے تو بھلا ہوتا۔

مومن ؎ مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب — لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

پہلے سینے کے نالے کی یہ کیفیت تھی کہ عرش تک جاتا تھا۔ مگر اب یہ زمانہ ہے کہ جو بڑا رسا ہوتا ہے وہ لب تک آتا ہے۔ یعنی اب حد سے زیادہ ضعف ہوگیا ہوں سالک۔

سلہ واے اس ضعف کہ سنتے تھے فرشتے اور کو — یا سنائی نہیں دیتی مری فریاد مجھے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن — شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

غزل لکھتے لکھتے قطعہ لکھ دیا ہے۔ کہتے ہیں میرا قلم کہ وہ بزمِ سخن کے لیے ایک باربد ہے بادشاہ کی یوں مدح سرائی کرتا ہے۔ باربد ایک گویے کا نام ہے۔ جو اپنے فن میں نہایت کامل تھا۔

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہر علم — تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

اے وہ بادشاہ کہ ستارے تیری سپاہ اور آفتاب تیرا علم ہے جیسا تو بزرگ ہے ویسا کون بیان کرسکتا ہے۔

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجیے — تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

اگر ساتوں ولایتوں کا محصول فراہم کریں تو وہ تیرے لشکر کے نعل کی قیمت ہے۔

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

چاند جو ہر مہینے میں گھٹ کر بدر سے ہلال ہوجاتا ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ تیرے آستانہ پر پیشانی گھستے گھستے اس کا یہ حال ہوتا ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں — یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

میں جو گستاخانہ اور بے تکلفانہ اچھی اچھی غزلیں پڑھتا ہوں اس کی کوئی اور وجہ نہیں ہے بلکہ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اے غالب میری گستاخی معاف کیجیے اور سمجھیے اگر نالوں سے تو بدمزہ ہوتا - آج درد دل کچھ بڑھ گیا ہے جس سے میں اس تلخ نوائی پر مجبور ہو گیا ہوں - اور مجھ سے اور دن کی طرح ضبط نہیں ہو سکتا -

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
خطا معاف یہ انداز گفتگو کیا ہے

آپ جو ہر بات پر مجھے فرماتے ہیں کہ تو ہے کیا چیز - ذرا معاف فرمائیے آپ نے یہ ایسا گفتگو کا طرز و طریقہ اختیار کیا ہے -

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

تند خوئی کے سبب میں خیال کرتا تھا کہ وہ شعلہ ہوگا - مگر دیکھا تو شعلے میں یہ کرشمے نہیں ہیں تو میں نے شوخی دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ وہ برق ہے مگر دیکھتا ہوں تو اس میں وہ ادائیں نہیں جو اس تند خو میں لہذا اس خیال کو بھی خیرباد کہنا پڑا - اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا اللہ کوئی کچھ بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کون ہے - اور اسے میں کیا کہوں -

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزیٔ عدو کیا ہے

مجھے اس بات کی مطلق فکر نہیں ہے کہ دشمن تمہیں پٹیاں پڑھاتا ہے - مگر اس کا رشک ضرور ہے کہ وہ تم سے باتیں کرتا ہے -

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

کوئی ہماری جیب و گریبان کے رفو کی کیوں فکر کرے ہمارا پیراہن لہو سے بدن پر چپکا ہوا ہی کافی ہے فارسی میں یوں کہا ہے ؎

بر تن چسپیدہ بازم از نم خونابہ پیراہن
خراش سینہ سطر بخیہ شد چاک گریبان را

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

وہ بڑی نادانی کہ میرا جسم جلا دیا ہے اور دل کو ابھی ڈھونڈھ رہے ہو یا راکھ میں ڈھونڈھ رہے ہیں کہ وہ نہ جلا ہوگا۔ کیا شیوۂ نادانی ہے ارے آخر یہ زحمت بیجا کیوں اٹھا رہے ہو جہاں جسم جلا ہے دل بھی جل گیا ہوگا۔ جناب نظم سکتے ہیں کہ کریدنا برا ہے۔ کیا مشغوق مرغی تھا۔ مگر کہنا بہت اچھا ہے بجائے اسکے اس محل پر کوئی دوسرا لفظ رکھا جاتا تو حقیقت کھلے

وہ چیز جس کے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

وہ چیز جس کی وجہ سے ہمکو بہشت کی تمنا ہو شراب کے سوا کیا ہے۔ پھر افسوس ہے کہ جس چیز کی وجہ سے حصول بہشت کی ضرورت ہو اسیکو بہشت کے لئے چھوڑ دیں۔

لطیفہ مرزا اسکے شغل کا وقت تھا۔ کوئی پارسا دوست تشریف لائے کہا ایں قبلہ و کعبہ یہ کیا آپ شراب پیتے ہیں۔ اس سے توبہ کیجئے۔ مرزا بولے تھی کیوں۔ دوست صاحب نے فرمایا کہ ادنیٰ نقصان اسکا یہ ہے کہ چالیس روز تک دعا قبول نہیں ہوتی۔ جواب دیا کہ جب شراب پینے کو میسر پاس موجود تو پھر اب دعا مانگنے کی ضرورت کونسی ہے۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

یہ مضمون بالکل پامال اور مبتذل اور بے لطف ہے۔ یعنی میرا شیشہ پیالہ کوزہ سبو سے کیا کام چلے گا۔ اگر دو چار خم بھی ملجائیں تو ہم چڑھا جائیں گے۔ یا یہ کہ شیشہ قدح دیکھکر پینے کو جی نہیں چاہتا اگر کہیں ایک دو خم دیکھ لوں تب پیوں۔

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

اول تو مجھ میں طاقت گفتگو بھی نہیں رہی اور ہو تو اس ستمگر سے کس امید پر کہوں کہ مجھے یہ تمنا ہے اسنے کونسے دن میری آرزو پوری کی ہے جو اب کرے گا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

چونکہ آپ بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل ہو گئے ہیں تو اتراتے پھرتے ہیں وگرنہ غالب کو پوچھتا کون ہے۔

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں   چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

میں انھیں چھیڑوں اور وہ شکر خاموش ہو جائیں اور کچھ نہ کہیں۔ تب یہی بڑی خیریت ہوگی کہ وہ اس وقت پیے ہوئے نہ تھے ورنہ دھجیاں اڑانے لگتے۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو   کاشکے تم مرے لیے ہوتے

میں نے مانا۔ کہ تم سراپا قہر ہو یا بلا ہو۔ میں یہ سب کچھ گوارا کرتا ہوں۔ بس اسے گوارا نہیں کرتا کہ تم دوسروں کے لیے ہو۔ کاش تم کسی حالت میں اور کچھ ہوتے مگر میرے لیے ہوتے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا   دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

اگر میری قسمت میں غم زیادہ تھا تو یا اللہ اسکے اٹھانے کے لیے کئی دل دیے ہوتے۔ کہ ایک نہ رہتا تو دوسرا اسکی جانشینی کرتا۔ اس مضمون کو اگرچہ غالب نے بھی خوب کہا ہے مگر میر تقی میر نے یہاں اس سے بھی اچھا بندھا ہوا ہے۔ ایک شعر ایک دیوان ہے۔ اسکا جواب نہیں ہے۔

؎ کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں   ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب   کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

اے غالب تم مر گئے سارے ابھی اور جیتے ایک دن وہ بھی راہ پر آ ہی جاتا۔ اسمیں معشوق کے جور و ستم کی زیادتی۔ اور اسمیں اپنی زندگی کے گزر جانے کا حسرتناک سین دکھایا ہے۔ دوسرا اسمیں طعن و تشنیع کا پہلو نکلتا ہے۔ کہ کیوں ٹھہر نہ سکتے تھے کہ ابتدا سے عشق میں مر جاتے مگر تم شرماتے اور یہی امید پر جیتے رہتے کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور راہ پر آ جائیگی۔ مگر آخر وہ راہ پر نہ آئے۔ اور تمھیں مرنا پڑا۔ کیوں مرے ابھی نہ مرو۔ کسی نہ کسی دن وہ راہ پر آ ہی جائیگا۔ خوب شعر کہا ہے۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے   ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

اپنی حرماں نصیبی اور دوسروں کی خوش نصیبی کا نقشہ دکھایا ہے۔ کہ ہائے غیر تو پیتا

اور ہماری کوئی بات بھی نہ پوچھے ۔ کسی کا [illegible] رہو

سہ ساقی نے دے جو جام سے لالہ فام کے
بیٹھا تو ہم بھی دے سے ہمیشہ ایک جام کے

سہ در خور اگر نسیم سے لالہ فام ہوا
اسے کلاہ ترکش ... بوسے مشام ہوا

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

ہم اپنے رنج و غم اور دل ٹوٹنے کی آپ ہی سے کیا شکایت کریں ۔ یہ سب آسمان کے ہتھکنڈے ہیں کہ وہ نئی نئی صورتیں ظلم و ستم کی نکالتا ہے ۔ اور نہیں تمہارا ... ہی ہاتھ سے رنج دلا دیا ورنہ تمہارا کچھ قصور نہیں ہے ۔

سہ تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ کچھ مطلب ہی ہو تب ہی تمہیں خط لکھیں نہیں کچھ مطلب ہو یا نہ ہو خواہ مخواہ لکھیں گے کیونکہ ہم تو محض تمہارے نام کے عاشق ہیں اسی میں اور نہیں تمہارے نام کی مشق تو ہوتی ہے ۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

یعنی رات کو شراب پی زمزم پہ بیٹھ کر ۔ اور صبح کو توبہ کر کے اسی کے پانی سے جامۂ احرام کے لگے دھبے دھوئے تھے ۔ سہ خوب پی رات کو صبح کو توبہ کر لی + رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

میرے دل کو میری آنکھوں نے تمہارے عشق کے جال میں پھنسایا ۔ غالباً یہ میری آنکھیں تمہیں تمہارے دام حسن کے حلقے تھے ۔

شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

بادشاہ کے غسل صحت کی خبر اڑی ہوئی ہے ۔ دیکھئے کب حضور غسل صحت فرماتے ہیں اور

کام کے اچھے دن کب آتے ہیں ۔

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اے غالب ہمکو عشق نے بیکار کردیا ورنہ ہم بھی کام کے آدمی تھے ۔

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

یہ غزل نہایت ہی صاف کہی گئی ہے ۔ یعنی پھر اس انداز سے بہار آئی ہے کہ آفتاب و ماہتاب تک تماشا دیکھ رہے ہیں ۔

دیکھو اے ساکنان خطہ خاک اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

اے زمین کے رہنے والو دیکھو عالم آرائی اسکا نام ہے ۔

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر روکش سطح چرخ مینائی

کہ تمام آسمان کو مات کر رہی ہے بلحاظ سبزی کے ۔ یا بلحاظ اس بات کے کہ بہار نے اوسکا مرتبہ بلند کر دیا ہے ۔

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ کی یہ کثرت ہے کہ جب زمین پر اوسکو جگہ نہ ملی تو کائی کی صورت میں پانی پر جم گیا

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے چشم نرگس کو دی ہے بینائی

صرف سبزہ و گل کے نظارہ کے لئے نرگس کی آنکھ کو بینا کر دیا ہے ۔

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

جب موسم نے ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا کر دی ہے تو شراب پینا بالکل فضول ہے ۔

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب — شاہ دیندار نے شفا پائی

یہ خوشی کا عالم بے وجہ نہیں ہے بلکہ ایسا ہونا چاہیے کیونکہ بادشاہ قبلہ عالم نے صحت پائی

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے — اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

میں تغافل کو دوست رکھتا ہوں۔ میرا دماغ عجز بہت بلند ہے کہ اگر مجھ سے آپ پہلو تہی کریں تو میں اس پہلو تہی کو سمجھوں کہ آپ نے میرے لئے جگہ خالی کی۔ فارسی میں یوں کہا ہے۔

در آغوش تغافل عرض یکرنگی توان دادن — تہی تا میکنی پہلو بجا نمودہ جا ہا را

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

اگرچہ دنیا آباد ہے مگر اہل ہمت اس میں نہیں ہیں۔ گویا یہ ایک میخانہ ہے جس میں شراب نادارد ہے جام و سبو بھرے پڑے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اہل ہمت کا نہ ہونا دنیا کے آباد رہنے کا سبب ہے۔ کیونکہ اگر دنیا میں سب اہل ہمت ہی ہوتے تو وہ سب دنیا کو ترک کرکے بیٹھ رہتے اور دنیا ویران ہو جاتی۔ جسقدر جام و سبو بھرے ہیں میخانہ میں شراب نہیں ہے جسقدر کے لفظ سے مصنف نے یہ بھی فائدہ اٹھایا ہے کہ جسقدر جام و سبو زیادہ بھرے ہوں گے میخانہ کے خالی کی دلیل ہے اس سے میخانہ کی شان گھٹتی جائیگی اور کمہار کے گھر کی شان پیدا ہوتی جائیگی یعنی بجائے جام و سبو کے کبھی شراب بکثرت ہوتی اگر جام و سبو نہ ہوتے یا یہ کہ اہل ہمت کے نہ ہونے سے دنیا آباد ہے کہ جام و سبو کو جسقدر بھر بھر کر دیں گے میخانہ خالی ہوتا جائیگا یعنی یہ لوگ اگر میخانہ دنیا میں ہوتے تو دنیا کو لٹا دیتے اور ان کا جود و کرم دنیا کو آباد نہ رہنے دیتا۔

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

میری کہانی اول تو وہ سنتا ہی کب ہے۔ اور اگر سنے بھی تو کیا میری زبانی سنے گا۔ شعر پتہ دیتا ہے کہ پہلے مصنف نے مصرعہ اولے کہا ہے۔

خلش غمزہ خونریز نہ پوچھ　　　دیکھ خونابہ فشانی میری

یہ کیوں پوچھتا ہے کہ میرے غمزہائے خونریز نے تیرے ساتھ کیا بدسلوکی کی۔ صرف یہ دیکھ لے کہ میری آنکھوں سے کسقدر جوئے خوں رواں ہے یعنی میرا دل ان سے خون ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے میں خون روتا ہوں۔ دوسرا پہلو یہ نکلتا ہے کہ ہاں ہاں اچھا خلش غمزہ خونریز نہ پوچھ میری خونابہ فشانی کا تماشہ دیکھ۔ یہ بھی یا ازراہ طنز کہا گیا ہے۔ یا بصورت علم کہ اگر یہ نہ کرے تو یہ تو کر۔ بہر حال کچھ نہ کچھ چاہیئے۔

کیا بیاں کرکے مرا روئینگے یار　　　مگر آشفتہ بیانی میری

میں مر جاؤں گا تو لوگ میری کونسی اچھی عادت کو بیاں کرکے روئینگے بجز ایک آشفتہ بیانی ہی ایسی ہے جسے یاد کرینگے۔

ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال　　　بھول جاتا ہے نشانی میری

خیال جیسا ایک جنگل ہے جس سے میں نکل گیا ہوں اور اب میری نشانی صرف یہ ہے کہ وہ مجھے بھول گئے ہیں۔

یا یہ کہ میں خیال یار کے دشت ناپیدا کنار میں از خود رفتہ ہو گیا ہوں اور میری گم گشتگی اور از خود رفتگی کا نشان یہ ہے کہ وہ مجھے بھول گیا ہے۔

متقابل ہے مقابل میرا　　　رک گیا دیکھ روانی میری

میرا معشوق مجھ سے رک گیا یعنی خفا ہو گیا۔ اور اسکی رکاوٹ محض میری روانی یعنی حاضر جوابی و بذلہ سنجی سے تھی۔ غرض یہ کہ وہ میرا متضاد اور مقابل ہے کیونکہ بیان کر چکے ہیں۔

سہ　زخم گر دب گیا لہو نہ تھما　　　کام گر رک گیا روانہ ہوا

قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں　　　سخت ارزاں ہے گرانی میری

میری گراں قدری کچھ قابل تحسین نہیں ہے بلکہ ازراہ نفرت ہے اور اسکی مثال ایسی ہے جیسے کہ پتھر گراں ضرور ہے مگر اسیقدر ارزاں اور بےقدر ہے کہ ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا فارسی میں فرماتے ہیں ۔

تا کس زتو مندی ظاہر نشود کس ۔ چوں سنگ سرِ رہ کہ گرانست و گران نیست

گرد باد رہ بیتابی ہوں ۔ صرصر شوق ہے بانی میری

میں راہ بیتابی میں ایک بگولہ بنگیا ہوں ۔ اور یہ سب ہوائے شوق کا کرشمہ جسنے میری یہ صورت بنا دی ہے ۔

وہن اُسکا جو نہ معلوم ہوا ۔ کھل گئی ہیچمدانی میری

یہ ایک معمولی اور تبذل مضمون ہے کہ میں نے اُس کے دہن کے معلوم کرنیکی کوشش کی مگر اس نکتہ کو معلوم نہ کر سکا ۔ لہذا میری ہیچمدانی کا حال کھل گیا ۔ یا یوں سمجھے کہ دہن معشوق ہیچ ہے اور میں اوس ہیچ کو معلوم نہ کر سکا لہذا ہیچمداں ٹھہرا

کردیا ضعف نے عاجز غالب ۔ ننگ پیری ہے جوانی میری

یعنی اگرچہ جوان ہوں مگر اسقدر ضعیف و نحیف ہوں کہ سو بڈھوں کا ایک بڈھا معلوم ہوتا ہوں ناطق

جوانی ولولوں کی عمر ہی کا نام ہے ناطق ۔ ہماری بھی جوانی کچھ جوانی ہے جوانی ہے

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب ۔ پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

آغوش رقیب میں ہونیکی حالت میں اسکی تصویر چاہتی ہے کہ مانی کے ہاتھ پاؤں سے طاؤس بجائے خامہ کے ۔ یا یوں سمجھئے ۔ یہ ظاہر ہے کہ طاؤس کے تمام اعضا سوا پاؤں کے خوبصورت ہوتے ہیں یہاں اس وجہ سے ایسا کہا گیا کہ اسکی تصویر بھی اچھی تصویر کا کھینچنا کتنی ہی اچھا کھینچنے والا بھی استاد ہو ۔ مرزا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ وہ آغوش رقیب میں ایسا ہے جیسے پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت ۔ زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

مصنف نے یوں نہیں کہا کہ اسکی تصویر اس صورت میں یوں کھینچی جائے بلکہ یہ کہا ہے کہ اسکی تصویر کا یہ تقاضہ ہے کہ اسوقت میرا کھینچا اسطرح زیبا ہے گویا میں رقیب کے پاس بیٹھنا برا نہیں جانتا بلکہ یہ قدرتی امر ہے کہ برا معلوم ہوتا ہے۔

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے — غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

تیری عادت ایسی بری کہ میری حیرت سے مجھکو محو تماشا سمجھتا ہے۔ اور میرے غم کا ایسا افسانہ ہے جو چاہتا ہے کہ آشفتہ بیانی بھی اسکے ساتھ ہو۔ یا یہ کہ میری حیرت تیرے لئے ایک تماشہ ہے اور اگر اس سے آشفتہ ہوں اور میرا غم مجھے مجبور کر دے تو تو آشفتہ بیانی سمجھتا ہے غرض دو گونہ رنج و عذاب ہے یعنی مجنوں را بلا فرقت لیلے و صحبت لیلے۔ چپ رہوں تو مصیبت کچھ کہوں تو آفت

وہ تب عشق تمنا ہے کہ پھر صورت شمع — شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

یعنی وہ تپ عشق اور حرارت کی تمنا رکھتا ہوں کہ شمع کی طرح پھر شعلہ رگ ہد سے جگر تک سرایت کرے۔ یعنی وہ شعلہ ہو کہ میرے جسم و جگر سب کو پھونک دے۔

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے — ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

چونکہ پھولوں کو تیرے پاس بیٹھنا اور تجھ سے ملنا اچھا معلوم ہوتا ہے لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ غنچے جو کھلتے ہیں یہ گویا جوش شوق میں تجھ سے ملنے کے لئے آغوش کھولتے ہیں۔ بیدل۔

چو غنچہ ہر مژہ آغوش سے جدا بیند — کہ جائے تو ہمہ در چشم دوستاں خالی ست

واں کنگر استغنا ہر دم ہے بلندی پر — یاں نالے کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے

واں کنگرہ استغنا بلند ہوتا چلا جاتا ہے اور یہاں نالہ الٹا یہ دعوے کرتا ہے کہ یہ میری رسائی کے سبب ہوا ہے۔ یعنی میرے نالہ کا اگر اثر ہوتا ہے تو اتنا کہ وہ مجھ سے اور بھی مستغنی ہو جاتا ہے

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے — جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

غم مجھکو ضبط کے انداز سکھاتا ہے۔ اور ہر داغ سے چشم نمائی کا کام لیتا ہے۔

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی　　لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

ایسا جو زخم ایسا ہو کہ اُسکی تدبیر چارہ گری ہو سکے میں ایسا زخم نہیں چاہتا - وہ زخم دشمن کی قسمت میں لکھدے - یعنی میرا درد لا دوا ہونا چاہیئے -

س ۵ دریوزہ راحت نتوانکرد ز مرہم　　غالب ہمہ تن خستہ یارست گدا نیست

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور　　دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

میرے لئے یہ اچھا ہے کہ میں اُسکی انگشت حنائی کا خیال اپنے دل میں رکھوں کم از کم اس سے اتنا فائدہ ہے کہ میرے جسم کا تمام لہو خشک ہو گیا ہے اس سے میرے دل میں ایک لہو کی بوند تو نظر آتی ہے یعنی وہ لہو کی بوند سے مشابہ ہے اس تشبیہ سے مصنف نے کئی فائدے اٹھائے ہیں - معشوق کی انگلی کی پور کی نزاکت اور تزئین اور اسکو اپنے دل کے لئے لہو کی بوند بناتا - بلحاظ بلاغت معنی کے شعر کا لفظ لفظ با معنی ہے یعنی عاشق کے تباہ ہونے پر وہی معشوق کا خیال جسنے تباہ کیا ہے باعث آرام ہو جاتا ہے عاشق کو ہر حال میں معشوق کا خیال چاہیئے - معشوق کے ہر عضو بدن کو دل میں رکھے اس شعر میں معانی کا دوسرا پہلو بھی یہاں لطیف ہے - یعنی کوئی غمخوار دوست - یا خود اُسکی عقل اُسکو سمجھاتی ہے کہ اب اس خیال کو چھوڑ دے تیرے دل میں بالکل خون باقی نہیں رہا - اب یہ خیال تیرے دل میں بڑا اثر پیدا کرے گا اور اُسکے جواب میں یہ کہتا ہے کہ واہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ اچھا نہیں ہے یہ خیال میرے لیے اچھا ہے - ابھی میرے دل میں ایک خون کی بوند دکھائی تو دیتی ہے اسے بھی کیوں نہ صرف خیال انگشت حنائی کروں - لہذا جب تک خون کی ایک بوند بھی دل میں ہے یہ خیال اُس وقت تک میرے لئے اچھا ہے - جب خون نہو تو خیر مجبوری ہے -

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے　　یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

تم عشاق کی بے حوصلگی - اور بیتابی - بے صبری سے کیوں ڈرے جاتے ہو - یہاں کون کس کی فریاد سنتا ہے یعنی دنیا کا تیرے زمانہ میں یکساں حال ہے - اگر کوئی تمھاری فریاد کرے بھی تو بیکار ہے اسمیں کسو کا لفظ مصنف کے بھی متروکات سے ہے اور وہ خود بھی اسکو غیر فصیح اور بجائے اسکے کسی فصیح سمجھتے تھے -

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ — حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کے

غالب اوس ناکام پر بڑا افسوس ہے ۔ جو ایک عمر ایک معشوق ستمگر کی حسرت میں گذار دے ۔

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو — خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

یعنی معشوق ستمگر کے خنجر نے کبھی اُس مظلوم ناکام کے گلو مشتاق قتل کی بات تک نہ پوچھی ہو اور اوسکے دشنہ جانستاں نے کبھی جگر کو منہ نہ لگایا ہو ۔ دونوں محاورے سے نہایت ہی برمحل صرف ہوئے ہیں ۔ یعنی چھری کا جگر کو منہ لگانا جگر کے ٹکڑے اڑانا ۔ اور خنجر کا گلو کی بات پوچھنا اوسکو کاٹنا ہے ۔ خنجر چونکہ بصورت زبان ہوتا ہے اس لئے یہ دونوں محاورے لکھے ہیں ۔ یعنی اوس ناکام کی حسرت بڑی حسرت ہے جسکی قتل کی آرزو بھی پوری نہ ہو ۔

سیماب پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم — حیراں کئے ہوئے ہیں دل بیقرار کے

اس شعر میں بھی دو معانی پیدا ہوتے ہیں کہتا ہے کہ سیماب کا کام یہ ہے کہ وہ آئینہ کی مدد کرتا اور اسکو آئینہ بناتا ہے ۔ ایسے ہی ہمارے دل نے جو مثل سیماب ہے ہمکو حیران کرکے مثل آئینہ بنادیا ہے دوسرا پہلو یہ ہے کہ سیماب کا کام یہ ہے کہ یہ آئینہ کی مدد کرتا ہے ۔ اور اسکو چمکاتا ہے ۔ برعکس اسکے ہمارے دل بیقرار نے ہمکو حیران بنادیا ۔ اور پریشان کردیا ۔ یعنی ہم بیکار ہوگئے اور یہ گویا یہ اس سیماب کی نئی تاثیر ہے ۔ ورنہ دنیا میں تو یہ نہیں ہوتا ہے ۔

آغوش گل کشادہ برائے وداع ہے — اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

گل نے اپنی آغوش کھول رکھی ہے کہ جلد سب سے رخصت ہوجائیں لہذا اے عندلیب اس پر نہ بھول کہ بہار ابھی موجود ہے ۔ نہیں بلکہ گل رخصت ہورہے ہیں اور بہار سدھارتی ہے ایک جگہ فارسی میں بہار کے آمادہ وداع ہونیکی یوں توجیہ کی ہے ۔

س بجز و برگ گل تا قطرۂ شبنم نہ پنداری — بہار از حسرت فرصت بدندان میگزد لب را

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں — معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

اگر وصل میں عالمِ تمکین و ضبط قائم رہا۔ تو وہ وصل وصل نہ رہا۔ وہ ہجر ہو گیا۔ بلکہ معشوق کو شوخ اور عاشق کو دیوانہ رہنا چاہیے تاکہ ضبط و تمکین کا نام تک نہ آنے پائے۔

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

کبھی نہ کبھی اسکے لب کا بوسہ مل ہی جائیگا۔ ایک یہ فضول شوق اور رندانہ جرأت چاہیے۔ باقی کچھ ضرور نہیں ہے بوسہ کے شوق کو شوقِ فضول اس لئے کہا ہے کہ مصنف اسکو بوالہوسی کہتا ہے نہ کہ عاشقی۔

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

دنیا میں جتنا چاہیے اچھوں کو چاہیے اگر اس چاہنے کے اثر سے یہ لوگ چاہنے لگیں تو ہیں پھر کیا ہی ہوا المقصود ہے المراد اس سے اچھی کونسی بات ہے۔
دوسرا پہلو یہ ہے کہ میرا معشوق ابتک جو انکو چاہتا ہی کاش اسکا یہ خیال ہو جائے کہ جیسا اچھوں کو چاہنا چاہیے۔ پھر مجھے کیا پروا ہے۔ مصرعِ ثانی میں یہ کی ضمیر اس صورت میں جانبِ معشوق اور چاہنے کا فاعل بھی معشوق ہی کو قرار دیا جائے گا۔

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

رندوں اور شراب خواروں کی صحبت سے پرہیز ضروری ہے بجائے میکشی خود کھینچنا چاہیے۔

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

میرا دل جو آپکے عشق میں زار و بیقرار اور دیوانہ ہو گیا ذرا اب اسکو بھی سمجھ لیجئے کہ آپکے چاہنے کو دل نے کیا سمجھا تھا۔ مصرعِ ثانی میں سمجھنا بمعنی سزا دینا اور باز پرس کرنا استعمال کیا ہے۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

بغیر فصلِ گل گریبان نہ پھاڑ۔ لطف تو اسمیں ہے کہ ذرا ادھر سے گریبان دری کا اشارہ ہو ادھر اسکے پرزے پرزے اڑا دیے۔ ادھر لباسِ غنچہ پارہ پارہ ہو ادھر تم بھی اپنا گریبان چاک کرو

تشریح ۔ سحر کی گریباں دری سے پھر چاک لیتا ہے کہ سو قسمت گریباں پھاڑنے کے لیے پیدا ہوا ہے [illegible]
یہ ایک نیا مضمون ہے ۔ یعنی معہد [illegible] یاں مضمون میں یہ جدت کی ہے کہ فصل بہار میں [illegible]
چاک کرنا بہار کے لیے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اسکا ایک قدرت ہے ۔

شعر خزاں میں چاک گریباں سے آ گئی ہے

مزا بہار کا ہے اک ذرا بہار آ سے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی

منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

تم جو ہم سے اور اپنے عشق کے چھپانے کی غرض سے پردہ کرتے ہو یہ تمہارت [illegible] سراسر نادانی
ہے ۔ لوگ اس لاگ میں لگا دیں کا پہلو نکالیں گے اور راز کھل جائے گا تو مجھ سے [illegible]
ہوا ہے آ سی سے پردہ بھی کیا جاتا ہے ۔ لہذا آپ پردہ کرنا چھوڑ دیجئے [illegible]

شعر میری [illegible] و خلقے بدگمان است زتو

بے حجابانہ شود پیش گراں برخیزد

شعر حیا خمار ہی راز محبت کا کھول دیتی ہے

نگاہ وقت ہم سے شوخی [illegible] قربان پیدا کر

دشمنی نے میری کھویا غیر کو

کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے

یعنی شعر وہ یوں دشمن کا دشمن ہو کہ جیسے دشمن ہوا میرا ۔ اسکی دشمنی کی کیا حد ہے [illegible]
دوست کہ میرے [illegible] تعلقات بھی نہیں رکھ سکتا ۔

شعر ذکر میرا بدی سے بھی اُسے منظور نہیں

غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

آتش مرحوم اس مضمون کے [illegible] فرماتے ہیں ۔ اور کیا خوب [illegible] ہے

شعر مری ضد سے ہوا ہے مہرباں دوست

[illegible] دشمن پہ ہزار [illegible]

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی

یار ہی ہنگامہ آرا چاہئے

ہماری کوشش سے ہمکو رسوائی نہیں ہو سکتی [illegible]
[illegible] بلکہ یہ سب یار ہی کے اوپر دار و مدار ہے وہ چاہے تو [illegible]

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید

نا امیدی [illegible]

اوس شخص کی نا امیدی کو دیکھنا چاہئے جسکی امید موت [illegible]

بعد وہ زمانہ ہے جسکے اندر کوئی امید پوری ہو ہی نہیں سکتی۔

تغافل ان مہ طلعتوں کے واسطے　　　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

ان میں تو چاند کے ٹکڑوں کا چاہنے والا بھی ایسا ہی ہو۔

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد　　　　آپکی صورت تو دیکھا چاہیے

جناب اسد بھی خوبرویوں پر مرتے ہیں۔ ذرا آپ کا حلیہ تو ملاحظہ کیجئے۔ یعنی آپ اس قابل نہیں ہیں۔

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے　　　　میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ہر قدم پر دوریٔ منزل نمایاں ہوتی جاتی ہے اور چونکہ بیاباں میری منزل ہے لہذا گویا میری رفتار بیاباں کی رفتار بن گئی ہے کہ جسقدر میں اسکی طرف بڑھتا ہوں وہ مجھ سے بھاگتا جاتا ہے۔

درس عنوان تماشا بہ تغافل خوشتر　　　　ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

عنوان تماشائے دوست کا درس حالت تغافل یار میں اچھا ہے تاکہ اس پر یہ ظاہر نہ ہو۔ اور اسکے سوا دوسروں پر بھی یہ راز نہ کھلے کہ نگاہ نے عنوان تماشا کا درس لیا یعنی کسکو دیکھا اس وجہ سے نگاہ رشتۂ مجھے شیرازۂ مژگاں بنی ہوئی ہے یعنی مجھ سے بھی چھپی ہوئی اور نگاہ کا یہ فعل اس لئے ہے کہ اسکا راز عشق پر تو کیا مجھ پر بھی نہ ظاہر ہو۔

مطلع فرماتے ہیں یعنی میرے نگاہ شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بنی ہوئی ہے حاصل

میرا دل جو آپ

چاہنے کو رشتہ سمجھا لیا تھا مصرع ثانی　مجھ سے باہر نہیں نکلتی اور تماشائے دنیا سے درس لینا تھا

مبالغہ پیدا کرنے کے لئے لائے ہیں یعنی سارا تماشہ تو

چاک مت کر جیب بے ایام گل　　دماغ ہے یہاں عنوان تماشا کے دیکھنے سے بھی تغافل کر

بغیر فصل گل گریباں نہ پھاڑ　　ظاہر ہے کہ رشتہ شیرازہ مژگاں غیر محسوس ہوتا ہے بس مطلب

اسکے پرزے پرزے اڑا دیئے۔ اور　بحذف استعارات محبوب کے دیدار کا لطف اسی حالت

میں ہے لیکن اسے دیکھیں اور اسے ... ہی لیکن ہے کیونکہ آپنے عالم امکان پر اسباب کا پردہ ڈال دیا ہے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں

میری وحشتِ دل کی آگ سے شبِ تنہائی ... ہے
مضمون کو لکھ چکے ہیں ...
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں

کہیں عشاق کے غم معشوقوں کو ... ہے
کتنا ویران ہو گیا ہے - یعنی ایک میں دل ... چھوڑ دیا ہے تو آئینہ خانہ بیں سناٹا اور ... جہاں زینت کو ترک کر دیں تو اور بھی ... یا ہو کہ صیغہ امر کا قرار دیکر غم ... سادگی نہ سکھا - کم بخت ذرا دیکھ تو ... یعنی میرے غم میں آئینے نے چھوڑ دینا چاہا ہے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے [illegible]

میرے صحرائے جنوں کا جادہ ...
چمک چمک کر چراغاں کا عالم دکھا رہا ہے
یہ عالم پیدا کیا ہے . یا میرے آبلہ کا منظر دکھا رہے ہیں -

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو

خدا کرے میری بیخودی کو بستر تمہید ...
سایہ کی طرح مجھ سے بھرا ہوا ہے ...

تمکو چاہا ہوں کہ ہشیار آؤ تو بلائے نہ بنے

... تھا ایک دن ضرور آؤ گی - مگر تمہارے آنیکا ستمی کیوں ہو ... آجاتے تو پھر تمکو کس منہ سے بلاؤں -

... یہ بھی موجود ہے کہ جب کبھی موقعہ ضرورت ... ہے مگر ... ہو وہ بھی ہے - مگر ایسی ضروری شے کے بلانے کو ... سکتا

میں جانتا ہوں کہ آپ کے آنے سے مجھے شادی مرگ ... ہی نہیں ہو سکتا کہ تم شاد آؤ کیونکہ اگر بلانا چھوڑتا ہوں تو ... ورت کا ایسا ہے اور اسکا آپ کے بلانیکی حالت میں کیوں ... پیدا نہیں سکتی -

... اور مناسب مقام ہیں - کہ جو شب روز میں موت کا انتظار ... ہے اور وہ اسکی راہ تکنی شروع کرنی چاہیئے وہ تو خواہ مخواہ ... اسکا سبب اور اسکے بلانیکی تدبیر یہ ہے کہ میں چاہا ... اس خواہش کا نتیجہ لازمی یہ نکلے گا کہ تم مجھ سے ناراض ... اور پھر اس صدمہ سے لازمی مجھے موت آجائیگی .

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

... معلوم ہوتا ہے جس کا مفہوم بصورت قطعہ کے یہ پیدا ... الگ کرتے دھر تے نہیں بن پڑتا - اور اتمیر ... نے

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

غالب عشق پر کسید کا تردید نہیں ہے یہ ایک ایسی آگ ہے نہ لگائے لگے نہ
بجھ سکتی ہے یعنی اگر چاہیں کہ معشوق کے دل میں یہ آگ لگا دیں یا
بجھا دیں تو قریب قریب غیر ممکن ہے۔

چاک کی خواہش اگر وحشت بعریانی کرے
صبح کے مانند زخم دل گریبانی کرے

جب گریبان نہ رہے اور وحشت کو خواہش چاک دری ہو تو
یعنی جیسے گریبان صبح چاک ہوتا ہے اسی طرح زخم دل کا گریبان چاک کا حلیہ ہو

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجیے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

تیرے جلوہ کا وہ عالم ہے کہ اگر خیال کریں تو آنکھ

ہے شکستن سے بھی دل نومید یا رب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرض گرانجانی کرے

ہمارا دل شکستگی سے بھی مایوس ہو گیا یعنی چاہتے ہیں
بھی منظور نہیں کرتا۔ الحمد آبگینہ کب تک کوہ پر اپنے گرانجا
اسیر رحم خدا لیگا۔

جناب نظم صاحب فرماتے ہیں کہ لفظ شکستن نے شعر کو قابل یا رہیں
اور الفاظ سے لیتے ہیں لیکن فارسی مصدر کا استعمال ہے اور مگاہ
میں نظم ہو یا نثر ایسا نہیں دیکھا۔ فقط۔

مولانا کی اس تحریر نے مجھے تعجب میں ڈال دیا۔ اگر غالبا چھپ یا
سے بھی ہے دل نومید الخ مگر غرض مصنف کی صرف تفنن
اکثر ایسا حسن پیدا ہو جایا کرتا ہے جو اردو کے لفظ سے نہیں
مصادر وغیرہ محض اسی لئے استعمال کرتے ہیں۔ مولانا نے ارشاد
کہ کسی کے یہاں مصدر نہیں پایا جاتا کہ اردو میں استعمال کیا
وغیرہ سب کے یہاں اس صورت سے نظم میں مصدر ہے شیرازہ جیسے میر
میر آنسو کی بوند آنکھوں سے دونوں تو نکلتے ایک نہیں

پیدا اس سے میرے بستر مرض کے لئے شمع بالیں بنگیا ہو۔

یہ طوفاں گاہ جوش اضطراب شام تنہائی
شعاع آفتاب صبح محشر تار بستر ہے

اضطراب شام تنہائی ایک طوفان ہے جسمیں ہر ایک تار بستر شعاع آفتاب قیامت معلوم ہوتا ہے پہلے مصرع میں چار اضافتیں ہیں بعض محققین نے توالی اضافات کو عیب اور چار اضافتوں کے متواتر جمع ہونے کو ثقیل کہا ہے۔ گریہ اس حالت میں جب کلام میں ثقالت پیدا ہو جائے۔

ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلف مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

ابھی میرے بستر کے تکیوں سے اسکی زلف عنبر کی خوشبو آرہی ہے۔ یعنی شب وصل کو گذرے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ میری قوت دیدار کیلیے یہ خواب زلیخا۔ یعنی اپنے معشوق کا خواب میں دیکھنا باعث ننگ و عار ہے۔ یعنی اس سے زیادہ تو یہ خوشبو ہی جو تکیہ میں اسکی آتی ہے یا یہ کہ وہ خواب میں میرا ہمخواب تھا اور اسکے اثر سے اب تک میرے تکیہ سے اسکی خوشبو اور زلفوں کی خوشبو کی لپٹیں آرہی ہیں تو گویا اسکا خواب میں دیکھنا میرے لئے باعث ننگ ہو گیا کہ دوسرے بھی یہ خوشبو سونگھ رہے ہیں۔ اور میں اس رشک کو گوارا نہیں کر سکتا۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

اسکی جدائی میں اے غالب اپنے دل کی حالت کیا بیان کروں مختصر یہ ہے کہ میرے بستر کا ہر ایک تار کانٹا بنا ہوا ہے گویا میرے بستر پر کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔

خطر ہے رشتۂ الفت رگ گردن نہ ہو جائے
غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

یعنی ڈر ہے کہ یہ رشتۂ الفت جو تجھ میں اور مجھ میں کمال کو پہونچ گیا ہے کہیں یہ رشتہ میرے لئے شہ رگ نہ بنجائے اور اسکا تجھے غرور نہ ہو جائے کہ اسکے عتاب اور سزا میں تو میرا دشمن ہو کر اس رشتہ کو قطع کرے اور اس سے میری گردن پر چھری چل جائے۔

ہاتھ لگانے — رگ گردن چونکہ غرور کو کہتے ہیں اسواسطے اس لفظ نے وجوہ دیگر مولانا نظم کو یہ معنی جوش — لینے پر مجبور کردا اجراحت و سب مقام نہیں معلوم ہوتے معشوق سے خطاب ہے اور میری

دوستی و محبت پر تجھے غضب کا غرور ہوا ہے (اقول یہ امر خلاف واقعہ ہے معشوق کو عاشق کی دوستی پر غرور نہیں ہوتا۔ قال ایسا نہ ہو کہ دشمنی کی طرف منجر ہو جائے (اقول کوئی وجہ نہیں ہے) اور یہ رشتۂ الفت تیرے لیئے رگ گردن ہو جائے۔ اور رگ گردن غرور کو کہتے ہیں (اقول حالانکہ پہلے فرما چکے ہیں کہ میری محبت و دوستی پر تجھے غضب کا غرور ہوا ہے۔ معلوم نہیں دوبارہ غرور کیسا + یعنی ایسا نہ ہو کہ غرور میں اکثر دشمن کی طرح ہمیشہ تجھ سے گردن ٹیڑھی رہے۔ اقول یہ تیسری مرتبہ وہی کلمے دہرا دیئے ہیں۔ معلوم نہیں مولانا نے کیا خیال کیا۔ کہ انھیں معانی کو تین مرتبہ دہرایا۔ اور جو ل نہ پہلے شعر کے الفاظ بالکل ان مضمون کے خلاف ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب مولانا حسرت صاحب کے یہاں بھی یہی معنی ہیں۔

سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما غالب
اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

اگر اس فصل میں سرو پر اسقدر پھول نہ آئیں کہ اسکو ڈھانک نہ لیں اور انکا پیراہن نہ بنجائیں تو سمجھنا چاہیے کہ نشو و نمائے سبزہ کچھ بھی نہ ہوئی۔ یعنی فصل میں سبزہ کے نشو و نما اور پھول کھلنے کی یہ کثرت ہے کہ سرو جیسے پر پھول نہیں آتے اس پر بھی پھول آنے چاہئیں اور اسقدر آنے چاہئیں کہ پیراہن سرو ہو جائیں ایک عجیب صورت سے فصل کے سبزہ کے نشو و نما کی تعریف کی ہے کہ ساتھ ہی تصویر کھینچ دی ہے نہایت خوب شعر ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

فریاد کرنے کیلیے موسیقی اور ساز کی ضرورت نہیں ہے جسطرح چاہیئے رو لیجیئے۔ مصنف نے ہندی کا قافیہ ایسی اچھی طرح نظم کیا ہے کہ اس سے بہتر قریب قریب مشکل ہے۔

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

اگر باغ گدائے مے نہیں ہے تو کیا سبب ہے کہ باغ میں تونبے بوئے جاتے ہیں ضرور یہ اسکے کشکول گدائی کا کام دیتے ہیں۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

اگرچہ تو ہر ایک شے میں ہے۔ مگر عالم جسمانی میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جو تجھ سے مشابہ ہو۔
ہر ایک شے میں تیرا ظہور ہے اور سب سے جدا - با ہمہ و بے ہمہ -

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کہتا ہے کہ ہستی کا فریب نہ کھانا کوئی یہ کہے جائے کہ ہے تو یہی سمجھنا کہ نہیں ہے۔ ایسا ہی یہ شعر کہا ہے

سہ شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

اگر چاہتا ہے کہ تجھے غم نہ اٹھانا پڑے تو شادی کو بھی چھوڑ دے کیونکہ اگر بہار کا موسم نہ ہو تو خزاں کا بھی اندیشہ نہ رہے ایسے ہی جسے عیش کی پروا نہیں ہے اوسکو تکلیف کا کیا غم۔

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

اے زاہد شراب کا پیالہ تو کیوں واپس کرتا ہے کوئی یہ شہد تو ہے نہیں۔ مگس کی قے بمعنی شہد کیونکہ جو مستعمل ہو گیا ہے۔ یعنی مکھی پھول وغیرہ سے جو کچھ چوستی ہے وہ شہد بنکر منھ کی راہ سے واپس ہوتا ہے۔ اسی لوٹنے کی رعایت سے ردِ قدح کہا گیا۔ ردّ بھی قے کو کہتے ہیں۔
مرزا کے ایک مخالف نے ایک مرتبہ میرے سامنے اس شعر پر یہ اعتراض کیا کہ مگس کی قے صحیح نہیں ہے اتفاق سے مجھکو ظہیر فاریابی کا یہ شعر یاد آگیا۔ مصرع [illegible] شہد ہو مجلس میں پڑھا۔ مگر ذرا سے سمجھے کہ اگر ظہیر فاریابی نے بھی یہ شعر کہا تو قریب قریب وہ بھی غلط ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نہ ہستی ہی کوئی شے ہے نہ عدم کوئی چیز ہے تو پھر اسے جناب نہیں ہے صاحب یہ تو ہے بھی یا یونہی۔ از راہ شوخی نہیں ہے کو جو غزل ہذا کی ردیف ہے مرزا کا نام رکھ لیا گیا۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا کہ اسمیں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

جراحت دل کے مرہم کا نسخہ کیا پوچھتا ہے جسمیں الماس کا ریزہ جزو اعظم ہے جو زخم کو بڑھا دیتا باقی اجزا نمک مشک وغیرہ ہیں۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

تیرے تغافل سے ایک عرصہ دراز کے بعد ہم نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ اب تو کبھی کبھی ایک دزدیدہ نگاہ ہم پر ڈال لیتا ہے۔ اگرچہ یہ نگاہ نگاہ نہیں کہی جا سکتی مگر تاہم گندم اگر بہم نرسد جو غنیمت است۔ مولانا ظہوری فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں۔

تو نظر باز نۂ ورنہ تغافل نگہ است　　تو سخن فہم نۂ ورنہ خموشی سخن است

اس شعر نگہ کو نگاہ سے کم بتایا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نگہ میں نگاہ سے ایک الف کم ہے۔

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　　مرتے ہیں مگر اُنکی تمنا نہیں کرتے

ہم میں رشک اتنا بڑھا ہوا ہے اور ایسے تنگی مزاج واقع ہوئے ہیں کہ مرتے جاتے ہیں مگر اُنکی تمنا نہیں کرتے۔ اس مضمون کو مصنف نے کئی جگہ مختلف صورتوں میں ادا کیا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
تکلف بر طرف نظارگی میں بھی سہی لیکن　　وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربط نہانی　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

چونکہ وہ غیر سے پردہ نہیں کرتے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں غیر سے در پردہ ربط ہے اور محض بے لاگی ظاہر کرنے کی وجہ سے یہ پردہ کرنا چھوڑ دیا گیا ہے اسیطرح ایک جگہ معشوق کی یہ ترکیب بتا چکے ہیں۔

۵ دوستی کا پردہ ہے بیگانگی　　منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

یہ باعث نومیدی ارباب ہوس ہے　　غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

جو لوگ کہ آپ سے کچھ ہوس اور کچھ تمنا رکھتے ہیں اونکے سامنے آپ غالب کو برا کہتے ہیں یہ آپ کچھ اچھا نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سن سن کر ناامید ہوئے جاتے ہیں کہ جیسے آپ انکو برا کہتے ہیں

ایسے ہی ہماری برائیاں ان کے سامنے لی جائینگی۔ یہی مضمون ہے۔

ع ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا — غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

بادہ تیرے لبوں سے رنگ فروغ حاصل کرتا ہے اور خطِ پیالہ نگاہِ گلچین ہے جو اس بہار رنگ کا لطف اٹھا رہی ہے۔

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے — کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

میرے دلِ شوریدہ کی کبھی تو داد دے اور کبھی تو اس پر رحم کر کہ ایک مدت سے ناطاقتی کی وجہ سے بالین پر پڑا رہتا ہے۔ اور اپنی حسرت شوریدگی۔ یعنی دیوانگی و بیاباں گردی کو دبا کر رکھتا ہے تو کم از کم کبھی تو ایسا کر کہ اسمیں یہ طاقت آ جائے کہ اپنی حسرتوں کو پورا کر سکے اور اپنی صفت شوریدگی سے متصف ہو سکے۔

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار — کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اگر بلبل زار کے نالے نہ سنے تو بجا ہے کہ پھول کے کان میں شبنم کی روئی بھری ہوئی ہے

اسدؔ ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا — مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

اے بے وفا اب اپنے شرم و حجاب، تمکنت و وقار کو چھوڑ اور چل کر اسد کو دیکھ لے کہ وہ نزع میں ہے اور اب کوئی دم میں دنیا کو خیرباد کہنے والا ہے۔ وہ سب کو چھوڑتا ہے تجھے ان سب تکلفات کو چھوڑ دینا موقع ہے۔

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو — یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

آخر معشوقوں کی آنکھ عاشقوں سے تغافل کیوں نہ کرے۔ یہ ایک بیمار ہے۔ اور بیمار کو نظارہ سے اسکو پرہیز ہے۔ چستی بندش کے علاوہ مضمون بھی بالکل نیا کہا ہے۔

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی   وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

ہم چاہتے تھے کہ مرتے وقت ہماری حسرت دیدار پوری ہو جاسے۔ مگر وائے ناکامی کہ یہ آرزو بھی پوری نہ ہوگی کیونکہ میرے قاتل کا خنجر ایسا تیز ہے کہ دم بھر میں میرا فیصلہ کر دے گا۔ اور میں نظر بھر کے اوسکو دیکھنے بھی نہ پاؤنگا۔

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ   جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

پھولوں کو دیکھکر اوسکا چہرہ مجھے یاد آتا ہے۔ فصل بہاری نے آکر میرا اشتیاق بڑھا دیا ہے اور زخم کو تازہ کر دیا ہے۔

لہ گلوں کو دیکھکر رخسار جاناں یاد آئینگے   ہرے ہو جائینگے داغ جگر تیرے سوا نہیں

دیا ہے دل اگر اُسکو بشر ہے کیا کہیے   ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

اگر میرے نامہ بر نے اُسکو دل دیدیا تو بشر کیا کہوں خیر وہ بلا سے میرا رقیب ہو گیا تو ہو جائے اوسکا نامہ بری کا احسان میری گردن پر ہے اُسے کیا کہوں دوسرے یہ کہ اُس سے خطا ہو گئی اور خطا خواص بشریت ہے۔ دوسرے یہ کہ بشر کی یہ مجال ہی نہیں ہے کہ اُسکو دل نہ دے۔

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے   قضا سے شکوہ ہمیں کسقدر ہے کیا کہیے

یوں تو موت ایک نہ اک دن ضرور آئیگی۔ مگر ہم چاہتے تھے کہ آج آئے۔ مگر اُسکو یہ ضد ہے کہ آج نہ آئیگی اسواسطے قضا سے ہمکو جو شکوہ ہے بیان نہیں کر سکتے۔ میرا شعر ہے۔

لہ یوں تو آئیگی اجل ایک نہ اک دن آسی   مگر آتی شب فرقت تو مرے کام آتی

رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب   اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

بسبب رقیب اسطرح وقت بیوقت تیرے پاس رہتا ہے کہ اب تیرے گھر کو بھی ہم دشمن کا گھر سمجھتے ہیں جولوگوں کا شعر جو دوسرے طریقہ سے ادا کیا گیا ہے یہ ہے۔

پر آپ کچھ اچھا بڑا رقیب کے در پہ ہزار بار   اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب ۔ کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

اوسکی کرشمہ سازیوں کی کیا تعریف کروں اور اُسکے فریبوں کو کیا ظاہر کروں کہ مجھے یہ دم دے رکھا ہے کہ تیرا حال بغیر کہے ہی ہم پر ظاہر ہے۔ اور اسوجہ سے میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔

میلی ؎ وارد خموش تا من حسرت کشیدہ را ۔ گوید شنیدہ آم سخن ناشنیدہ را

نظم صاحب لکھتے ہیں کہ پہلے مصرع میں ساتھ اوسکا کرشمہ و اشارہ ایسا ہے کہ میں دھوکے میں آگیا ہوں اور دھوکے کا بیان دوسرے مصرع میں ہے۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال ۔ کہ یوں کہے کہ سر رہگذر ہے کیا کہیے

وہ ایسا عیار ہے کہ جان بوجھکر بازار میں مجھسے میرا حال پوچھتا ہے۔ کیونکہ میں اپنی وضعداری کے سبب یہ کہدوں گا کہ اب سر بازار باتیں کرنے کا کیا موقع ہے۔ اس سے مرزا کی وضعداری کے ساتھ ساتھ ہی گذشتہ تہذیب کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ کہ پہلے شرفا بازار میں باتیں کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ ایسی ہی عیاری کا ایک شعر مرزا نے اور بھی کہا ہے۔

؎ کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن ۔ جانوں کسی کا حال میں کیونکر کہے بغیر

تمہیں نہیں ہے سر رشتہ وفا کا خیال ۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

اس شعر کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ مٹھی میں کوئی چیز لیے ہے اور عاشق معشوق سے پوچھتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے اور وہ نہیں بتا سکتا۔ اور عاشق یہ بھی کہتا ہے کہ سر رشتہ وفا کا تمکو کیا خیال ہوگا۔ مگر معشوق اسے رشتہ وفا سمجھتا نہیں ہے کہ وہ بتائے۔ پس سر رشتہ وفا کا خیال کرتا اور نہیں سمجھتا کہ سر رشتہ وفا کیا بلا ہے۔ مولانا نظم و حسرت دونوں کی شرحوں میں یہی معنے لکھے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ایک تاویل ہے جو طبع سلیم پر گراں گذرتی ہے صاف صاف معنے یہ ہیں۔ کہ تم وہ تغافل شعار و جفا کار ہو کہ تمہیں سر رشتہ وفا کا ذرا بھی خیال نہیں رہا تم اسکو چھوڑ چکے البتہ یہ سر رشتہ ہمارے ہاتھ میں ابھی کچھ کچھ باقی ہے اگر کچھ ہے مگر ہے ضرور اب تم سے کیا کہیں۔

انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیا لڑیے ۔ ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے

انہیں ہمارے سوال پر ہمارے جنون کا خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دیوانہ ہو گئے ہیں اور ہمیں جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ یا یہ کہ ہم جو سوال کرتے ہیں تو وہ ہم کو مجنون ٹھہراتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے جواب کی امید ترک کر دی ہے۔ لہٰذا اب اسے کیا کہئے۔ بقول جناب مولانا سید ابوالحسن صاحب صفا ناتق اللہ

۵ ملتا ہے جواب اب تو نہ ہاں کا نہ نہیں کا ‏ ‏ ہر بات پہ کہتے ہیں وہ دیوانہ کہیں کا

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے ‏ ‏ ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کیجے

کمال سخن کی سزا حسد ہے اور متاع ہنر کی قیمت ستم آسمان ہے لہٰذا کیا کہئے زمانہ کا دستور ہی یہ ہے۔ ایک ہمارے ہی ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہوتا۔ عرفی کا شعر ہے۔

از من بگیر عبرت وکسب ہنر مکن ‏ ‏ با بخت خود عداوت ہفت آسماں مخواہ

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن ‏ ‏ سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

یہ کون کہتا ہے کہ غالب برا نہیں ہے۔ نہیں برا ہے اور ضرور برا ہے مگر بس اتنا ہی برا ہے کہ غریب دیوانہ ہے۔ اور دیوانہ کو کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ سوا عربی کا لفظ ہے زیادہ کے معنے میں مگر سوا اسکے علاوہ کے معانی میں مقدر کر لیا گیا ہے۔ اور فارسی میں بھی لیا ہی مستعمل ہے۔

دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے ‏ ‏ کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

دامن افشاندن کے لغوی معنے تو تعلقات دنیا سے آزاد ہونے کے ہیں مگر مصنف مرحوم نے لغت کے معنے لیکر لفظی مناسبت سے بھی فائدہ اٹھایا ہے کہتے ہیں کہ میں بالکل آزاد ہونا چاہتا تھا اور اسی لئے میں نے دامن افشانی کی تھی۔ مگر دامن افشانی نے مجھے لوگوں کی نظر میں مقید جسم ثابت کر دیا یعنی جب دامن افشانی کی تو دامن کا وجود خارج میں پایا گیا اور دامن جزو لباس ہے اور لباس کے لئے جسم کی ہستی ضروری ہے تو گویا میرے لباس نے ظاہر سے دامن افشانی کی مگر لوگوں کی نظر میں میرا جسم ثابت رہا اور اسکی ہستی جس کو میں مٹانا چاہتا تھا برقرار رہی اسکا نتیجہ یہ نکلا میں کامل آزاد نہ ہو سکا اور مقید جسم ٹھہرا اور یہ سبب میری عریانی یعنی بے تعلقی کا ستم ہے جسکے ہاتھوں میں [illegible] اس طرح گویا داغ۔

۵ بعد مردن بھی [illegible] ‏ ‏ دیکھ کے ہم آنکھ چرا لیتے تھے مقابل ہو کر

بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں — مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

سنگ فساں وہ پتھر جس پر سان رکھی جاتی ہے اوسکو یہاں مصنف نے مراد لیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں اپنی سخت جانی کے سبب سے تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں بن گیا ہوں۔ یعنی رات دن وہ تلوار میری گردن پر رگڑی جاتی ہے مگر پھر بھی موت نہیں آتی۔ سبحان اللہ میری گرانجانی کسقدر میرے لئے مبارک ثابت ہوئی ہے۔ دوسرا مصرعہ یا بطور طنز کے کہا ہے۔ یا واقعتاً مصنف نے اپنی گرانجانی کو اپنے حق میں فال نیک خیال کیا ہے کہ تیغ یار سے، کچھ نہ کچھ تعلق تو ہے۔

کیوں نہو بے التفاتی اوسکی خاطر جمع ہے — جانتا ہے محو پرسشہائے پنہانی مجھے

پرسش پنہاں سے مراد خواب میں آکر حال پوچھنا۔ یا خیال میں تسکین دینا۔ کہتا ہے اسکو میرے حال سے بے توجہی کیوں نہو۔ اور مجھ سے بے التفاتی کیوں نہ کرے اوسکو اطمینان ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہم جو پوشیدہ طریقہ سے اوسکے حال کی پرسش کرتے رہتے ہیں وہ اسی میں محو اور خوش ہے پھر ظاہرا توجہ کرنیکی کیا ضرورت ہے فارسی میں اس مضمون کو یوں کہا ہے غالب۔

ع با ہمہ خرسندی از روی شکوہ ہا دارم ہمی — تا نداند صید پرسشہائے پنہانی مرا
ع تکلف بر طرف لب تشنہ بوس و کنار ستم — از آن ہم بار چیدن دارم نوازشہائے پنہان را

تیرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھدیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

جب کاتب تقدیر نے میرے غم خانے کی قسمت لکھی تو منجملہ اسباب ویرانی کے ایک مجھکو بھی سبب ویرانی قرار دیا یعنی اپنے گھر کو اپنے ہاتھ سے خود برباد کروں گا۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہوتا کاشکے — اسقدر ذوق نوائے مرغ بستانی مجھے

میں چونکہ مرغ بستانی کی آواز سننے کا شائق ہوں کیونکہ وہ میرا حریف اور ہم پیشہ ہے جیسے کہ حافظ کہتے ہیں ع

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست — کہ ہر دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

تو وہ کافر سمجھتا ہے کہ یہ دوسری چیزوں کا بھی شوق اور عشق رکھتا ہے لہذا مجھ سے بدگمان ہوتا ہے

بلکہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ مجھے تو اسے مرغ بے تابی کا شوق ہوتا

س‍ کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا لیگیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

میں اس لئے گور میں گیا تھا کہ غم و افکار سے نجات پاؤں مگر افسوس کہ وہاں بھی شور محشر نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میرا ذوق تن آسانی پورا نہ ہونے دیا۔ اور آرام نہ کر سکا۔

س‍ یاں فکر معیشت ہے وہاں وعدۂ محشر آسودگی حسرت یہاں ہے نہ وہاں ہے

وعدہ آنے کا وفا کیجیے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

آپ نے میرے گھر آنیکا وعدہ کیا تھا اسیوقت سے انتظار میں دروازہ پر کھڑا ہوا ہوں اور گویا اپنی دربانی آپ کر رہا ہوں۔ یہ کیا انداز ہے کہ آپ نے مجھے میرے گھر کا دربان بنادیا ہے ذرا جلد وعدہ پورا کیجیے۔ اور تشریف لائیے۔

ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ واہ پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

اے آمد فصل بہار کی خوشی تیرا کیا کہنا۔ میں سودائے غزلخوانی دماغ سے نکال بیٹھا تھا مگر تیرے آنے سے پھر تازہ ہوگیا ہے۔

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے

خدا نے میرے بھائی مرزا یوسف کو نئے سر سے زندگی دی یعنی بچادیا۔ مرزا یوسف میرے لئے یوسف ثانی ہے گویا دوسرا یوسف ملا۔ یعنی یا تو وہ میری نظر میں ایسا ہی حسین و جمیل ہے جیسے حضرت یوسف دنیا کی نظر میں تھے۔ یا یہ کہ میرا بھائی اتنا بیمار ہوگیا تھا کہ بچنے کی ہرگز توقع نہ رہی تھی۔ گویا یہ یوسف وہ نہیں ہے دوسرا یوسف ہے۔

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

عالم خوشی میں بھی میں باربار یارب یارب پکار اٹھتا ہوں گویا میرا ہنسنا میرے لئے

تسبیح زاہد کا کام دے رہا ہے۔ کہ ہنستا ہوں اور یارب کہتا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ شادی ہو یا غم ہر حالت میں دل میں ایک کیفیت سی پیدا ہوتی ہے اور آدمی کی زبان سے بیساختہ۔ یا اللہ۔ یارب وغیرہ ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں اوسی سے مصنف کی یہاں مراد ہے۔ خندہ زیر لب سے مراد وہ خندہ ہے کہ از دیاد غم میں انسان مسکراتا ہے۔ اور سانس لیکر ایسے الفاظ کہہ اٹھتا ہے ارے مرے اللہ ارے میرے مالک۔ اسیکو مصنف مراد لیتا ہے اور کہتا ہے کہ بظاہر خوشی کی صورت ہے لیکن یہ ہنسی تسبیح زاہد ہے جس سے مجھکو بس خدا ہی یاد آرہا ہے۔ فارسی میں اسی خیال کی دوسرے الفاظ پر بنا رکھی ہے شعر

مبادا ہیچ یار از ہیچ از ہم گسلد غالب — نفس با این ضعیفی بر نتابد شور یارب را

مولانا نظم لکھتے ہیں کہ یارب کے معنے فارسی محاورہ میں خدا کی دہائی ہے اور تسبیح زاہد سے وہ ذکر خفی مراد ہے جو چپکے چپکے ہونٹوں میں کرتے ہیں کہتے ہیں کہ شادی میں کبھی مجھے شور یارب نہیں بھولا ہے میرا خندہ زیر لب گویا زاہد کا ذکر خفی ہے۔

ہے کشاد خاطر وابستہ در رہن سخن — تھا طلسم قفل ابجد خانہ مکتب مجھے

واضح ہو کہ مکتب سے یہاں لغوی معنے مراد لئے ہیں یعنی جسجگہ بیٹھکر لکھیں۔ کہتا ہے کہ میرے دل کی کشایش اور خوشی گویا رہن سخن تھی۔ یعنی میری خوشی دل فکر شعر پر منحصر ہے خانہ مکتب یعنی جہاں میں بیٹھکر لکھتا ہوں طلسم قفل ابجد کا اثر رکھتا ہے۔ کہ جیسے اودھر اسکے حروف معینہ کو سمجھا گیا اور ادھر وہ کھلا ایسے ہی اودھر میں اپنے لکھنے کی جگہ پر پہونچا اودھر میری طبیعت کو کشادگی حاصل ہوئی اور شعر کہنے شروع کئے۔

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے — رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

اے خدا اس پریشانی کی مجھے کون داد دے کہ قیدیوں کی آسایش پر اب مجھکو رشک آتا ہے یعنی اتنا پریشان ہوں کہ اون کو خود سے اچھا سمجھتا ہوں۔

طبع ہے مشتاق لذتہائے حسرت کیا کروں — آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

میری طبیعت لذت حسرت کی مشتاق رہتی ہے اور آرزو سے میں شکست امید و آرزو لیتا ہوں

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے   عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

جناب مرزا صاحب دل لگا کر آپکی بھی میری جیسی حالت ہو گئی آپ تو ہمکو عشق سے منع کیا کرتے تھے آپ تو ہمارے بھائی بن گئے۔ صاحب بکسر حا، جملہ صحیح ہو مگر اردو فارسی میں چونکہ بفتح حا مستعمل ہے اسوجہ سے مطلب کے ساتھ اسکا قافیہ کرنا صحیح ہے۔

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے   چمن میں خوشنوایان چمن کی آزمائش ہے

آج دربار میں شعراء کی آزمائش ہے۔ دربار شاہی ایک چمن ہے اور شعراء خوشنوایان چمن ہیں۔ یہ بھی درباری مشاعروں میں سے کسی مشاعرہ کی غزل ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے   جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

قیس اور فرہاد کے لئے تو معیار آزمائش لیلی اور شیرین کا قد اور گیسو ہے یعنی محض وہی دکھا کر انکی آزمائش کیجاتی ہے۔ اور بتلائے بلا کیا جاتا ہے یا دیکھا جاتا ہے کہ یہ ان دونوں چیزوں یعنی قد و گیسو سے کسقدر محبت کرتے ہیں۔ مگر افسوس میرا ظالم و سفاک معشوق یہ کچھ نہیں کرتا اور وہ دار و رسن دکھا کر امتحان لیتا ہے۔ یا اس بلا سے مبتلا کرتا ہے۔

کرینگے کوہکن کے حوصلہ کا امتحاں آخر   ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

یعنی یہ نہ سمجھیے کہ جو ئے شیر لانے کا حکم دینے سے کوہکن عشق کے امتحاں میں پاس ہو گئے نہیں ابھی تو اس حکم سے مراد یہ ہے کہ اوسکی قوت بازو کا امتحاں کریں۔ ابھی اُسکے حوصلۂ دل اور عشق کے امتحاں کا وقت نہیں آیا۔ وہ بھی آئیگا یعنی جب پیرزن خبر بد لیجا کر اوسکو سنائیگی اور وہ مرجائے گا۔ وہ امتحان عشق ہے۔ اور اس صورت سے گویا وہ اسمیں ناکامیاب رہیگا۔ کہ پہلے ہی سوال میں تیشہ کھا کر مرجائے گا۔

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی   اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

نسیم مصر جو مصر سے خوشبوئے پیراہن یوسف لیکر آئی ہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ

یعقوب علیہ السلام کی خیر خواہی کر رہی ہے - یہ سب غلط ہے وہ محض یوسف علیہ السلام کے پیراہن کی بُو کا امتحان کرتی ہے کہ دیکھیں اسمیں کیا تاثیر یا کسقدر قوت ہے -

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے — شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

دیکھو ہم بتائے دیتے ہیں کہ غارتگر صبر و قرار وہ آیا - اپنے اپنے دل اپنے اپنے ہوش و حواس سے ہشیار ہو جاؤ - پھر یہ شکایت نہ کرنا کہ ہم غافل تھے اس لئے وہ لوٹ لے گیا۔ خوب شعر کہا ہے -

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر — غرض شست بت ناوک فگن کی آزمائش ہے

اگر تیر دل میں رہجائے تو اچھا اور جگر کو توڑتا ہوا پار نکل جائے تو اچھا - ہمارا مطلب تو یہ ہے کہ ہم ناوک فگن کی شست کا امتحان کریں کہ وہ کیونکر نشانہ اُڑاتا ہے -

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

کچھ نہ تسبیح شیخ میں رکھا ہے نہ زنار برہمن میں - بلکہ یہ بھی ایک آزمائش وفاداری کا ڈھنگ ہے اُسکی تسبیح کے اور اسکی زنار کے ذریعہ سے وفاداری دیکھی جا رہی ہے -

پڑا رہ اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل — مگر پھر تاب زلف پرشکن کی آزمائش ہے

اے دل مبتلا تو کتنی مرتبہ تجربہ امتحان کر چکا ہے کہ زلف کے پھندے سے نکلنا سخت دشوار ہے مگر پھر بھی تڑپ رہا ہے یہ غیر ممکن ہے کہ تو اس دام سے نجات پا سکے دوبارہ امتحان بیکار ہے بہتر یہی ہے کہ خاموش پڑا رہ -

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو — ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

ابھی تو زہر غم سے کام و دہن تک ہی پہونچا ہے ابھی کیا ہے دیکھئے جب یہ زہر رگ رگ میں سرایت کریگا تو کیا ہوگا -

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

وہ آئینگے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب — نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

یعنی اے غالب تم کہتے ہو کہ وہ میرے گھر آئینگے وعدہ کر لیا ہے یہ سب تمہارا خیال خام ہے وہ کیا آئینگے بلکہ یوں سمجھو کہ آسمان کو نیا فتنہ اٹھانا منظور ہے نیا فتنہ سوجھا ہے کیا ہے کہ اول تو وہ وعدہ ہی نہ کرتے تھے۔ اب وعدہ کیا تو وعدہ خلافی کا صدمہ میرے لئے نیا ہے۔ دیکھئے کیا ہوگا۔

کبھی نیکی بھی اُسکے دل میں گر آجائے ہے مجھ سے — جفائیں اپنی کر کے یاد شرما جائے ہے مجھ سے

اول تو اسکے دل میں نیکی ہی نہیں آتی کہ مجھپر مہربان ہو اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ اپنے ظلم و ستم سے شرما کر رہجاتا ہے اور ندامت کی وجہ سے میرے پاس نہیں آسکتا ایک جگہ یہی مضمون لکھ چکے ہیں۔

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجھکو منہ دکھلائیں کیا

دلستانان بحل ندارد چہ جفا نیز کنند — ار دفاسے کہ نکردند حیا نیز کنند

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے — کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

یا الٰہی کیا میرے جذبۂ دل کی تاثیر الٹی ہے کہ جسقدر میں اسکو کھینچتا ہوں وہ مجھ سے کھنچتا ہے یعنی میں وصل چاہتا ہوں اور جدائی ہوتی جاتی ہے۔

وہ بدخو اور میری داستان عشق طولانی — عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

میرا قاصد بھی مجھسے گھبرا جاتا ہے کیونکہ وہ یعنی میرا معشوق ٹھیرا بدخو۔ اور میرا قصۂ غم ٹھیرا طولانی تو قاصد کہتا ہے کہ کہیں میرے شامت نہ آجائے وہ تیری داستان سنینگے کب اور مجھ پر بھی خفا ہونگے۔ اور اس صورت سے گویا میرا پیغام یا میرا حال کسیطرح اُس تک نہیں پہنچ سکتا

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے — نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

وہ بدگمان ہے کہ میرے عشق و محبت کے دعوے کو غلط جانتا ہے۔ یہ خیال کرتا ہے کہ میں اُس سے کچھ بات کروں گا تو دنیا والے خدا جانے کیا اپنے دلمیں سمجھیں گے اس سے وہ تو میرا حال پوچھ نہیں سکتا میں ناتوان ہوں اسوجہ سے بغیر پوچھے اپنا حال سُنا نہیں سکتا۔ شعر میں تقابل

کی وجہ سے ایک عجیب حسن پیدا ہو گیا ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں۔

ع شفقت و ناتوانی حسنست و سرگرانی ۔۔۔ جور و جفا تماشا ہم ہمہ و وفا ندارد

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے ۔۔۔ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اے ناامیدی مجھے ایسا نحیف و کمزور نہ کر کہ یار کا دامن خیال میرے ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ یعنی اتنا ستم نہ کر کہ اوس کا خیال دل سے نکل جائے۔

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن ۔۔۔ وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

اوسکا دیکھنے والا میں خود ہی کیوں نہوں مگر مجھے اس سے بھی رشک آتا ہے اور میرا دل نہیں چاہتا یعنی رشک مجھے اجازت نہیں دیتا کہ اسے کوئی دیکھے۔ یہی مضمون کہیں جگہ گذر چکا ہے مثلاً

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ۔۔۔ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ع میروم زیں کوئے دلدار از رشک محبت میروم ۔۔۔ بسکہ با من آشنا گشتی ز غیرت میروم

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی ۔۔۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

پہلے عشق کی لڑائی میں میرے پاؤں ہی زخمی ہوئے ہیں۔ لہذا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا حساب ہو رہا ہے ع نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب ۔۔۔ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

غالب کیا قیامت ہے کہ جس کافر کو رشک کے مارے خدا کو بھی نہیں سونپ سکتا۔ یعنی رسم کی موافق خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ میرے دشمن کا ہمسفر ہوتا ہے۔ غالب مرحوم تو اس شعر کو نہایت بے تکلفی سے کہہ گئے ہیں مگر عارف نے نہایت سنبھالکر یہ مضمون لکھا ہے

ع نہ خداوند کو گر پاک و منزہ سمجھوں ۔۔۔ کب گوارا ہو مجھے تجھ پہ نگہباں کرنا۔

زبسکہ شوقِ تماشا جنوں علامت ہے ۔۔۔ کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

چونکہ ہر وقت مصروف تماشا رہنا علامت جنون ہے تو اس وجہ سے ہر وقت پلکوں کا کھلنا اور بند ہونا منتظر ہیں کہ آنکھ کو نیر لگائے جا رہے ہیں۔ بیدل نے یہ مضمون یوں لکھا ہے۔

س
دیدہ را کہ بنظارۂ دل محرم نیست — مژہ برہم زدن از دست ندامت کم نیست

یعنی جو آنکھیں کہ اپنے دل کے سوائے کسی دوسری شے کے نظارہ میں مصروف ہیں۔ اور ان کے لیئے کشاد و بست مژہ گویا نسیلی ندامت ہے۔ مرزا غالب مرحوم نے ضرور اسی شعر کا یہ ترجمہ کیا ہے مگر جو کچھ بیدل نے کہا ہے وہ مرزا غالب نہیں کہہ سکے۔ بیدل نے ایک جگہ اور یہ مضمون لکھا ہے اور وہ اس سے بھی بہتر ہے۔

س
ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ — تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعن بد عہدی — تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

نہیں معلوم تیرا بد عہدی کا داغ کس طرح اور کس پانی سے مٹے گا۔ آئینہ دیکھنا تیرے لئے ورطۂ ندامت ہے کیونکہ اس سے آرائش مقصود ہے اور ایسی سخت بد عہدی کے بعد جس نے مجھے مٹا دیا اور تیرے دامن پر داغ بدنامی لگا دیا آئینہ دیکھنا اور پھر آرائش کرنا ورطۂ ملامت ہونا چاہیئے اور اسمیں ڈوب جانا چاہیئے یعنی بد عہدی کر کے مجھکو مٹانے کے بعد تجھے آرائش ترک کر دینی چاہیئے۔ اس شعر کو بھی نظم صاحب نے قریب قریب یہی معنی بتایا ہے۔

بہ پیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ — نگاہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

ہوس کا بل اور پیچ تاب دے دے کر رشتۂ عافیت کو نہ توڑ۔ بس عاجز بنا ہوا نگاہ عجز سے دنیا کا نظارہ کرتا رہ۔ یہ تار نگاہ عجز رشتۂ سلامتی ہے۔

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد — جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

معشوق وفا کے لئے تیار ہے مگر دعوائے عشق رقیب بے بنیاد ہے۔ فصل گل موجود ہے مگر جنون جھوٹا ہے۔

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے — میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

میں تیرے عشق میں اتنا دُبلا ہو گیا ہوں کہ اگر تو مجھے اپنی بزم میں بلائے تو مجھے کوئی دیکھ
نہ سکے گا یا دیکھکر کوئی پہچان نہ سکیگا۔

کیا تعجب ہے کہ اُسکو دیکھکر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلہ سے پہونچا دے مجھے

فصاحت کے یہ معنے ہیں کہ مختصر الفاظ میں مطالب کثیر ادا کئے جائیں جیسے کہ اس شعر میں
جسکے یہ معنے ہیں کہ کہنے والا اپنے ذہن میں یہ سمجھ چکا ہے کہ وہ مجھ پر کبھی رحم نہ کرے گا۔ اور یہ
اسوجہ سے کہ اُسکو معشوق کی بزم میں جانے کا موقع ہی نہیں مل سکتا ہے وہ اسی رنج میں نہایت
دُبلا اور نحیف و زار ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کا نہایت حال تباہ ہو گیا ہے تو وہ خیال
کرتا ہے اور درد دل سے تنگ ہو کر پکار اُٹھتا ہے کہ کیا تعجب ہے وہ میرا حال دیکھکر مجھ پر رحم
کرے کوئی کسی طرح سے اُسکے پاس مجھ کو پہونچا دے۔

منھ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بانداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

اے ظالم بیرحم سفاک اگر تجھے یہ منظور نہیں ہے
میں میں بھی خوش ہوں مُنھ نہ دکھا۔ مگر کبھی غصہ سے اپنا مُنھ مجھے دکھائے تو خیر تیری خوشی
از چشم نمائی تو کر۔

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بنجاؤں تو شانہ میں الجھا دے مجھے

میری گرفتاری اور میرے آزار دینے سے وہ۔ اتنا خوش ہے کہ اگر میں زلف بنکر اسکی شان معشوقی
بڑھاؤں تو وہ مجھے آزار دینے کے لئے شانہ میں اُلجھا دے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

دنیا میری نظر میں ایک بچوں کا کھیل ہے اور میں اسکو تماشہ سمجھتا ہوں۔

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

تخت سلیمان کی میرے نزدیک کھیل سے زیادہ
میں ایک بات سمجھتا ہوں اک بات ہے محاورہ ہے ناچیز سمجھا قیمت نہیں ہے اور اعجاز مسیحا یعنی قم کو

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

عالم ہستی کی میرے سامنے کوئی ہستی نہیں ہے بس میں اسکو ایک نام سمجھا ہوا ہوں ۔ اور ہستی اشیا کو ایک وہم جانتا ہوں ۔ وہ ہی نام وہ ہی جسکا وجود کچھ بھی نہو ۔

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے ۱)

میں اپنے جنوں کے عالم میں اسقدر خاک اڑاتا ہوں کہ صحرا گرد میں چھپ جاتا ہے اور دریا از راہ عجز یا بوجہ تاثیر درد کے میرے سامنے خاک پر رو پیا ماتھا رگڑتا ہے یا یہ کہ میری اشکباری دیکھکر وہ عاجز ہو جاتا ہے ۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

یہ کیا پوچھتا ہے کہ میرا تیرے پیچھے کیا حال رہتا ہے بس بعینہ یہی کیفیت ہوتی ہے جیسی کہ تیری حالت میرے سامنے ہوتی ہے کہ بیقرار اور شرمایا ہوا رنجیدہ سا بیٹھا رہتا ہے ایسا ہی میں بھی رہتا ہوں یا یہ کہ تو اپنے حسن کو میرے سامنے ذرا دیکھ کہ تو کتنا حسین ہے اور پھر خیال کر کہ تیرے پیچھے میرا کیا حال ہونا چاہیئے ۔ گویا ع

فراق زدئے تو در زندگی چہ حسرت است ایں — تو خود در آئینہ بنگر کہ چیست حال مرا

سچ کہتے ہو خود بیں و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

یہ بالکل سچ ہے کہ میں خود بیں اور خود آرا ہوں مگر ایسا نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے جب تجھسا حسین آئینہ سیما میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے تو میں جو کچھ ہوں سب صحیح ہے ۔

پھر دیکھیئے انداز گل افشانی گفتار — رکھدے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

کوئی ایک شراب ناب کا چھلکتا ہوا ساغر میرے سامنے رکھدے اور پھر میری گل افشانی دیکھے ۔

عرفی بیار بادہ کہ جانم دمی ز نالہ بر آید — ہزار زمزمہ از دل بیک ترانہ بر آید

ار گذرے اور میری شاہ

نفرت کا گماں گذرے ہے میں رشک سے گذرا
کیونکر کہوں لو نام نہ انکا مرے آگے

ناصح میرے سامنے آپ کا نام میرے سامنے لے مگر جو یہ کہتا اور اسی لیئے وہ میرے دلمیں
لوگ سمجھیں گے مجھے اون کے نام سے نفرت ہے حالانکہ وہ محبوب ہے۔
کا لوگوں کو خیال پیدا ہو کہ جو ایک احبت یکاں
دیکھئے حکیم مومن خاں صاحب نے مجھ کو تسلی نہیں ہوتی اور
یہاں بندش اتنی چست ہو گئی ہے کہ مجھے تفریح ہوتی ہے وہ
نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتے ٹکڑے کر دو

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

دل بکتا ہیں عجیب کشمکش میں پڑا ہوا ہوں کہ
ادھر کلیسا ہے بمثل شعر کہا ہے۔ اور خصوصاً یہ
کہ اگر دیوان کے دیوان اس پر سے صدقہ کر دیئے جائیں تو دشمنی نہ

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ہوں تو میں عاشق مگر ایسا چالاک عاشق ہوں ایسا ہی ہے جزا
سامنے مجنوں کو برا کہتی ہے اور میری تعریف لیے۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

موسوم ہے
ریف لکھی ہے
میں شب ہجر میں یہ دعا مانگتا تھا کہ یا اللہ
ناکام مرنا تو برا ہے لہذا آج شب وصل وہ میرا جو درد
ہو گئی۔ ورنہ وصل میں خوشی ہوا کرتی ہے یوں مرتے
جیسا کہ سعدی نے ایک حکایت میں کہا ہے۔
سہ یکے تشنہ مے گفت وجاں مے سپرد

مکمل شرح دیوان غالب

ملک سے اتنا بھی نہیں چاہتا کہ کوئی بتا
سامنے نہ لو تو یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ
ویں ایسے رشک سے باز آیا۔ جسمیں اپنی
کے باعث تنگ ہے۔ مجبوراً سنتا ہوں
ہے مگر انصاف یہ ہے کہ مومن خاں کے
بڑھا ہوا ہے سہ
ل بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

رکتا ہے اور کفر کھینچتا ہے ادھر کعبہ ہے
سر کے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔ ایسا ہے
بچا ہے۔

شوقوں کو بھی فریب دیتا ہوں لیلے میرے

ں تو وصل کی شب میں مر رہا ہجر میں
مرے سامنے آگیا۔ اور شادی مرگ
ں جایا کرتے۔ یہ وہی مضمون ہے

خنک
سا نیک بخشے کہ در آب مرد

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو — جز وہم بھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

میرے دل میں ایک قلزم خوں جوش مستی نہیں ہے بس میں یہی ہو کہ ایک خون کا دریا بہا کر مجھے نجات مل جائے مگر ایسا نہیں ہے خدا جانے کہ وہ ہے جسکا وجود کچھ بھی طوفان دیکھنے نصیب ہوں گے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — گھستا ہے جبھی ساغر و مینا مرے آگے

اگرچہ ضعف کے ہاتھوں ہاتھ ہلانا خاک اڑاتا ہوں کہ جب اب پی نہیں سکتا ہوں پھر بھی آنکھوں میں ابھی دم باقی ہے کہ اسکو ہے سامنے خاک پر دینا لہذا ابھی ساغر و مینا کو میرے سامنے رکھا رہنے دو کہ اسکے دیکھنے سے دل کو غالب نے اس غزل میں یہ شعر سب شعروں سے اچھا کہا ہے۔

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا — غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

چونکہ وہ میرا ہم پیشہ اور ہم مشرب ہے بیقرار اور رہتا اوسکو برا کہتے ہیں تو گویا مجھے برا کہتے ہیں اسیطرح مجھے آپ برا سمجھے ہوں گے سامنے د

غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

یہ باعث نومیدی ارباب ہوس ہے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے — تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

میں اپنا حال سنانے اور دکھڑا کے لیے سامنے بیٹھتا ہوں تو بغیر سنے ہی آپ فرما دیتے ہیں کہ مطلب کہیے مطلب۔ حالانکہ خود آرا ہوئے مطلب سے بھی خوب واقف ہو پھر بھلا اسی حالت میں آپ سے کچھ کہنے کی کیا جرأت۔ بیٹھا ہوا تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے۔

نہیں ہے طاقت گفتار اور اگر ہو بھی

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں — مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

ذرا لپرواہ کرم غصہ میں طعن اور ناز کی راہ سے یہ نہ فرمایا کیجیے کہ ہم ظالم ہیں مجھے آپ کی ہر ایک جا و بیجا بات پر (بجا اور درست) کہنے کی عادت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسپر بھی ہاں بجا

کہ بیٹھوں اور آپ کو پھر اور ناگوار گذرے اور میری شامت آجائے۔

وہ نیشتر سہی پر دلمیں جب اُتر جائے — نگاہ یار کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

مانا کہ نگاہ یار نشتر ہے۔ اور اسی لیئے وہ میرے دلمیں اُتر گئی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ جو چیز دل میں سما جائے اور اُتر جائے تو وہ محبوب ہے۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں — وہ زخم تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہیے

پیکاں کے زخم سے دل کو کچھ تسلی نہیں ہوتی اور وہ خوش نہیں ہوتا بلکہ جس زخم سے میرے دلکشائی ہوتی ہے اور جس سے مجھے تفریح ہوتی ہے وہ زخم تیغ ہے۔ لفظ دلکشا میں ایہام ہے۔ یہ کہ زخم تیغ دلکشا ہوتا ہے کہ دلکے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے راحت اور جراحت میں تجنیس ہے۔

ہر دل کہ نہ زخمے خورد از تیغ تو وا نیست

سہ حسرت گردم بزن تیغ و در بر رو دل بکشا — دلم تنگست کار از زخم پیکاں برنمی آید

جو مدعی بنے اوسکے نہ مدعی بنیے — جو ناسزا کہے اوسکو نہ ناسزا کہیے

جو کوئی دشمن ہو جائے اوس سے دشمنی نہ کیجیئے جو بُرا کہے اوسے بُرا نہ کہیے۔ سعدی فرماتے ہیں۔

سہ بدی را بدی سہل باشد جزا — اگر مردی احسن الی من اسا

(مدعی بنیے) کا ٹکڑا بُرا ہے۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے جلال مرحوم کا یہ مصرعہ۔ کہ سب ترے ناز ہیں گو زندہ ہی کرنے والے۔

یہ عیب شاعری تنافر کے نام سے موسوم ہے اسکا امتیاز محض مذاق سلیم و صحیح پر مبنی ہے گو اہل بلاغت نے تنافر کے یہی معنے اور تعریف لکھی ہے کہ ایسے الفاظ قریب المخرج جمع ہو جائیں جنکے ادا کرنے میں زبان کو تکلف کی ضرورت ہو۔ مگر نہیں یہ بھی ایک قسم کا تنافر ہے کہ ترکیب الفاظ سے کوئی ایسا لفظ بنجائے جسمیں رکاکت اور ذم کا پہلو نکلے۔ جیسے یہی (مدعی بنیے) یا جیسے منہ تمہارا ہی اور میری نظر۔ منہ تو دیکھو آئینہ کا یہ صفائی لا سکے۔ پہلے مصرعہ کے ٹکڑے سے منہ ہوت مارا۔ اور دوسرے سے موتو دیکھ پیدا ہوتا ہے۔ اوست و یا دینگے گواہی مری روز محشر

یا وینگے۔ غرض کہ ایسے کلمات سے جنمیں کوئی ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہوتا ہو احتراز واجب ہے۔

کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھئے　　کہیں مصیبت ناسازی دوا کہیے

ہماری حالت یہ ہے کہ کہیں جانکاہی مرض کی حقیقت لکھتے ہیں کہیں مصیبت ناسازی دوا بیان کرتے ہیں۔

کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجئے　　کہیں حکایت صبر گریز پا کہیے

کہیں اپنے ہمنشیں غم والم کا دکھڑا روئیں اور کہیں صبر گریز پا کی حکایت بیان کریں۔

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے　　کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

اگر جان جاتی رہے تو اس کے صلہ میں قاتل کو دیت دیجئے۔ زبان کٹ جائے تو خنجر کو تحسین و آفریں کہیے۔

نہیں نگار کو الفت نہو نگار تو ہے　　روانی روش و مستی ادا کہیے

اگر معشوق مجھ سے محبت نہیں کرتا تو کیا اس سے اسکی شان معشوقی میں کوئی فرق آیا جاتا ہے اسکا ہمکو ضرور اعتراف کرنا چاہیئے اوس کی رفتار کی روانی اور اسکی مست اداؤں کا ذکر کریں۔

نہیں بہار کو فرصت نہو بہار تو ہے　　طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے

معشوق مثل ایک بہار کے ہے جسکو قیام نہیں مگر کیا اس بے ثباتی سے طراوت چمن اور خوبی ہوا پر کوئی حرف آسکتا ہو۔ بس بالکل یہی معشوق کی حالت ہے۔ مصنف نے یہ پانچ شعر ایک قطعہ کی صورت میں کہے ہیں جس کا ماحصل یہ ہو کہ ہماری قسمت میں یہی ہے کہ ہم مصیبت میں مبتلا رہیں جیسا کہ پہلے تین شعروں سے ظاہر ہے اور اس بلا میں مبتلا رہکر معشوق کو مورد الزام نہ ٹھرائیں وہ پھر معشوق ہے ہمپر آفت آجائے یا اسکی ہمارے ساتھ بیوفائی سے اسپر کچھ حرف نہیں آسکتا۔

سفینہ جبکہ کنارہ پہ آ لگا غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

یعنی میں کنارہ پر آکر لگ رہا ہوں اب خدا سے ناخدا کے ظلم کی کیا شکایت کروں۔ اوسنے کیا کیا یا یہ کہ اگرچہ ناخدا نے مجھ پر بیحد و حساب ظلم کئے مگر وہ وقت گذر گیا۔ اب کیا گذشتہ باتوں کو یاد کریں۔

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

جسقدر ہم عشق میں روئے رسوا ہوتے گئے اور بیباکیاں بڑھتی گئیں۔ گویا دھل دھلا کر پاک یعنی پکے رند ہو گئے اب ہمکو کسیکا خوف ہی باقی نہیں رہا۔

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی — تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

ہمارے دو حساب تھے۔ ایک تو شرابخواری کی فکر دوسرے آلاتِ میکشی سو آلاتِ میکشی یعنی ساغر وغیرہ کو بھی بیچ کر شراب پی گئے اور یہ دونوں حساب بھی یوں پاک ہو گئے اب کوئی جھگڑا نہیں رہا۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم — بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

خیر اگرچہ آوارگی سے ہم زمانہ بھر میں بدنام ہو گئے۔ مگر ذرا چونچال تو ہوئے عقل و حواس تو ٹھکانے لگے۔

سہ پڑا ہوں سنگِ راہ غیر ہو کر کوئے جاناں میں — سنا ہے آدمی کچھ ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا ہے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر — پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

یہ کون کہتا ہے کہ نالۂ بلبل بے اثر ہے۔ کیا دیکھتا نہیں ہے۔ اوسکی بستگی خاطر نے یہ اثر کیا ہے کہ گل کے لاکھ جگر شگفتگی کے پردہ میں چاک ہو گئے۔ گویا دل کھلے نہیں بلکہ فریادِ بلبل سے اون کا جگر چاک ہو گیا۔

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

اہل شوق کے وجود و عدم کا حال نہ پوچھو وہ اپنی آگ میں آپ جل گئے ہیں تو گویا نہ ان کا وجود ہے نہ عدم۔

کرنے گئے تھے اوس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اہل شوق کے وجود و عدم کا حال نہ پوچھو وہ اپنی آگ میں آپ جل گئے ہیں تو گویا نہ ان کا وجود مٹانے کے لیئے ہماری طرف نظر اٹھائی مگر دیکھنے کی ہم میں تاب نہ تھی جلکر خاک ہو گئے۔

سے ایدل ناعاقبت اندیش ضبط شوق کر کون لاسکتا ہے تاب جلوۂ دیدار دوست

اس رنگ سے اوٹھائی کل اسنے اسد کی نعش دشمن بھی جسکو دیکھ کے غمناک ہو گئے

یعنی کچھ ایسے رنج و غم سے اسنے لاش اٹھائی کہ دشمنوں کو رنج ہوا رشک سے یا اس برے طریقہ سے میری لاش اپنے کوچے سے اٹھوائی کہ دشمنوں کو بھی ترس آیا اور صدمہ ہوا۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

نشہ رنگ محفل سے خوش ہے اور ساز خوشی کے مارے مست طرب ہو رہے ہیں شیشہ مے سرو سبز جوئبار نغمہ بنا ہوا ہے۔ مصنف نے بہار کا سماں دکھایا ہے اگرچہ الفاظ سخت ضرور ہیں مگر خوب ہی لکھا ہے یعنی نغمہ ایک جوئبار ہے شیشہ مے سرو لب جو یہ حالت دیکھکر نشہ اور ساز دونوں خوش ہیں۔ یہی تشبیہ شیشۂ مے کی سرو کے ساتھ دوسری جگہ ہم لکھ آئے ہیں۔

ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست واں تو نالہ کو بھی میرے اعتبار نغمہ ہے

اے ہم نشیں یہ تیرا فکر فضول ہے کہ دوست کی بزم عیش کو رو کر خراب نہ کر وہاں تو میرا نالہ بھی نغمہ کا کام دیتا ہے۔ پھر اسکی محفل کو اس سے زینت ہو گی یا بزم خراب ہو گی۔

سے دور چشم بد تری بزم طرب سے واہ واہ نغمہ بنجاتا ہے گر نالہ بھی میرا جائے ہے

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے — دعوئِ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہنسنے کے وقت گویا دانت اپنی شوخی ناز کا اظہار کرتے ہیں یعنی انکی چمک دمک وغیرہ ہنسنے پر کھلتی ہے اور دانت چونکہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور قریب ہیں اسواسطے ان کو جمعیت احباب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور یہ گویا دوست ہیں۔ مگر اسی دعوی کو مصنف دلیل کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ کہ دنیا کے دوستوں کی جمعیت جائے خندہ ہے۔ یعنی دانت جمع ہیں اور اپنی شوخی ناز وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل — یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

یعنی غنچہ ہنوز عدم میں ہے ہستی میں نہیں ظاہر ہوا۔ مگر انجام گل کی عبرت پر محو ہو رہا ہے یکجہاں زانو تامل سے مراد ہے فکر بیحد یعنی وہ غنچہ سوچتا ہے کہ خندہ کے پیچھے بہت سا فکر پوشیدہ ہے یا یہ کہ غنچہ جب کھل گیا تو گویا وہ معدوم ہو گیا اور پھول موجود ہو گیا تو وہ غنچہ اب عدم میں پھول کی انجام پر فکرمند ہے اور یہ خیال اسکو کھلنے کے پیچھے پیدا ہوا ہے۔

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

ہماری افسردگی میں وہ کلفت ہے جسمیں بیتابی جو خود باعث تکلیف ہے وہ عیش معلوم ہوتی ہے۔ اور عیش و سرور کے لوازم سے ہنسی بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری افسردگی مجبور ہے کہ اسمیں بیتابی کی عیش حرام ہے ورنہ ہمارے انشراح خاطر یعنی دل کے خوش ہونے اور پھول کی طرح کھل جانے کے لئے سہل ترکیب موجود ہے کہ بیتاب ہو کر دل کو چبا ڈالیں اور اسمیں زخم ڈالدیں۔ کہ اس سے وہ ہنستا معلوم ہو فارسی میں یوں کہا ہے۔ میسر از عیش نو میدی کہ دنداں در دل افشردن۔ اساس محکمے باشد بہشت جاودانی را۔

یا یہ کہ ہم افسردگی سے مجبور ہیں جسکے مذہب میں عشق بیتابی حرام ہے ورنہ اپنے دل کو زخمی کرنا اور خون بہنا یہ تو عین خوشی کی جگہ ہے اور اس سے فخر کرنا چاہیئے۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں — دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

احباب سوزش باطن کو نہیں مانتے کیونکہ وہ اُس سے واقف نہیں ہیں ورنہ دراصل ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہمارے لبوں پر تبسم بھی ضرور ہے اور دل میں دریائے نالہ موجزن ہے۔

حُسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے — آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

حُسن ظاہرا بے پروا ہے مگر دراصل بے پروا نہیں ہے وہ بھی جلوہ کا خریدار اور خواہشمند ہے اور آئینہ اوسکے لئے زانوئے فکر بن گیا ہے کیونکہ اوسکو دیکھکر وہ اختراعِ جلوہ نو کی فکر میں محو و مصروف رہتا ہے۔ یہی مضمون ہے ؎

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حُسن — دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

تاکجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن — چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

اے آگاہی اور ہوشیاری یہ رنگ تماشا کرنے کا تو کب تک اختیار کئے رہیگی یوں سمجھ لے کہ تیری آنکھ جو اسکے دیکھنے کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ یہ وہ آغوش کشادہ ہے جو رخصت کے وقت کھولتے ہیں یعنی جلوۂ جہان فانی بر سرِ وداع ہے اور اسکے دیکھنے کے لئے آنکھ کھولنی آغوش وداع ہے مرزا عبد القادر بیدل کہتے ہیں کہ ؎

چشم واکردن کفیل فرصتِ نظارہ نیست — پرتو ایں شمع آغوشِ وداعِ محفل است

یعنی آنکھ کھلنا یا آنکھ کھولنا اس بات کا کفیل نہیں ہے کہ تو نظارہ کر سکے بلکہ اس شمع یعنی آنکھ کی روشنی آغوش کشادۂ وداعِ محفل ہے۔

مصنف نے بھی ایک جگہ نئی صورت سے ایسا ہی مضمون یوں ادا کیا ہے ؎

آغوشِ گل کشادہ برائے وداع ہے — اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

یعنی جبتک کوئی زخم پیدا نہ کرے یعنی تیری تیغ عشق یا تیغ ستم سے مجروح نہو اوسوقت تک تجھ سے باتیں کرنا دشوار ہے۔ گویا تجھ سے باتیں کرنے کے لئے دہانِ زخم کی ضرورت ہے

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر — کبتک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی

دنیا ایک وحشت کدہ ہے جہاں خاک اُڑ رہی ہے یعنی سر بسر پریشاں ہے اسے کوئی کب تک تجاہل سے زینت عالم سمجھا کرے۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ جیسے مجنوں کے وحشت میں اڑائے ہوئے غبار کو کوئی پریشانی کی وجہ سے طرۂ لیلا سے مشابہ کرے۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ دنیا میں غبار وحشت مجنوں اُڑ رہا ہے آخر اسے کوئی کبتک نہ دیکھے اور لیلے کا کوئی کہانتک خیال کیا کرے۔ یعنی بمقابلہ حسن لیلا کے عشق مجنوں زیادہ قابل دید ہے یا یہ کہ مجنوں کی اسدرجہ پریشانی اور وحشت پر نگاہ نہ ڈالنا۔ اور اس غبار سے آلودگی طرۂ لیلا کا لحاظ کرنا ظلم ہے۔

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات ہاں درد بن کے دلمیں مگر جا کرے کوئی

میرے دل میں درد نے اتنی جگہ نہیں چھوڑی کہ کسی دوسری صورت سے کوئی شے داخل ہو سکے میری افسردگی اتنی بڑھ گئی ہے کہ معشوق۔ یا کسیکے التفات سے دلمیں خوشی کو پیدا نہیں ہونے دیتی گویا میرے دل میں سوائے درد کے اسطرح سے کسی شئے کی گنجائش محال ہے

دوسرا پہلو یہ ہے کہ خالی افسردہ ہو کر رہجانے سے کوئی معشوق کے التفات کی خوشی نہیں پیدا کر سکتا ہاں کوئی سراپا درد بنجائے تو اُسکے دل میں جگہ پانا ممکن ہے۔

یا یہ کہ افسردگی سے التفات معشوق کی خوشی نہیں ہو سکتی البتہ کوئی سراپا درد بنجائے تو اُسکے التفات کو خوش کر سکتا ہے۔ طرب انشاء کی ترکیب اسوجہ سے غلط ہے کہ لفظ دونوں عربی ہیں۔ اور معانی فارسی ترکیب کے پیدا ہوتے ہیں یقیناً مصنف نے طرب افشائے کہا ہے۔ اور کاتبوں نے انشا لکھدیا۔

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

اے ہمنشیں میں روتا ہوں تو مجھے ملامت نہ کر میرے دل کے غم کی گتھی کسیطرح تو سلجھے۔

چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

ہم نے اپنا جگر تک چاک کر لیا۔ مگر اُس نے ہمارا حال نہ پوچھا تو اس لئے اب گریباں پھاڑ کے کیا فائدہ ہے۔ اس سے اسکو کیا پروا ہوگی سوا اسکے کہ اور ہم بدنام ہو جائیں اور

اپنے گریباں کو رسوا کریں۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل — تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

میرے لختِ جگر ہر خار پر الجھے ہوئے ہیں اور اس صورت سے تمام جنگل ایک لالہ زار معلوم ہوتا ہے اب یہ کثرت ہے تو کہاں تک اسکی باغبانی کیا کریں۔

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

تجھکو نظر دیکھ نہیں سکتی ہے۔ اور ناظر کے لیئے اوسکی نگاہ کی ناکامی برقِ نظارہ سوز ہے ورنہ تیرے جلوہ کا کوئی قصور نہیں ہے اس مضمون کو بھی مصنف نے مختلف صورتوں میں لکھا ہے مثلاً۔

؎ جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں
؎ اے دل ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

مصنف کے ہر انداز بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی ہے کہ ذرا سے تغیر سے مضمون کو بالکل علیحدہ کر دکھاتے ہیں۔

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست — نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

جنوں سے سودا کرنے میں نقصان نہیں ہے بدیں واسطے کہ ہر سنگ و خشت جو لڑکے دیوانے کو مارتے ہیں وہ صدف ہیں جنسے شکست سر کے دیوانے کو موتی حاصل ہوتے ہیں۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

تیرا وعدہ صبر آزما ہے یعنی انتظار طلب ہے اس سے ہماری عمر بیت نہ سکی تیرا وعدہ پورا نہوا اور ہماری عمر ختم ہوگئی لہذا اتنی کسے فرصت ہے کہ تیری تمنا کرے۔ جبتک تیرا وعدہ پورا ہوگا موت آجائیگی مرزا داغ نے گویا اسکی شرح کی ہے ؎

جبتک وفا ہو وعدہ یہاں زندگی کہاں — مجھسے زیادہ عہد ترا استوار ہے
موقوف وصل یار ہے گویا وصال پر — اک عمر چاہیئے کہ تمنا کرے کوئی

ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز   یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ایجاد سے مراد غالباً عالم ایجاد ہے اس صورت میں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ عالم ایجاد کی طبیعت ہی میں وحشت ہے اور یہ وحشت یاس خیز اور مایوس کن۔ بلکہ یہ یاس ایک درد ہے جو ہر ساکن ایجاد کے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے نظم صاحب لکھتے ہیں کہ معانی آفرینی و خلاقی مضامین و اختراع لطائف ایسا وحشی فن ہے جس سے یاس پیدا ہوتی ہے پھر بھی سب اس مرض میں مبتلا ہیں۔

مولانا حسرت صاحب فرماتے ہیں۔ ایجاد کی طبیعت میں جو وحشت ہے وہ یاس خیز ہے یعنی ہم وحشی لوگ یاس کو ایجاد کیا کرتے ہیں اور اسطرح گویا مایوس ہونے پر مجبور ہیں۔

بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل   جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

ع پھٹ گیا جب سے گریباں تب سے   ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں

مگر مصنف کہتا ہے کہ جب گریبان و دامن وغیرہ کا فیصلہ ہو چکے اور سب چاک ہو جائیں تو جنوں بیکار ہو جاتا ہے مگر اس عالت میں مجنوں کا کام یہ ہے کہ سر پیٹے۔ مگر اسوقت کیا کرے جب سر پیٹتے پیٹتے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ نہایت ہی عمدہ شعر کہا ہے۔ اسکی تعریف ممکن نہیں ہے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد   پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

پہلے کوئی دل گداختہ پیدا کرے تب شمع سخن کو فروغ ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ فروغ ہونے میں شمع کو سوز و گداز بھی ضرور ہوتا ہے۔ غالباً کسی پر اپنے معاصرین میں سے یہ چوٹ کی گئی ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اگر کوئی مردوں کو زندہ کرتا ہے تو کرے کوئی عیسیٰ نفس ہے تو ہو میں تو جب جانوں جب کوئی میرے دکھ کی دوا کرے۔

شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی ٢

ہم نے مانا کہ شرع اور قانون کی موافق قاتل کو سزا دیجاتی ہے یا اُس سے دیت لیجاتی ہے مگر جیسا قاتل کہ میرا ہے ایسے قاتل کا کوئی کیا کرے جو بغیر تلوار کے قتل کرے۔

چال جیسے کڑی کماں کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی ٣

اوسکی چال ایسی دل کے پار ہوجاتی ہے جیسے کڑی کمان کا تیر۔ مزاج ہے کہ ایسے کے دل میں کوئی گھر کرے۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی ٤

وہاں بات کرنے میں بھی زبان کٹتی ہے یعنی وہ اسکے سامنے چپ بیٹھا ہوا جو کچھ وہ کہیں سنا کرے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ٥

خدا جانے اپنے جنوں میں کیا کیا کہہ رہا ہوں خدا کرے کوئی ان باتوں کو نہ سمجھے

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی ٦

اگر تمھارے منھ پر تمھیں کوئی برا کہے تو اس کان سے سنو اور اُس سے اڑا دو۔ اور اگر کوئی برا کرے تو اُس کو دیکھ کر پردہ پوشی کرو۔

روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی ٧

اگر کوئی غلط رستہ پر چل رہا ہے تو اُسکو آگاہ کر دو اور روک دو اگر کوئی جرم کرے تو اسکی خطا معاف کر دو۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند — کسکی حاجت روا کرے کوئی ٨

دنیا میں کوئی حاجت روا نہیں ہے سب حاجتمند ہیں لہذا کون کسکی ضرورت پوری کرے

یا حاجتمند تو سبھی ہیں کسکی کسکی حاجت روائی کرے۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

دنیا میں خضر جیسا کوئی رہنما نہیں ہے مگر وہ بھی سکندر کو چشمہ الحیواں تک نہ پہونچا سکے پھر کوئی کسے رہنما کرے اور کون کسکی رہنمائی کرسکتا ہے۔ جناب رشید شاگرد مولانا امید صاحب کا شعر ہے

نکالے گا کوئی اُسکے سوا کیا لجۂ غم سے — خدا بن بیٹھنا اچھا نہیں ہے نا خدا ہو کر

سیہ بختاں قسمت راچہ سود از رہبر کامل — کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

جناب خضر تو خود راستہ بتاتے ہیں — جہاں میں کسکو کرے کسکو رہنما نہ کرے

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

یعنی اگر کوئی اُمید ہو کہ گلہ کرنے سے کچھ مطلب نکل جائے گا تو گلہ ہی کرے اور جب ہر طرح اُمید ہی منقطع ہوگئی ہو تو پھر کسیکا گلہ شکوہ کرنے سے کیا نتیجہ اور فائدہ ہے۔

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

باغ نے چونکہ سمجھ لیا ہے کہ میں ایک خفقانی ہوں لہٰذا وہ مجھکو ڈرا رہا ہے۔ اور اسکی ہر شاخ گل کا سایہ مجھے سانپ نظر آتا ہے۔ خفقاں میں اکثر ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اسی مضمون کا شعر ذوق مرحوم کا ہے۔

س۔ سایہ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے — اژدہا بن بن کے شب آکر شاخ گلشن آب میں

اگرچہ مطلب ذوق کا یہی ہے کہ میں دیوانہ ہو رہا ہوں مگر ظاہر ہے کہ جس انداز سے غالب نے کہا ہے وہ ذوق کے یہاں نہیں ہے یہی سبب ہے کہ غالب کے یہاں جو مضمون ہیں اگرچہ وہ دوسری جگہ بھی پائے جاتے ہیں مگر جیسا انداز بیان غالب کو ملا۔ وہ دوسرے کو نصیب نہیں ہوا مولانا نے ایک شعر نظیری کا اس شعر کے ساتھ لکھا ہے۔ اور بتایا ہے کہ غالب کا ذہن نظیری کے اس شعر سے ادہر منتقل ہوا ہے۔

س۔ بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را — نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ مگر ہمارے نزدیک غالب مرحوم نے مضمون کو بالکل علیحدہ کرکے کہا ہے۔

جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

جیسے کہ تلوار کا جوہر زہراب میں بجھانے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ سبزہ یعنی جوہر تلوار کسی دوسرے سرچشمہ سے نہیں اُگتا ہے اسیطرح میری پیدائش بھی زہراب غم سے ہوئی ہے

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

کوئی مجھکو آئینہ خانہ میں لئے جاتا ہے اور اس کا اس لیجانے سے مطلب یہ ہے کہ وہاں میرا دل ٹوٹے اور میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے تماشے میں محو ہوں۔ اور میرا دل ٹوٹنا اسپر منحصر ہے کہ میں حیران ہوں گا اور اس سے اور میرا دل ٹوٹے گا۔

یا میرا مدعا اب تماشائے دل شکستہ میں محو اور مصروف ہو رہا ہے گویا میرا دل ایک آئینہ تھا جسکے ٹوٹنے سے ایک آئینہ خانہ بن گیا۔

یا میرا مدعا اسمیں مصروف اور محو ہے کہ میرے دل کو جو آئینہ کی طرح حیران ہے توڑے اور یہ ظاہر ہے کہ عدم حصول مدعا سے میرا دل ضرور ٹوٹے گا۔ تو گویا اس حالت میں مدعا ہی میرا دل توڑنے کے درپے ہے اور خود بھی وہ اس آئینہ خانہ کی جو ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں سے بنیگا سیر کرنا چاہتا اور مجھے بھی یہ سیر دکھانی چاہتا ہے۔ اور اسطرح سے گویا وہ مجھکو آئینہ خانہ کی طرف لیجا رہا ہے۔

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

عالم کا سرمایہ نالہ ہے یعنی اسمیں نالہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ یہ دار المحن ہے اور عالم ایک کف خاک ہے تو گویا آسمان جس کے نیچے یہ عالم آباد ہے ایک بیضہ قمری ہے جس کے نیچے قمری جو رنگ خاک سے مشابہ ہوتی ہے موجود ہے۔ یعنی دنیا بے حقیقت اور رونے کی جگہ ہے آسمان کو بوجہ خاکستری ہونے کے قمری کہا گیا ہے اور قمری چونکہ ایک طائر نوا سنج بھی ہے اس لئے دنیائے نالہ کش سے بھی اوسکو تشبیہ دی گئی ہے۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

زندگی میں تو اُن کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مجھے محفل سے اٹھا دیا کرتے تھے اب کہ اس کوچے میں [illegible] میں وہاں مر گیا ہوں دیکھیئے وہ اٹھاتے ہیں یا نہیں اُٹھاتے۔ یا یہ کہ دیکھیں اب کسے اُٹھا دیں گے۔ یعنی اونکو میرے اُٹھانے سے انکار اور نفرت ہوگی۔

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

میں نے مانا کہ غم دنیا بہت ہیں مگر شراب بھی تو میرے لیئے بہت ہے کہ میں ساقیِ کوثر کا غلام ہوں شراب پی پی کر اون سب غموں کو فراموش کرتا رہوں گا۔ لہٰذا غموں کی زیادتی کا مجھکو کیا غم ہوا کہ میں میرا کیا بنا [illegible]۔

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے رقیب پہ ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

تمہاری طرز و روش کو ہم خوب سمجھتے ہیں کہ تم کسی پر مہربان بھی ہوتے ہو تو ظلم کرنے کے لیئے ہوتے ہو لہٰذا اگر رقیب پر مہر[illegible] ہو تو یہ کیا ستم ہے۔ وہی اس پر بھی ظلم کرتے ہو گے۔

سہ تو دوست کسیکا بھی ستمگر نہوا تھا اور وں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہوا تھا

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اسمیں دم کیا ہے

ہم جانتے ہیں کہ غالب بڑے پایہ کا شاعر سخن فہم ہے اور اسکا خامہ ہمیشہ آتش افشانی کرتا ہے مگر اب اسمیں دم نہیں رہا عاجز ہو گیا ہے۔

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی

کوکبہ وہ سوار جو بادشاہ کی اردلی میں رہیں۔ خاک سرِ راہ اترا رہی ہے اور اسکا اترانا [illegible] اسلیئے حق بجانب ہے کہ بادشاہ کے کوکبہ کی روندی ہوئی ہے۔ اس سے بادشاہ کی تعریف [illegible] یعنی جب بادشاہ کے اردلیوں کے روندنے سے خاک کو یہ فخر [illegible] ہے تو [illegible] بادشاہ مہربان ہو۔

جب اُس کے دیکھنے کے لیئے آئیں بادشا لوگوں میں کیوں نمود نہو لالہ زار کی

یعنی جب بادشاہ اوسکے دیکھنے کے لئے آئے تو اہل لوگوں میں کیوں نہ مشہور ہو اور اسے کوئی کیوں نہ دیکھے۔

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

اگرچہ سیرِ گلستاں کے ہم بھوکے نہیں مگر ہوائے بہار ایسی شئے ہے کہ یہ ضرور اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور اسکی طرف ضرور متوجہ ہونا چاہیئے۔ یہ ایسی نہیں کہ اس سے بھی استغنا کیا جائے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ہزاروں خواہشیں ایسی دل میں اب بھی موجود ہیں کہ ہر خواہش کے لئے جان نکلتی ہے۔ مرے ارمان اگرچہ بہت سے نکل چکے لیکن پھر بھی بہت سے موجود ہیں۔ گویا آدمی کی خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ مرزا داغ مرحوم کا مطلع اس زمین میں بہت ہی خوب ہے فرماتے ہیں ؎

ذرا کر زور سینہ پر کہ تیر اسے پرستم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اوسکی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

میرا قاتل اس سے ڈرتا ہے کہ میرا خون اوسکی گردن پر رہیگا۔ مگر اوسکا یہ ڈر فضول اور عبث ہے کیونکہ میرا خون ایک جگہ رہتا ہی نہیں ہے۔ آنکھ سے دمبدم نکلتا ہے تو اسکی گردن پر کیا ٹھیریگا۔ غالباً یہ مضمون مصنف نے نیا کہا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

آدم کا خلد سے نکلنا سنا تھا۔ مگر جیسے کہ ہم بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے نکلے ہیں ایسے وہ نہ نکلے تھے۔

بھرم کھلجائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

تیرا قد لمبا اور سرو بالا ضرور ہے مگر یہ جبھی تک ہے جب تک تیری زلف پیچیدہ ہے اگر اس کا پیچ و خم نکلجائے تو ابھی قد کی حقیقت معلوم ہو جائے یعنی تیری زلف قد سے بھی زیادہ دراز

بیخود دہلوی نے یہ مضمون نہایت اچھی صورت سے کہا ہے۔

ناپ لیجئے اپنے گیسو کی درازی قد سے آپ ۔۔۔ اب تو یہ فتنہ قیامت کی برابر ہو گیا

مگر لکھوائے اوسکو کوئی خط تو ہمسے لکھوائے ۔۔۔ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شخص اوس سے خط و کتابت کا مشتاق ہے اسواسطے ہم نے جو کچھ اوس کا نام لکھنے کے عاشق ہیں یہ ترکیب نکالی ہے کہ صبح ہوئی اور کان پر قلم رکھکر گھر سے نکلے جاتے ہیں کہ اوس کو اگر کوئی خط لکھوائے تو ہمیں سے لکھوائے۔ یا خط لکھنے کے لئے نکلنے سے یہ مطلب کہ دیکھیں لوگ کیا کیا لکھواتے ہیں۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھسے بادہ آشامی ۔۔۔ پھر آیا وہ زمانہ جب جہاں میں جام جم نکلے

یا جمشید کے زمانہ میں بادہ آشامی کا زور شور ہوا تھا اور ایجاد ہوئی تھی یا آجکل اسکی ترقی اور میکشی کی گرمی بازار ہو گی فارسی میں کہتے ہیں ؎

درمن ہوس بادہ طبیعت غالب ۔۔۔ پیمانہ بہ جمشید رساند نسبم را

ہوئی جنسے توقع خستگی کی داد پانے کی ۔۔۔ وہ ہمسے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

ہم نے جس کسی سے خستگی کی داد ملنے کی توقع کی اور جسکے سامنے اس بات کا اظہار فخریہ کیا کہ ہم نے اتنے ستم سہے ہیں وہ لوگ ہمسے بھی زیادہ تیغ ستم یار کے دلخستہ تھے۔ یا یہ کہ جس سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا وہ مجھسے بھی زیادہ پریشان نکلا یعنی دنیا میں کوئی شخص دل خوش نہیں ہے۔

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا ۔۔۔ اسیکو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

عاشق کا معشوق ہی کو دیکھکر دم نکلتا اور اسی پر اسکی جان جاتی ہے اور اسیکو دیکھکر جیتا اور وہی اسکی زندگی کا سامان ہے تو گویا عشق میں مرنا اور جینا دونوں برابر ہیں یہ شعر بھی مصنف کی جدّت تخیل اور طلسم الفاظ کا ایک زبردست نمونہ ہے۔ مجھے اسی مضمون کا ایک شعر اپنا یاد آتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے حافظہ نے ہمیشہ غالب کے شعر کو امانت کی طرح رکھا ہے ممکن ہے کہ کبھی بھولکر یہ امانت متخیلہ کو دیدی ہو۔ لہذا اسیکو کوئی

سرقہ کا گمان کریں تو انکی عنایت۔ ورنہ واقعہ یہ نہیں ہے

سہ اُسے مرنا بھی مشکل ہو اُسے جینا بھی مشکل ہو جو تم کو دیکھکر جیتا ہو اور تجھ پہ ہی مرتا ہو

سہ بھلا پھر لاش اُسکی کیوں نہ بے گور و کفن رہتی لبِ جاں بخش کا کشتہ نہ زندہ تھا نہ بیجاں تھا

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یہ تو کیونکر کہیں کہ جناب واعظ بھی میخانہ کا ارادہ کر کے گئے تھے کیونکہ یہ تو انکی شان سے بہت بعید ہے۔ مگر ہاں یہ ضرور دیکھینگے کل ہم جبکہ نکلے تھے کہ دروازہ پر وہ ہمکو ملے ظرافت کے ساتھ تہذیب نے عجب مزا دیا ہے مرزا داغ فرماتے ہیں سہ

جاتے تھے منہ چھپائے ہوئے میکدہ کو ہم آتے ہوئے اُدھر سے کئی پارسا ملے

شوخی اور ظرافت کی چاشنی داغ کا حصہ ہے اور ایک شعر لکھا ہے۔

سہ میخانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ سب لوگ پوچھتے ہیں کہ حضرت ادھر کہاں

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

میں وہ بدنصیب ہوں کہ دنیا بھر کے لئے بارِ خاطر ہوں یہانتک کہ اگر صدا ہو جاؤں۔ جو نہایت لطیف اور ہلکی چیز ہے تو اسکے لئے بھی بارِ خاطر ہوں اور وہ بھی مجھے پلٹا دیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوہ میں صدا گونجکر وہی صدا پھر بھی پیدا ہو جاتی ہے اسکو آواز کا رد کرنا کہا گیا ہے۔ اور رد کرنے سے بارِ خاطر ہونے کا ثبوت ملا۔ تو آخر اے شعلۂ برجستہ تم میں کیا ہو جاؤں۔ اور جیسے کہ تو برجستہ اور بے تکلف ہو رہا ہے میں کیونکر بے تکلفی کروں۔ اس شعر میں تشتر گریہ ہے۔

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

میرا قفس بیضہ کی مانند ہے جس میں میرے بال و پر سب غارت ہو گئے اگر میں اس کنجِ قفس سے نکل جاؤں تو مجھے از سرِ نو زندگی ملے اور یہ ظاہر ہے کہ بیضہ سے نکلنے پر نیا دور شروع ہوتا ہے۔

مستیٔ بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

ساقی غفلت شعار کی ادائے تغافل پر نشہ اور مستی تک ہلاک ہے اور چشم مست کے پیئے موج شراب مژگان خواب آلودہ بنی ہوئی ہیں۔ یا دیدۂ ساغر کے لئے موج شراب مژۂ خوابناک بنگئی ہیں۔

جز زخم تیغ ناز نہیں دل میں آرزو — جیب خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

یعنی نہیں ہے کہ میرا گریبان اور دامن پیراہن تیرے خیال میں چاک کیا ہو رہا ہے۔ بلکہ مجھے سوائے گریبان پھاڑنے کے اور کوئی خیال بھی نہیں آتا۔ جس سے معلوم ہوا کہ تیرے ہاتھوں جیب خیال تک ثابت نہیں ہے نظم صاحب لکھتے ہیں۔ کہ جیب خیال سے دل مراد ہے اور جیب دل میں زخم تیغ ناز ہوا تو جیب خیال چاک ہوئی پھر اسمیں آرزو کیونکر رہ سکے۔

مگر مصنف نے دل۔ اور جیب خیال دو لفظ رکھے ہیں اس صورت سے تاویل ثانی نادرست ٹھہرتی ہے۔

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ — صحرا ہماری آنکھ میں اک مشت خاک ہے

اتنا جوش جنوں مجھ میں بھرا ہوا ہے کہ صحرا کی وسعت میری نظر میں کچھ نہیں ہے یعنی سمجھتا ہوں کہ یہ صحرائے عالم میری وحشت کے لیئے ناکافی ہے۔ اور اسی لئے وہ ایک مشت خاک دکھائی دیتا ہے یا یہ کہ جوش جنوں نے مجھے اندھا کر دیا ہے۔ اور صحرا ایک گرد ہے جو میری آنکھ میں پڑ گئی ہے جس سے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اور یہی باعث ہے کہ صحرا کی وسعت ناکافی معلوم ہوتی ہے۔

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی — قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

جنبش لب عیسیٰ کا کام یہ ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔ مگر کشتگان لب معشوق کے لیئے یہی جنبش گہوارہ جنبانی کرتی ہے اور گہوارہ جنبانی سے اور زیادہ نیند آتی ہے۔ یعنی یہ ان کی موت کی نیند کی غفلت اور بڑھتی ہے قیامت بھی مردوں کو زندہ کریگی مگر ان خفتگان خاک کی نیند ہی قیامت ہے یعنی انکی نیند اس قیامت کی ہے گویا قیامت نیند ہو۔ اس شعر میں مصنف نے اس محاورہ سے کہ قیامت کی نیند ہے الفاظ کا ایک مستحکم طلسم بنا دیا ہے ذوق سلیم اوسکی جسقدر داد دے کم ہے۔ ایسے ہی کشتگان لب اسوجہ سے کہا ہے کہ لب معشوق کو بھی جانبخش کہتے ہیں اور اس لب ہی نے انکو مارا ہے تو گویا لب جانبخش نے انکو سلا دیا ہے۔ تو پھر زندگی کیسی

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے   نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

اس شعر کو نظم صاحب نے غلط اور بے معنی لکھا ہے حالانکہ یہ بہت صاف شعر ہے کہتا ہے کہ سیلاب طوفان صدائے آب آرہا ہے اور اس سے ڈر کر نقش پا نے اپنے کان میں جادہ سے انگلی رکھ لی ہے کیونکہ وہ نقش پا کو فنا کر دے گا اس غزل میں بہت ممکن ہے کہ مصنف بہار کے کچھ شعر نظم کر گئے ہوں اور یہ انھی میں سے ہوں اور انتخاب کے ہاتھ سے بچ گئے ہوں بیکسی شعر پر تنہائی کا ستم ٹوٹا ہو۔ چونکہ دوسرے شعر میں بادہ ترکیب کے ساتھ ہے لہذا اس شعر میں حرکت قافیہ میں اختلاف ہوگیا۔ اور یہ متقدمین کے یہاں کوئی بڑا عیب نہیں گنا گیا۔ ہاں اس صورت کے اکثر اشعار مل سکتے ہیں چنانچہ نقشی کہتا ہے۔

شکستہ کئے یکسر آتش کدہ   کیا ژند و استا کو آتش زدہ

بلکہ متقدمین نے عند الضرورت صیغہ مستعمل سے صرف روی کو ایسے صیغے کے ساتھ بھی تبدیل کر لیا ہے جس سے قافیہ ہونے کی شائستگی پیدا ہو گئی ہے جیسے خواب کی بائے موحدہ کو بدل کر واؤ کر دیا گیا ہے۔

گر خورے دیوانہ شد یک دم گاؤ   بر سرش چندان بزن کاید بخواؤ
غلط کردم دریں معنی کہ گفتم   ز نخدان نگار خویش را سیو
عجب نہیں ہے نجانے جو میر جاہ کی بات   سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کی بات
ہزار شانہ و مسواک و غسل شیخ کرے   ہمارے عندیہ میں تو ہے وہ خبیث پلیت

اور خیال کیجئے تو یہ شعر اختلاف روی میں بھی آسکتے ہیں۔ پھر بھی ایسے قوافی کے جمع کرنے سے پرہیز ضرور ہے۔ اور یہ اگر غلط نہیں تو صحیح بھی مشکل سے ہیں۔

بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا   شیشے میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

بزم مے کو کس کی چشم مست نے وحشت کدہ بنا دیا ہے کہ موج بادہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی پری کی نبض ہے جو اس بزم سے وحشت کھا کر شیشہ میں قید ہو گئی ہے۔ یا یہ کہ پری کے سایہ سے انسان کو وحشت ہوتی ہے یہ شیشہ میں موج مے ہے یا نبض پری ہے جس سے بزم سراسر وحشت کدہ بنی ہوئی ہے۔ اور مے کو پری سے مشابہت بھی دیجاتی ہے۔

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا   مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

میں اپنی تمنا کی حالتیں اور اسکی گوناگونی۔ اور تلون مزاجی کا ایک تماشائی ہوں میری تمنا کا حاصل یہ نہیں ہے کہ وہ پوری ہو۔ بلکہ میں نے بھی اسکو ایک کھیل سمجھ رکھا ہے۔

سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر   مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

میرے نامۂ قسمت میں تصویر شب ہجراں اسطرح کھینچی ہوئی ہیں جیسے کہ کاغذ پر لکھتے وقت سیاہی گر جائے۔ اور وہ سیاہ ہوجائے اسیطرح تمام نامۂ قسمت ان تصاویر سے سیاہ ہو رہا ہے۔

ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے   خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

میرے دل میں نالہ کا ہجوم ہے۔ مگر میں حیران اسقدر ہوں کہ ایک فغان جگرسوز بھی مجھ سے ناممکن ہے لہذا اس اظہار عجز کے لئے میں نے خموشی اختیار کی ہے تو وہ خموشی ایک ایسا تنکا ہے جو فریق مغلوب اپنی مغلوبیت کے ظاہر کرنے اور عاجز ہوجانے کے لیے دانتوں میں دبا لیتا ہے مگر میں تنکے کو مصنف نے ریشۂ نیستان کہا اور یہ صرف اس وجہ سے کہ میری خموشی سے فریاد و نالہ ٹپکتا ہے اور گویا لوگ ہیں سے سمجھینگے یا سمجھ رہے ہیں کہ اسکے دل میں آہ و نالہ کا جوش مثل نے ضرور ہے مگر یہ نالہ کر نہیں سکتا۔ مولانا ابوالکمال امید فرماتے ہیں کہ۔

ع   تکلم خیز ہے ہمدم مرا انداز خاموشی   بیان درد دل منت کش تاب فغاں کیوں ہو

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے محذوف ہو کہ اسے ہجوم نالہ میں حیرت کی وجہ سے نالہ کشی سے مجبور ہوں میری خاموشی جیسے خفا نہو بلکہ اسکو ریشۂ نیستان سمجھ۔ کہ اس سے میرے عجز کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ میں سراسر نالہ ہوں۔ ایک جگہ ریشہ نے کو اسیطرح اور بھی کہہ چکے ہیں۔

ع   ندا آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالونکو   لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطف خوباں   نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے

اگر تکلف کو چھوڑ دیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ معشوقوں کی بے حجابی اور ناز بھی قاتل ہے اور وہ بے حجابی تیغ تیز عریاں سے شناسا ہے۔ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی رح ع

غم کو ان کی اللہ سلامت رکھے   خوشیوں نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہوتا

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی   کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

کثرتِ غم نے مجھے سراسر غم بنا دیا ہے اور کیفیت شادی مجھ میں سے بالکل تلف کر دی ہے صبحِ عید بھی مجھے اپنا چاک گریباں ہے یعنی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی میرا گریباں پھٹا ہے۔

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے   کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

اگر ساقی سے سودا کرنا ہے تو دل اور دین دیجیے اور ساغر لیجیے۔ یہاں ادھار کا کام نہیں اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو   چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

غم عاشق کو آغوش بلا میں پالتا ہے ہمارا چراغ روشن قلزم صرصر میں روشن ہوتا ہے جیسے کہ مونگا دریا میں پیدا ہوتا اور پرورش پاتا ہے۔ ایسے ہی ہم آغوش بلا میں پرورش پاتے ہیں پرورش دینا فارسی کے محاورہ کا ترجمہ ہے۔

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے   نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

مصنف نے اس تاثیر سے کہ سرمہ کھانے والے کی آواز بستہ ہو جاتی ہے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ سرمہ اور خموشی کو ایک ہی چیز سمجھ کر کہا ہے۔ کہ نگاہ و تماشا و ادائے معشوق میں اور کوئی سرمہ نہیں لگاتا۔ بلکہ وہ اسکے دل ہی سے سرمہ سا ہو کر نکلتی ہے اور نہ خاموشی ہی اسکو زینت دیتی یعنی اسمیں سرمہ لگاتی ہے حاصل یہ ہے کہ جب تو خاموشی کی حالت میں تماشا سے بزم کرتا ہے تو تیری نگاہ پیاری اور سرمہ سا معلوم ہوتی ہے۔

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم   صبا جو غنچے کے پردہ میں جا نکلتی ہے

صبا غنچے کے پردہ میں اگر چلتی پھرتی جا نکلتی ہے تو وہ اسکو اسقدر بھینچتا ہے کہ آخر وہ شبنم بن جاتی ہے۔ اور اسکا یہ فشار تنگی خلوت اور شبنم بننا شرم فشار سے پسینہ پسینہ ہونے کی وجہ سے ہی [illegible]

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ   کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

ادا سے پوچھتے ہیں وہ گلے پہ پھیر کر خنجر   شہیدِ ناز بتلا تا کہ اس میں بار کیسی ہے

یعنی اے ظالم سفاک آبِ تیغِ نگاہ کی سینۂ عاشق سے کیا کیفیت پوچھتا ہے کہ آپنے اسکے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ روزنِ زخم کو دیکھ جس سے ہوا نکلتی ہے یعنی اسنے سینہ میں زخم ڈالدیا ہے اور زخم ایسا گہرا ہے جس سے ہوا نکلتی ہے اور جو زخم ہوادار ہے وہ ضرور مہلک ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے   نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

جہاں نسیم مَس زلفِ عنبر بو کی خوشبو لیجاتی ہے وہاں کے آہو کا دماغ نافۂ مشکِ تاتار بنا ہوا ہے۔

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا   آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

حیرت کو شعرا آئینہ سے مشابہ ٹھہراتے ہیں اسی بنا پر مصنف کہتا ہے کہ اے خدا حیرت کس کے جلوہ کے سراغ کے درپے ہے کہ تمام دنیا کا فرش بنی ہوئی یعنی تمام دنیا میں آئینے لگا دیے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ سراغ رساں لوگ عکس پڑنے کے لئے آئینہ لگا دیتے ہیں۔ اور یہ دنیا جسمیں آئینے لگے ہیں انتظار کی دنیا ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ اے خدا ہیں کسکے انتظار میں حیران ہوں۔

ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق   گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

میرے شوق کو حسبِ مراد جگہ نہ ملی اور اسکا ذرہ ذرہ صحرا میں پریشان ہو گیا۔ اور بصورت دام بچھ گیا۔ لہذا اگر یہی دام ہے تو تمام وسعتِ صحرا پھانس جائے گا۔

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ   نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

دل نے آنکھ پر دعوے کیا ہے کہ اسنے حسنِ قاتل کو دیکھکر میرا خون کیا ہے آج اسکے مقدمہ کی پھر روبکاری ہے۔

بندہ ذرا سمجھے کیسے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب　　　اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

ایران میں قاعدہ ہے کہ جب کوئی گھر سے سفر کو نکلتا ہے تو آئینہ پر چند سرسبز پتے رکھکر پانی چھڑکتے ہیں اور اسکو بخیریت جلد واپس آنے کا شگون جانتے ہیں۔ چنانچہ اسی رسم و محاورہ کو ظہوری، طالب، طغرا و صائب نظم کرکے کہتے ہیں۔

دیدہ را ز گریہ وا نکنم چو رفتی از بزم　　　در قفائے سفری آب بر آئینہ زنند
کس سوئے منزل نگراست در سفر آشنا　　　بر رخ آئینہ آب از پئے بیگانہ ریز
کیست آنکس کہ بر احوال مسافر گرید　　　چشم آئینہ بہ دنبال مسافر گرید

لہذا مصنف کہتا ہے کہ اے عندلیب بہت کی کچھ خبر ہے شبنم آئینہ برگ گل پر پانی چھڑک رہی ہے اور بہار رخصت ہو رہی ہے ایک جگہ یوں کہہ چکے ہیں۔

آغوشِ گل کشادہ برائے وداع ہے　　　اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے　　　وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

چونکہ یہ معشوق کا وعدہ ہے اسکے احترام کی وجہ سے میں پیچ کر رہا ہوں۔ کہ کوئی یہ نہ کہے کہ معشوق کے وعدہ کا انتظار نہ کیا۔ اب وہ آئے یا نہ آئے مجھے انتظار کرنا ضروری ہے۔ آئے یا نہ آئے کے ٹکڑے سے پتہ چلتا ہے کہ کہنے والا یہ بھی جانتا ہے کہ وہ وعدہ خلاف ہے میرا شعر ہے۔

سہ یہ مانا وعدہ خلافی کے آپ عادی ہیں　　　میں کیا کروں کہ مجھے انتظار رہتا ہے

پہ اور پر بمعنی مگر اور یاں۔ واں بروزن فع متروک الاستعمال ہیں۔

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر　　　ہر ذرہ کی نقاب میں دل بیقرار ہے

وادیٔ مجنوں یعنی دشت نجد میں بے پردہ ہو کر نہ جا۔ کہ یہاں ظاہر ذرے ہی ذرے معلوم ہوتے ہیں مگر در اصل ہر ہر ذرہ کے پردہ میں ایک ایک دل بیقرار ہے یعنی ہر ذرہ اضطرابِ دلِ مجنوں کا آئینہ دار ہے۔

بچائی ہے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں　　　طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

اے عندلیب یک کف خار و خس جمع کرنا ہے تو کرلے ورنہ پھر طوفانِ بہار میں یہ ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔ یعنی سب سرسبز ہو گا۔

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی　　اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

دل کو خراب و برباد نہ کر اگر اس میں خبر معرفت نہیں نہ سہی تو سیر کے لیے یہ کیا برا ہے کہ اس میں دنیائے آرزو موجود ہے۔

غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط　　اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

غفلت نے عمر بھر کا ٹھیکہ لے لیا ہے اور جناب اسد فرحت و خوشی دائمی کی ضمانت فرما چکے ہیں یعنی سمجھے ہیں کہ ہمیشہ چین سے گزرے گی۔ اے مرگِ ناگہاں اب تجھے کیا انتظار رہے یہ تو تیرے آنے کا وقت ہے حاصل اس کا نہایت اچھا ہے یعنی انسان اسی فکر میں رہتا ہے کہ ہمیشہ عیش و عشرت سے بسر ہو گی اور اسی میں ان کی غفلت بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ موت آ جاتی ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے　　ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

میں تجھے آئینہ کیوں نہ دوں کہ تجھے اپنے عکس کو دیکھ کر حیران ہونا پڑے اور یہ اوروں کے لیے ایک تماشا ہو جائے ورنہ بصورت دیگر تو یہ غیر ممکن ہے کہ تیرا ثانی تجھے دکھا سکوں آئینہ میں عکس دیکھ کر حیران ہونا ایک عام مضمون ہے۔

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں　　گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

میرا دل تیری بزمِ خیال ہے کیونکہ تو اور تیرے خیال اس میں جلوہ گر ہیں اس کی زینت کے لیے چند نگاہوں کا ایک مجموعہ اور گلدستہ جسے سویدا کہتے ہیں حسرت نے لا کر رکھ دیا ہے یعنی علوم جسے میرا سویدائے دل کہتے ہیں وہ چند حسرت بھری نگاہوں کا گلدستہ ہے۔ مصنف کے نزدیک نگاہوں کا موطن دل ہے۔ کیونکہ دل میں آرزو سے نگاہ پیدا ہوتی ہے۔ جیسے کہ ایک جگہ اور کہہ چکے ہیں۔ سے نگاہ دریچہ تیرے سرمہ سا نکلتی ہے۔ ایک جگہ ذرا کھینچ

شاکر یوں کہتا ہے

مت مردمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا افسون انتظار تمنا کہیں جسے

اے خدا یہ محبت کے کان میں افسون انتظار جسکا دوسرا نام تمنا ہے کس نے پھونک دیا ہے یعنی محبت کو بلا کسی کے بتلائے اور سکھائے ہوئے تمنا کرنی کیونکر آجاتی ہے۔

سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہجوم درد غریبی کے عالم میں یعنی دوری وطن کے سبب سے سر پر ایک مٹھی خاک جسکو دنیا صحرا کہتی ہے ڈالنی چاہیے۔ یعنی بہت خاک اڑانا چاہیے۔ یعنی اتنی خاک اڑائے کہ صحرا ایک مٹھی خاک کی برابر ہو۔

ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

میری چشم تر میں حسرت دیدار نے شوق کو نہاں کر دیا ہے اور وہ شوق نکلنے کے لیے مضطر الحال اور بیتاب ہو رہا ہے۔

اور بصورت دریا آنکھ سے نکل رہا ہے یعنی حسرت دیدار کے شوق میں رو رہا ہوں

درکار ہے شگفتن گلہائے عیش کو صبح بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

اور دنیا کے پھول صبح بہار میں کھل جاتے ہیں مگر عیش و عشرت کے پھول اس صبح بہار میں نہیں کھلتے بلکہ وہ پنبہ مینا کی صبح۔ یعنی شغل شراب نوشی اور بوتل سے کاگ اڑنے کے وقت کھلتے ہیں۔ جیسے کہ یہاں سپیدی کو جو پنبہ کا ہوتا ہے ایسے ہی سپیدی کو صبح بہار کے لئے ایک جگہ یوں استعمال کیا ہے۔

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

تھوڑا سا فرق کر کے مضمون بالکل جدا کر دیا ہے۔

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

غالب تجھے اگر واعظ برا کہتا ہے تو کہنے دے اوسکے کہنے کا برا نہ مان کوئی دنیا میں ایسا آدمی نہیں ہے کہ جسکو ہر کوئی اچھا ہی اچھا کہے۔ میکدہ والے تیرے مداح ہیں کعبہ والے برا بھلا کہتے ہیں تو کیا غم ہے۔

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغ دل بیدرد نظر گاہ حیا ہے

یعنی لالہ میں جو شبنم ہے یہ بلاوجہ اور بے سبب نہیں ہے اسمیں خاص وجہ ہے کہ یہ شبنم نہیں ہے بلکہ گل لالہ کا عرق ندامت ہے کہ اسکو اس بات سے شرم آئی ہے کہ میرے دل میں داغ کسب اور درد نہیں ہے۔ اور دراصل بیہودہ بے دل۔ دل بیداغ داغ بیدرد جائے شرم ہے

دل خوں شدہ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے

میرا دل حیران جو آئینہ اس لئے بنا تھا کہ معشوق اُسے دیکھے اور اس صورت سے وہ معشوق کا نظارہ کرے وہ حسرت دیدار میں خون ہو گیا مگر اوس تک نہ پہونچا اور کمبخت حنا اوسکے ہاتھ کی آئینہ بنی ہوئی ہے یا میرا دل جو حسرت دیدار میں خون ہو گیا تھا۔ وہ صورت آئینہ حنا بنکر اوسکے دست نازک میں پہونچا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے

میرا دل افسردہ ہو کر رہگیا ہے۔ اور مجھے حسرت ہے کہ میں جل کیوں نہ گیا۔ اس نہ جلنے کی وجہ سے میرا جی اسقدر جلا ہے کہ اگر شعلہ ہمکو جلاتا تو وہ اتنا نہ جلتا۔
مصنف نے اس قسم کے کئی ایک شعر کہے ہیں اور وہ سب لکھے ہیں۔ جو گذر چکے ہیں۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے

تیری تصویر تیرے عکس میں وہ شوخی وہ دلکشی ہے کہ آئینہ نے شوق میں پھول کی طرح اپنی گود کھولی ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

نالہ کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے کہ قمری سرو کی عاشق ہے اور وہ غمِ الفت میں جلکر خاک کی صورت ہو گئی ہے اور اس صورت میں اسکا پتہ ملتا ہے۔ بلبل عشقِ گل میں مقید ہو کر ایسی فنا ہو گئی ہے کہ بس قفسِ رنگ ہی رہ گئی ہے یعنی صرف رنگ ہے باقی اسمیں دل و جان نہیں ہے۔ اور یہ رنگ بھی اسوا سطے ہے کہ وہ گل کی عاشق ہے اور اسکا رنگ اسکے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ بلبل کا اس سے نشان ملتا ہے۔ مگر اے نالہ میرے جگرِ سوختہ کا کیا نشان ہے میں اگر اوسکو ڈھونڈھوں تو کس صورت ڈھونڈھوں اور کیونکر پاؤں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا جلا ہے کہ اسکا کسی صورت اور کسی رنگ سے سراغ نہیں مل سکتا۔ نظم صاحب نے نالہ کے ساتھ خطاب کو بے لطف کہا ہے مگر میں کیا کروں مجھے فیضی کا شعر یاد آگیا دمن تل کے فراق میں کہتی ہے۔

اے درد سینہ ام خبر کن وا سے نالہ تراوش جگر کن

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

تیری بدخوئی نے میری آتشِ وحشتِ دل کو جو الفت و محبت میں پیدا ہو گئی تھی اُسے افسردہ کر دیا کیونکہ تو معشوق ہے اور تجھ میں ناز و انداز جور و جفا وغیرہ کا حوصلہ نہیں ہے یہ میری واسطے ایک بلا ہے یعنی وہ آگ اگر بھڑکتی تو مجھے دم بھر میں جلا کر خاک کر دیتی۔ مگر یہ افسردگی رو رو کر ستائے گی۔

مجبوری و دعوئ گرفتاریِ الفت دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

جب مجبور ہو گئے ہیں اور کچھ نہیں ہو سکتا یعنی آزادی نصیب نہیں ہے تو ہم عوام کو دھوکا دے رہے ہیں کہ کیا کریں پچھلی محبت کو نباہ رہے ہیں۔ گویا پیمانِ وفا ایک پتھر تلے دبا ہوا ہاتھ ہے نکل تو سکتا نہیں ہے مجبوری سے اسکو پیمانِ وفا کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے تو کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا ہے۔

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

تیری تیغ خوں آلود ستم کو دیکھکر پتہ چلتا ہے کہ تو نے شہیدان گذشتہ کو کس بیرحمی سے قتل کیا ہے گویا یہ تلوار ایک آئینہ ہے جسمیں گذشتہ تصویریں ظلم و ستم کی نظر آرہی ہیں۔

اے پرتو خورشید جہانتاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہمپہ عجب وقت پڑا ہے

اے خورشید جہانتاب ذرا ہماری مصیبت کو بھی دیکھ اور ہمپر بھی کرم کر۔ وقت پڑنا سایہ کے لیئے نہایت مناسب ہے۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ایخدا جن گناہوں کے کرنیکی مجھکو حسرت رہگئی ہے اور اسکی وجہ سے میں نے رنج اٹھایا ہے ذرا انکو بھی دیکھ تب مجھے ان گناہوں کی سزا دے۔ ایسا ہی مضمون کئی جگہ اردو فارسی میں کہا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھسے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

بیگانگی خلق سے بیدل نہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

اگر مخلوق تجھسے بیگانہ ہے تو ہوا کرے خدا تو ہے ؎ خدا داریم یارا نا خدا درکار نیست

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

تجلی کو اپنے نور کا اظہار کرنا مقصود تھا چنانچہ تیرے قد و رخ میں وہ ظاہر ہوئی اور اس سے تیری قسمت جاگی یہ شعر نعتیہ ہے۔ منظور تھی یہ شکل کے یہ معنے ہیں کہ وہ ایسی پیاری صورت میں اپنا ظہور چاہتی تھی۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

چونکہ وہ تیرے شہید ہیں ہذا وہ کفن حالانکہ خوں چکاں اور بیرونق ہیں مگر بھی کچھ ایسے بھلے معلوم ہوتے ہیں کہ انمیں کروڑوں بناؤ نظر آتے ہیں۔ اور حوریں حسرت سے انکو دیکھ رہی ہیں۔ اگرچہ مرزا نے بھی یہ شعر بہت اچھا کہا ہے مگر عرفی نے بیمثل کہا ہے۔

جلوہ اش سوختہ اہل بہشت از غیرت ۔ تا شہیدان تو گلگون کفنے ساختہ اند

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو   کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

نہ آپ خود پیئیں نہ کسی کو پلانے کا آپ کو مجاز۔ پھر بھلا تمہاری شراب طہور کا کیا کہنا۔ یہ چوٹ ٹھیک ہے

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا   گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

میرا قاتل ایسا بدمست اور غفلت شعار ہے کہ قیامت کی بھی اسے خبر نہیں ہے اور میں کھڑا ہوں تو مجھ سے خفا ہوتا ہے۔

آمد ہے فصل گل کی جو بلبل ہے نغمہ سنج   اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

فصل گل آ رہی ہے کہ بلبل نغمہ سنجی میں مصروف ہو گیا۔ ہمکو بھی یہ خبر ملی ہے مگر کیا اعتبار ہے جانوروں کی زبانی اڑتی ہوئی خبر ہے۔ جھوٹ سچ کو خدا جانے طیور کی زبانی سے اڑتی خبر بنانا غالب ہی کا کام ہے۔ ؎ بہار آنے کی بلبل خبر لگا کہنے۔

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اے واعظ تو مجھ سے بت پرستی سے ناراض ہوتا ہے میں تیرے خلاف راستہ نہیں چل رہا ہوں بلکہ صحیح راستہ پر ہوں تو کعبہ کو پوجتا اور اسکا احترام کرتا ہے میں بتوں کا احترام کرتا ہوں نسبت یہ ہے کہ بت بھی کعبہ میں ایک وقت میں رہے تھے۔ وہاں سے نکال دئے گئے ہیں مگر پھر بھی ان کو کعبہ سے ایک طرح کی نسبت ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

یعنی کیا یہ مسئلہ اصول کا ضروری ہے کہ ہمکو بھی ویسا ہی صاف جواب ملے جیسے حضرت موسی کو ملا تھا۔ ممکن ہے کہ ہمارا نصیبہ جاگ اٹھے حاصل یہ ہے کہ تلاش مقصود سے تھک کر نہ بیٹھنا چاہیئے اور دوسروں کی ناکامی سے خود مایوس نہ ہو جائے۔

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

یعنی حد اعتدال سے گذرنا چاہیے نہ تھا اُن کی جب کہ جا نہیں ہو سکے - شکر کرنا جو لکھے سو تھوکے -

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

اگر مجھے بھی شاہ عالم پناہ اس سفر میں ساتھ لے چلیں تو حج کا جو کچھ ثواب ہے وہ میں حضور کی نذر کر دوں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کسی کو حج کراتا ہے اوسکو حج کا ثواب ملتا ہے -

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

میرا دل غم کھانے میں بہت ہی کمزور ہے - اگر بہت سی شراب ہوتی تو اُسکو پی کر غم کے دن گذار دیتا کیونکہ وہ اندوہ ربا ہے - مگر چونکہ غم زیادہ ہے شراب کم ہے یہ مجھے واسطے اور بھی افسردگی غم کا سبب ہے - اسی مضمون کو مصنف اس طرح کہہ چکے ہیں :

ع بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے — غلام ساقی کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

ساقی چونکہ شراب پلا رہا ہے اسواسطے اسکے پاس ادب سے نہیں کہہ سکتا کہ بس میں سیر ہو گیا ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ ساقی اگر دُرد تہ جام یعنی تلچھٹ بھی بچا دیوے تو وہ میرے واسطے کافی ہے -

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کمان اور کمین کی تجنیس قابل داد ہے - آشیانہ تھا تو بجلی کا ایک خوف تھا باغبان کی [illegible] بلبل کا خوف تھا صیاد کا ڈر الگ دل پر چھایا تھا - مگر قفس کے گوشے میں [illegible] نہ تیر صیاد کا ڈر -

۵ بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست — قعر دریا سلسبیل است

ستم ستم نہ سمجھ کر ہو امتحاں کیسے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی   پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

اگر زہد ریائی بھی نہ ہو تو یہ تیغ لگی ہوئی ہے کہ بدلہ کا فکر ہے یعنی جزا کی طمع ہے اور یہ کچھ کم برائی نہیں ہے ریا ہی ہے یہ بھی۔ ایسا ہی ایک شعر پہلے لکھا جا چکا ہے۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں   پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اہلِ خرد بھی دنیا میں بہت ہیں لہٰذا ان کی روش خاص نہ رہی رسمِ عام ہو گئی اور یہ کچھ قابلِ فخر نہیں ہے مزا جب تھا کہ جب کوئی روش خاص ہوتی اور اس پر ناز کرتے۔ اسمیں بھی مصنف نے الفاظ کا طلسم بنایا ہے جس میں یہ معانی بھی موجود ہیں کہ رسم و راہِ عام کی پابندی اور روشِ خاص کا دعوے اور اس پر ناز۔ گر ولی انیست لعنت بر ولی۔

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے   آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

میں طوفِ حرم کو جا کر کیا کروں گا۔ مجھے زمزم ہی پر چھوڑ دو اپنا خرقۂ شراب آلودہ ہی آبِ زمزم سے پاک کر لوں یہی کافی ہے اس قسم کا بھی ایک شعر گذر چکا ہے۔ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے۔

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو   انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

اگر اب بھی وصل نہ ہو تو بڑا غضب ہے کہ انکو انکار نہیں اور مجھے اصرار ہے۔ یعنی خداوند کریم کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں۔ یا جب میرا بندہ مجھے ڈھونڈتا ہے تو میں قریب ہو جاتا ہوں اس حالت میں کہ میں جویا بھی ہوں اب بھی نہ پا سکوں تو بدنصیبی ہے۔

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ   رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

اے مرگ ہمارا عشق [illegible] بہت سی مصیبتیں اٹھانا ہیں ابھی میں رویا ضرور ہوں مگر میرا جگر خون ہو کر آنسوں کی ناکامی سینے پر [illegible] نہیں ٹپکا ہے ابھی مجھے بہت سے کام ہیں ذرا اور مہلت دے میرا شعر ہے موت تھوڑا سا   وہ مجھ پر جفا کر لیں میں اس سے وفا کر لوں

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے

یعنی سب جانتے ہیں سو بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

یار مہماں ہوتا تھا تو شراب آتشیں کا دور چلتا اور رچ [illegible]

معلوم ہوتی ۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

عرصہ سے مژگان یار کی دعوت نہیں کی ہے کیونکہ آ

تھے ۔ اب اپنے دل کے ٹکڑوں کو پھر جمع کر رہا ہوں کہ ایک کی

سے آمادہ گشتہ ام مگر امشب لقمہ رہ را

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم

اس احتیاط کے طریقہ سے پھر مجھے ایک الجھن ہو رہی ہے

چاک نہیں کیا ہے ۔

پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس

پھر [illegible] ادھر آتشیں گرم گرم نالے کھینچتا ہے سیر چراغاں [illegible]

نالۂ گرم کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے ۔

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق

حضرت عشق [illegible] زخم دل کا [illegible] جینے کے نعم

پھر میرے دل کے تکلیف دینے کا شوق نے سامان کیا ۔

[illegible] جاودانی کیا حاصل ہے ۔

[illegible] ہی ہمیشہ آرام جاوداں کے لئے

[illegible] یا [illegible] جاوداں کے لئے

[illegible] جہاں کے لئے

بنا تا ہوں کہ تیرا ظلم اور تیری ادا سے کے لیے

[illegible] کیا ہے

[illegible] ہوتی خدایا آرزو دوست دشمن کو

[illegible] ہوکے رہتے یا شب فرقت میری

[illegible] کرو یا سارے زمانے کے لیے

[illegible] تیر [illegible] جہاں کے لیے

[illegible] جہاں کے لئے

رازدستی قاتل کے امتحاں کے لئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] امتحاں کے لئے

[illegible] امتحاں کے لیے

ہم ستم نہ سمجھ کر ہو امتحاں کے لیے

مقدر مقتضی ہیں امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

دل اسیری ہے جیسے کوئی طائر گرفتار قفس میں آشیاں
میری ناکارہ اور بیکار کوشش کی مثال شعر کہا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ کوشش رہائی کرتے
بنانے کے لیے تنکے جمع کرے یہ نہایت بلیغ ہے اور خوش کرنیکو قفس میں گھر بنائے ایسے ہی میں
کرتے کرتے تھک جانے پر جیسے مرغ اپنے دل کے اسی غم میں خوش ہوں اصل یہ ہے کہ یہ قافیہ غالب نے
بھی تھک کر راضی برضا ہو گیا ہوں۔ اور ایسے
اپنے حصہ کا کر لیا ہے۔ اسکا جواب نہیں

قفس میں کیونکہ نہ تڑپے دل آشیاں کے لیے
ہزار بیم برق بلا روز آشیاں کے لیے
جو بلبلوں کو نہ دے حکم آشیاں کے لیے

ذوق صبا جو لائے خس و خاشاک لدا ہے
کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ دام و قفس
وہ اپنے باغ میں ہمکو ضرور

ایسے بھی آشیاں کے دو قافیہ کہے تھے یہاں اگرچہ لکھنے نہ
اسی طرح میں لکھنؤ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا میں
جا بلیغ مگر لکھتا ہوں۔

کہ تنکے تک نہ ملے مجھکو آشیاں کے لیے
کہ یہ بھی برق نہو میرے آشیاں کے لیے

وہ کم نصیب ہوں باغ جہاں میں کہ
فلک زدہ ہوں شفق نے بھی قدر ہو

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

مجھے دروازہ پر کھڑا ہونے دیا تھا وہ چپ ہو گیا
پاسباں نے مجھے سائل سمجھا تھا اور قدم لیا منہ پر گر پڑا جس سے اسنے مجھے پہچان لیا۔ اور
کہا اگر میری شامت اعمال کہیں پاسبان کے قدم لیا حصہ کر لیا ہے مگر مومن خاں نے اسکا جواب دیا ہے
ورنہ نکال دیا یہ قافیہ اگرچہ مرزا نے اپنا
اور خوب جواب دیا ہے۔

وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے
اگر کہو تو کر دوں ان کے پاسباں کے لیے

شعر۔ رہا اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وہ نہیں ہے بخت عمل کی کیا تھا

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

جو کچھ مجھکو لکھنا ہے وہ غزل میں
نہیں لکھ سکتا اسلئے یہاں سے دوسرا پیرایہ اختیار کرنا چاہیے

یہ ضبطِ ناز کی تعلیم شیفتہ بیجا ہے زبان ہم کو ملی ہے اگر بیاں کے لیے ۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

عیش و آرام میرے ممدوح تجمل حسین خاں کے لیے ہے اور دوسروں کو بربنائے مصلحت دیا گیا ہے کہ کہیں اُسے کسی کی نظر نہ لگ جائے ۔ بہت خوب شعر ہے ۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اے اللہ میری زبان پر یہ کس کا پیارا پیارا نام آگیا کہ میری زبان خوشی میں میرے منہ کو چومنے لگی یا اس نام کے اثر سے زبان نے منہ کے بوسے لیے ۔

خاقانی مدحت کعبہ دل میں کہتا ہے ؎

زہی نام چہ تر کنم زبا نرا   جاں بوسہ زند سر زبا نرا

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک   بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے

وہ ملک و دولت کا مددگار اور مذہب کا حامی ہے اس لیے اُسکی یہ عزّو شان ہے کہ آسمان باوجود اپنی رفعت اور بلندی کے اُسکے آستانے کے لیے بنا ہے ۔

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش   بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

زمانہ اسکے عہد میں از سرِ نو آراستہ ہو رہا ہے اس لیے یہ ستارے جو اب ہیں اسکے سوا اور بھی ستارے آسمان میں بنیں گے کہ اُسکی زینت بڑھے ۔ اور چونکہ ممدوح کا نام تجمل حسین خاں ہے اسواسطے تجمل و آرائش از سرِ نو ہوگی ۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا   صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

میں نے نئے انداز میں یہ غزل لکھی ہے اور اس روشِ خاص کی طرف میں اپنے یارانِ نکتہ داں کو بھی متوجہ کرتا ہوں تاکہ اسے اختیار کریں ۔

قصائد

Galib. Delhi

حصہ دوئم سے شروع ہوتا ہے ...

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار   سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

باغ کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں ہے چنانچہ لالہ بے داغ کا سایہ سویدائے دل بہار بنا ہوا ہے۔ بے داغ سے مراد یہ ہے کہ بہار کا ... ہو کہ لالہ میں بھی داغ نہیں ہے کیونکہ داغ میں تو سوختگی ہے

مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرض سبزہ   ریزۂ شیشۂ مے جوہر تیغ کہسار

اسقدر مست ہے کہ وہ سبزہ بالائے کوہ کو بھی شیشۂ مے کے ریزے ظاہر کرتی ہے شیشۂ مے کی کرچوں کو بوجہ سبزی کے سبزہ سے مشابہت دی ہے۔ تیغ کوہ پہاڑ کی بلندی اور چوٹی کو کہتے ہیں دوسرے معنے یہ ہیں کہ باد صبا کی مستی سے سبزہ ظاہر ہوا ہے اور وہی سبزہ شیشۂ مے سے مشابہت اس لئے کہ ... اسکو ظاہر کیا ہے اور یہ اسکی مستی ہی کا اسیر اثر ہے کہ وہ ریزہ شیشۂ مے معلوم ہوتا ہے یہی ریزہ بوجہ اپنی تیزی کے تیغ کہسار کا جوہر بن گیا ہے یعنی جیسے جوہر تیغ کے لئے باعث عمدگی ہے ایسے ہی سبزہ پہاڑ کی چوٹی کے لئے۔

سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ   تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

بہار کے اثر سے داغ سیاہ پلنگ سبز ہو گئے ہیں اور ریشۂ نارنج کی طرح شرارے سرخ ہیں

مستیِ ابر سے گلچین طرب ہے حسرت   کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

ابر ایسا مست ہو رہا ہے کہ تمام عالم میں پھیلا ہوا ہے اور گویا دونوں عالم کو آغوش میں رکھا ہے میری حسرت کو افسوس آتا ہے کہ ایک یہ ہے جسنے دونوں عالم کو آغوش میں لے رکھا ہے۔ بوجہ طرب انگیزی ابر کے حسرت کے ساتھ گلچینی اور طرب کا ذکر کیا ہے۔ اور ایک میں ہوں ... کہ دونوں عالم کے فشار کے ساتھ میرے غم کا فشار ہوتا ... ہے۔

کوہ و صحرا ہمہ معموری شوق بلبل   راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

تمام کوہ و صحرا بلبلوں کے شوق سے آباد ہے۔ جو لوگ راہ میں سو گئے تھے وہ خندۂ گل سے بیدار ہو گئے ہیں یا یہ کہ سوئی ہوئی راہ۔ یعنی ویران راستے خندۂ گل سے جاگ اٹھے یعنی آباد معلوم ہوتے ہیں۔

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم   سر نوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار

ہوا کے فیض نے ایک سطر کو جو بخطِ غبار لکھی ہے دونوں جہان ابر کی یعنی بہت ابر کی تاثیر بخشی ہے جیسے کہ مژگانِ یتیم اشک آلودہ ہیں ایک سطرِ غبار آلود معلوم ہوتی ہے اور اس سے ہمیشہ آنسو ٹپکتے ہیں اسی طرح اب سطرِ غبار کو جو غالباً ابر کے چھوٹے ٹکڑے سے مراد ہے وہ ہوا ابرِ گہربار کی خاصیت سونپ دی ہے یا یہ کہ ہوا اتنی مرطوب ہے کہ غبار جسکا مزاج خشک ہے اسکو بھی مرطوب بنا دیا ہے یعنی اتنا سا ذرا سا غبار نظر آتا بھی سامانِ بارش ہے۔

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال   قوتِ نامیہ اسکو بھی نہ چھوڑے بیکار

قوتِ نامیہ وہ قوت جو سبزہ وغیرہ کو بڑھاتی اور بالیدگی بخشتی ہے اسکا یہ زور ہے کہ اگر ایک ناخن تراش کر پھینک دیجیے تو اس کو بھی ہلال سے بدر بنا دے گی۔

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز   دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

ایک مٹھی خاک جو اڑتی ہے وہ قمری معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہوا نے ہر شے میں جان ڈال دی ہے اور کسی شے کا اڑنا دلیل جاندار ہونے کی ہے۔ قمری کی تشبیہ کفِ خاک سے دیتے ہیں ہوا سے کفِ خاک اڑ رہی ہے تو قمری کہا گیا۔ دوسرے مصرعہ میں کہتا ہے کہ اگر کاغذ کو جلا دیجیے تو اس میں جو نقطہ پڑتے ہیں ان سے دام کی تصویر بن جاتی ہے جسمیں سیکڑوں طاؤس نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں تشبیہیں بہت مشکل ہیں یعنے بوجہ رنگ کے قمری کو کفِ خاکستر اور بوجہ مشابہ ہونے کے کاغذِ آتش زدہ کو دامِ طاؤس کہا ہے۔

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی   بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

اگر تو چاہتا ہے کہ میکدہ میں پھول بھی چنیے تو ایک شراب کا پیالہ طاقِ گلزار میں رکھ کر بھول جا

یا یہ کہ تو تشنہ ہے اس پیالہ کے بھرا ہیں پیالے بنا دے گی۔ اور میکدہ بیچ جائے گا۔ تو اس صورت میں
تو شراب خانہ میں بیٹھکر پھول بھی چن سکے گا۔

موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ   گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

اگر تو اپنی پگڑی گوشۂ میخانہ میں بھول جائے تو ہوا اسکو بصورت موجِ گل بنا دے گی اور اسلیے تجھ سے بہتر یہ ہے کہ وہ گوشۂ میخانہ میں نہ ڈھونڈھنا چاہیے بلکہ باغ میں خلوت خانۂ غنچہ میں وہ تجھکو بصورت موجِ گل ملے گی۔ ایک نازک تشبیہ اسمیں یہ ہے کہ پگڑی جب تک بندھی ہے بصورت غنچہ ہے اور جب کھل کر گر گئی تو گویا وہ گل ہو گئی۔

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر   سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

یہ جوشِ بہار ہے کہ اگر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر کھینچنے کا ارادہ کرے تو سبزۂ نوخیز کی طرح خطِ پرکار سبز ہو جائے۔

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ   طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

چونکہ پہاڑ سے لعل بھی پیدا ہوتا ہے اور سبزہ بھی وہاں ہے تو گویا یہ دونوں ملکر طوطی مدحت سرائے شاہ ہو گیا ہے۔ سبزہ طوطی۔ لعل منقارِ طوطی۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا   چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

اوس طوطی کا ارادہ اس بادشاہ کی مدحت سرائی کا ہے جسکی تعمیرِ قصر کے لیے اینٹیں قالبِ چشمِ جبریل سے بنی ہیں۔

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور   رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

فلک العرش اوسکی تعمیرِ قصر کے لیے ایک خم ہے جسمیں مزدور پانی بھر کر لاتے ہیں سلسلۂ فیضِ ازلی بصورت اس رشتہ کے ہے کہ جس سے معمار اندازہ کجی و راستی دیوار کا کرتے ہیں۔

سبزۂ نہ چمن و یک خط پشت لب بام رفعت ہمت صد عارف و یک اوج حصار

ہفت آسمان کا سبزہ اور ایک خط پشت لب بام قصر نجف اور سو عارفوں کی ہمت بلند اور ایک اوج حصار موصوف برابر ہیں۔ واؤ دونوں مصرعوں میں مساوات کے لئے ہے نظم طباطبائی نے لکھا ہے کہ اردو میں یہ واؤ مستعمل نہیں ہے مگر کوئی پوچھے کہ یہ شعر ہی اردو کا کہاں ہے مصنف کا کمال بیان اور قادر الکلامی ہے کہ فارسی کا شعر اردو سے جدا نہیں معلوم ہوتا۔ سبزۂ نہ چمن سے سبزہ کی کثرت بھی مراد ہو سکتی ہے۔

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پر کاہ وہ رہے مروحۂ بال پری سے بیزار

اگر وہاں سے کسی کو ایک مٹھی خار و خاشاک ملجائے تو پھر اسکو بازوئے پری کے پنکھے سے نفرت ہو جائے گی۔

خاک صحرائے نجف جوہر سیر عرفا چشم نقش قدم آئینۂ بخت بیدار

صحرائے نجف کی خاک عارفوں کی سیر کا جوہر ہے۔ جوہر وہ جس سے دوسری شئے قائم ہو اور اسکی ذات بذات خود قائم ہو۔ یعنی عارفان کامل کی سیر کا باعث اگر ہے تو خاک نجف ہے یعنی اسکی وجہ سے انہیں سیر کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سیر میں جو نقش قدم اس خاک پر پڑتے ہیں وہ گویا آئینہ ہیں جنمیں بخت بیدار کی تصویر نظر آتی ہے

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار

ذرہ خورشید پر ناز کرتا ہے اگر اسکا عکس آ سکے وہاں کی خاک کا ہر ذرہ خورشید کے لئے آئینۂ ناز ہے اور وہاں کی گرد امید کے لئے جامۂ احرام ہے جس سے کعبۂ بہار کا طواف کرتی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں غلو ہے خاک کی پاکی میں کہ وہاں کی خاک جسم امید پر باعث شرف و مقبولیت و سبب قرب بارگاہ ہے

آفرینش کو ہے واں سے طلب مستی ناز عرض خمیازۂ ایجاد ہے ہر موج غبار

بار بار پیدائش عالم وہاں سے فخر مستی ناز حاصل کرنا چاہتی ہے وہاں کی ہر موج غبار ایک

انگڑائی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انگڑائی شرابی کو نشہ کے اتار کے وقت آیا کرتی ہے گویا دہاں ہر موج غبار انگڑائی لیتی ہے وہ چاہتی ہے کہ شراب ناز سے نشہ حاصل کرے یعنی اس جگہ کی پیدائش کا پھر اظہار فخر کرے کہ مجھی سے یہ سرزمین مبارک بخشش پیدا ہوئی

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار   دل پروانہ چراغاں، پر بلبل گلزار

اے شمع شبستان بہار کی شمع نورانی تیرا فیض سب کو پہونچتا ہے دل پروانہ میں چراغاں کی اور بلبل کے پر میں گلزار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے یعنی تیرے سبب سے سب کی مراد حاصل ہوتی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تیرا فیض سب کو پہونچتا ہے دل پروانہ میں تیری محبت کے سوز و گداز سے جو داغ پڑے وہ چراغاں کا عالم پیش نظر کرتے ہیں اور وہی پروانہ کا مقصود ہے اور پر بلبل پر تیری محبت کے نقش نے گلزار بنا دیا ہے اور وہ اس کا عین مطلب ہے۔ مگر ان رعایتوں کے باوجود معنی اور مطلب زیادہ صاف ہیں۔

شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز   ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

آئینہ خانہ تیرے جلوے کے شوق میں پرواز کرتا ہے آئینہ خانہ کی مور سے تشبیہ نہایت عمدہ ہے مگر پرواز طاؤس ... مجھے ایک قصہ یاد آگیا فیضی نے اپنی مثنوی نلدمن کا جو کا پہلا شعر یہ لکھا تھا

اے در تنگ دیدہ تو را آشیان ناز   طاؤس نقطہ بلند پرواز

فخر کے ساتھ دربار میں سنایا۔ تو اس مصرعہ کو سنکر عرفی نے کہا کہ خوش گفتی مگر دوسرے مصرعہ پر عرفی نے اس پھبتی کے ساتھ کہا کہ فیضی طاؤس را بہ پرواز دیں یا ہم تا این ہم۔ بگوش عقاب نظر الخ۔

انصاف پسند فیضی علامہ تھا چاہتا تو تاویل کرتا مگر مصرعہ کو بدل دینا ہی انسب سمجھا

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں   سلک اختر میں مہ نو مژہ گوہر بار

تیری اولاد کے غم میں ہلال ایک مژہ اشکبار ہے یعنی جو آنسو نکلتے ہیں وہ موتی

ہیں اختر کو مژہ اشکبار اور اختر کو گوہر قرار دیا ہے۔

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز　　　ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

تیرا نقشِ قدم سجدہ گاہ عبادت ہے تیرے ہی حوصلہ سے عبادت کو قوت پہونچتی ہے۔

مدح میں تیری نہاں مدحتِ نعتِ نبی　　　جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

تیری مدح سرائی کرنا عین رسول مقبول کی مدح سرائی ہے۔ تیرا جامِ محبت جو پیتا ہے وہ بادۂ اسرار سے سرشار ہو جاتا ہے۔

جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر　　　یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار

دست دعا آئینہ ہے جسکا جوہر تاثیر ہے۔ وہ ایک طرف مژگاں اشک فشاں کے لیئے باعثِ ناز ہے تو دوسری طرف حسرت دل کے واسطے خار غم ہے کیونکہ۔ دعا کرتے وقت مژگاں سے آنسو نکلتے ہیں جس سے دعا مقبول ہوتی ہے اس سبب سے تو وہ جوہر آئینۂ دست دعا یعنی تاثیر فخر مژگاں ہے دوسری طرف چونکہ حسرت دل میں تاثیر کی وجہ سے مٹ جاتی ہے اوسکے لئے خار غم ہے یا یہ کہ وہ جوہر آئینہ دونوں چیزوں کا سبب ہے کہ ایک طرف اس سے مژگاں کو ناز ہے دوسری طرف وہ کانٹا بنی ہوئی ہے یعنی کانٹے سے مشابہ ہے۔

یہ بھی معنی پیدا ہوتے ہیں کہ سب جگہ آئینہ میں جوہر ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ دست دعا کا جوہر آئینہ ہے اور آئینہ سے مراد تاثیر ہے آئینہ سے تاثیر کی تشبیہ اس لیئے دی ہے کہ آئینہ بھی حسن و قبح ناظر کو ظاہر کرتا ہے اور تاثیر بھی نتیجہ دعا کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لیئے گویا یہ آئینۂ تاثیر ہے جس نے نتیجہ یہ ظاہر کیا ہے کہ ایک طرف مژگاں کو فخر ہے اور دوسری طرف غم خار ہے یعنی دست دعا کا جوہر آئینہ۔ اور آئینہ تاثیر تو گویا تاثیر جوہر ہے اور اسی جوہر کے دو اثر ہیں ایک طرف نازش مژگاں اور دوسری طرف خار دل غم اس صورت میں جوہر دست دعا آئینہ کے انوکھی ترکیب ہونے کا اعتراض بھی اٹھ گیا جو نظم صاحب نے اپنی شرح میں نامتین کیا ہے

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ　　　خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

جو آنکھ تیرے خاک در کی تابع فرماں نہو خدا کرے کہ وہ اقبال نگاہ کے لیئے عزا خانہ بنجائے اور پتلی جو سیاہ پوش اور ماتمی لباس پہنے ہوئے ہے اوس گھر کی عزادار ہو یعنی وہ ہمیشہ اقبال کا سوگ کیا کرے اور کبھی اوسکو کامرانی کا منھ دیکھنا نصیب نہو۔

دشمن آل نبی کو بطرب خانۂ دہر — عرض خمیازۂ سیلاب ہو طاق دیوار

دشمن آل نبی کو خدا کرے کہ دنیا کے طرب خانہ میں ہر طاق دیوار طرب خانہ منبع سیلاب طوفان حوادث ہو جائے۔ یہ شعر بھی دعائیہ ہے۔

دیدہ تا دل ہے اسد آئینۂ یک پرتو شوق — فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

اے اسد آنکھ سے لیکر دل تک میں یک پرتو شوق بنا ہوا ہوں اور یہی وجہ ہے اور اسی فیض سے میرا خط ساغر شوق شراب معنی سے لبالب ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اس شعر میں کئی معانی پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ دنیا کا قیام محض یکتائی معشوق ہی سے ہے اگر حسن سوا اسکے اپنے دوسرے کو دیکھنا پسند کرتا تو دیدارہ تجلی لیتی اگر تجلی انوار دنیا پر پڑتی تو یہ جلکر خاک ہو جاتی اور ہم کا کہیں پتہ بھی نہ رہتا۔

دوسرے اگر حسن یکتائی کو پسند نکرتا یکتا نہوتا۔ یعنی ذات باری تعالیٰ واحد و لاشریک نہوتی تو آسمانوں اور زمینوں میں فساد ہو جاتا۔ اور یہ سبب بر باقی کا ثبوت تھا لو کان فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا۔ تیسرے یہ کہ تکوین کائنات محض تماشائے خود بینی کے لیئے ہیں یعنی حسن طرح طرح سے اپنے جلوہ کو دیکھنا چاہتا ہے۔

یا یہ کہ حسن نے اپنے جلوہ یکتائی ہی سے کام رکھا ورنہ اگر ایسا نہوتا تو نہ معلوم ہم کہاں اور کس صورت کس حال میں ہوتے اشارہ مذہب صوفیا پر قایل ہمہ از دست وہمہ اوست کی طرف تھا۔

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہم تماشائے دہر میں مصروف ضرور ہیں مگر نہایت بیدلی سے کہ جس سے نہ کوئی عبرت

حاصل کرتے ہیں نہ کوئی ذوق سے ہماری تمنا بالکل بیکس ہے کہ نہ دنیا
حاصل ہوتا ہے یعنی اگر ہم تماشائے نیرنگیٔ عالم سے عبرت
ہے اور اگر لطف پیدا ہو تو دنیا کا مزا ہے مگر یہاں تو ... جو انھوں نے چاند کے لئے لکھی ہیں
کوئی تمنا پوری نہیں ہوتی ۔

...ش گوئے خواہی خواہ ذوالنون

عشق سیر بطی شیرازہ اجزائے ... ستند چوب ازاں بر روئے دریا دید آمد
... شود زر دو ورق پر بار

عشق کا نتیجہ یہ ہے کہ شیرازہ ...
... ارکھا تھا دام
... ہے یعنی وصل سے جدا ... [illegible]
... لہذا دونوں بیہودہ ...
... ارکھا تھا

ہرزہ ہے نغمۂ ز...

یعنی خیالات
وجود کے خیال کے ...
سے عدم اور ہم سے

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت ہے ... آدم ... ہوں کہ ... [illegible]

...ر سیاگاہ رقیب ... ہیستوں آئینہ

ہے اپنے رقیب کے عشرت کدہ کا مزدور ہے اور ...
جس سے فرہاد حیران و پریشان اور جان بلب ...
نہیں یہی مضمون غزل میں کہہ چکے ہیں

آجکل نقش معنی سے ... کتنا بیہودہ ... ہوں
ذکر حق سے ذوق تحسین کا ...

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم

...ے کا پیغام

... فنا آتش ... آئینہ دل تو نے اس

... سا ہیں ان ...

دانشمندی کا ادعا اور ...
کرتا ہے اور عبادت بامید نفع ...
کیا جاتا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ یہ دونوں امور ...
کرنے والے ہیں ۔

...ئے اور آئے شام

فاقی ... ہے ...
... آتش خام کے وقت آ نکلا

مثل مضمون وفا باد بدست تسلیم

یہاں بھی لیکن ... جیسے

... آغاز اور ترا انجام

باد بدست ... ہو دگی یعنی
تسلیم و رضا بیکار ہے یا اسکا نتیجہ پشیمانی ...
اور پریشان ہے مطلب یہ کہ تسلیم و رضا ... آغاز کو سمجھ چکے ہیں ... بلکہ کے معنے ہیں سب
... تا ... کے ساتھ نکلا ہے ۔

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے مجھکو سمجھا ہی کیا کہیں نمّام

تو اپنے دل کا بھید شاید مجھے اس لئے نہیں بتاتا ہے کہ مجھے تو نے غالباً چغل خور سمجھا ہے

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک ہی ہی اُمید گاہ عوام

یہ مجھے معلوم ہے کہ دنیا میں آج ایک ہی جگہ ہے جس سے لوگوں کی امیدیں وابستہ ہیں۔

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش غالب اوسکا مگر نہیں ہی غلام

میں جانتا اور مانتا ہوں کہ تو اُس در کا حلقہ بگوش غلام ہے مگر کیا غالب اوسکا غلام نہیں ہے۔ حلقہ بگوش غلام ہلال کے لئے ایک خاص لطف رکھتا ہے۔

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو تب کہا ہے بطرزِ استفہام

یعنی میں نے جو یہ کہا ہے کہ غالب اوس کا مگر نہیں ہے غلام یہ استفہام اقراری واستخباری ہے تو یہ اسوجہ سے میں نے کہا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تو یہ جانتا ہے کہ میں بھی اوسیکا غلام ہوں۔

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

اگرچہ آفتاب تاباں کو اس در کی شرف ملازمت کا روز فخر حاصل ہوتا ہے۔

تجھکو کیا پایہ روشناسی کا جز بہ تقریب عید ماہ صیام

مگر تجھے روشناسی اور باریابی کا یہی ایک عید الفطر پر موقع ملتا ہے۔

جانتا ہوں کہ اُسکے فیض سے تو پھر بنا چاہتا ہی ماہ تمام

مجھے یہ معلوم ہے کہ تو اُسکے فیض سے اب پھر بدر بنے گا۔

ماہ بن ماہتاب بن میں کون   مجھکو کیا بانٹ دے گا تو انعام

اچھا جو چاہے بن ہمیں کیا ہم کون ہیں کوئی تو اپنا انعام ہمیں تھوڑا ہی دیدے گا
یہ شعر بھی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے   اور کے لین دین سے کیا کام

میرا معاملہ اور ہے مجھے دوسروں کے انعام کی کیا پروا ہے کوئی محروم تھوڑی ہوں
کہ پرواہ کروں۔

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص   گر تجھے ہے امید رحمت عام

تو رحمت اور کرم عام پر پھولا ہوا ہے مگر مجھے بھی ایسی بخشش کی امید اور آرزو ہے
جو خاص میرے لئے ہے اور ایسا فیض تو جیسا تجھے پہونچے گا ہزاروں کو پہونچتا ہے۔

جو کہ بخشے گا تجھکو فرّ فروغ   کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

جو تجھے چاندنی کے لائق کرے گا وہ مجھے اُس چاندنی کا لطف اٹھانے کے لئے شراب
نہ دیگا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

جب کہ چودہ منازل فلکی   کر چکی قطع تیری تیزئی گام

جب تو چودہ منزلیں طے کر چکے یعنی چودھویں کا چاند بنجائے۔ اور۔

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر   کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

اور تیری چاندنی ہر گلی کوچہ اور در و دیوار صحن و بام پر پھیل جائے۔

دیکھنا مہ سے ہاتھ میں لبریز   اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر میرے ہاتھ میں ایک ساغر بلوریں شراب سے بھرا ہوا دیکھنا۔

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا   توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

میرے توسنِ طبع کے لئے ذکر شراب وجام ایک چابک بن گیا اور پھر غزل کے راستہ پر چلدیا۔

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام   تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

یعنی میں آپ ہی مر رہا تھا معشوق نے کیوں مجھے مارا اور ناحق بدنام ہوا۔

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں   غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام

ہماری زندگی ہی جب غم نے حرام کر دی ہے تو پھر اب شراب پینے میں کیا حرج ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ بھی حرام ہے۔ سو یہاں زندگی حرام ہے۔
یا یہ کہ شراب کیونکر نہ پیوں اوس سے کم از کم غم تراشی تو ہوتی ہے۔

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے   کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

بوسے میں درگذرا صرف یہ چاہتا ہوں کہ انہیں اُس لذت کی خبر نہو جو مجھے گالیاں کھانے میں ملتی ہے۔ ورنہ پھر وہ گالیاں بھی نہ دینگے۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس   اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

ہمارا کچھ قیام نہیں ہے ہم کوئی مذہب نہیں رکھتے ہیں اب دیر میں احرام باندھا ہے جو یہاں کے خلاف ہے کل کعبہ میں جائینگے وہاں ناقوس بجائینگے جو وہاں کے خلاف ہوگا۔

اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد   چرخ نے جس سے لی ہے گردشِ وام

مجھے اُس جام کا دور مفت ملتا ہے جس سے چرخ نے گردش تک قرض لی ہے یعنی آسمان جس جام کے لئے گردش میں رہتا ہے وہ مجھے مفت ملتی ہے۔

بوسہ دینے میں انکو ہے انکار — دل کے لینے میں جنکو تھا ابرام

جنھوں نے ضد کر کے مجھ سے دل لیا تھا وہ مجھے بوسہ دینے میں انکار کرتے ہیں۔

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے — کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

میں نے چھیڑنے کو اپنا نام غالب رکھا ہے تاکہ اُن کو اس نام پر غصہ آئے۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ پیک تیز خرام

اے چاند میں تو سب کچھ کہہ چکا اب تو کچھ کہہ بوجہ حسن کے پری اور بوجہ گردش کے چاند کو پیک تیز خرام کہا گیا۔

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو مجھے یہ بتا کہ وہ کون ہے جسکے در پر چاند سورج زہرہ مریخ سب ادب سے سجدے کرتے ہیں

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نام شاہنشہ بلند مقام

اے اگر تو نہیں جانتا تو اُس بادہ شاہ عالی مقام کا میں نام بتاتا ہوں۔

قبلہ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذوالجلال والاکرام

میری آنکھ اور دل کا وہ قبلہ ہے اس لئے کہ وہ مظہر جلال واکرام ہے میری آنکھ کی امیدیں اوسی سے وابستہ ہیں اور میرے دل کا وہی مرجع ہے

شہسوار طریقہ انصاف — نوبہار حدیقہ اسلام

طریق انصاف کا وہ شہسوار اور باغ اسلام کی تازہ بہار ہے۔

اسکا ہر فعل صورت اعجاز — جس کا ہر قول معنی الہام

جسکا ہر فعل معجزہ اور ہر قول الہام معلوم ہوتا ہے۔

بزم میں میزبان قیصر و جم　　رزم میں اوستاد رستم و سام

قیصر و جم اوسکے مہمان اور وہ میزبان ہے یہ اوسکی بزم آرائی ہے اور رزم و معرکہ میں رستم پہلتن اور سام نریمان کا اُستاد ہے۔

اے ترا لطف زندگی افزا　　اے ترا عہد فرخی فرجام

یہان سے مدح سے خطاب کی طرف گریز کیا ہے۔ یعنی اے وہ شخص کہ تیری مہربانی سے زندگی بڑھتی ہے اور تیرا زمانہ ایک مبارک زمانہ ہے۔

چشم بد دور خسروانہ شکوہ　　لوحش اللہ عارفانہ کلام

تیری سیاست شاہانہ ہے اور ماشاءاللہ تیرا کلام عارفانہ کلام ہے۔

جان نثارون میں ترے قیصر روم　　جرعہ خوارون میں تیرے مرشد جام

قیصر روم ایسے عالی مرتبت تیری جان نثارون میں ہیں اور مولانا جامی ایسے تصوف اور معرفت میں تجھسے فیض حاصل کرتے ہیں

وارث ملک جانتے ہیں سب تجھے　　ایرج و تور و خسرو و بہرام

ایرج اور تور اور خسرو اور بہرام جو بڑے عالیشان بادشاہ ہوگذرے ہیں تجھے تخت و تاج کا صحیح وارث سمجھتے ہیں۔

زور بازو میں مانتے ہیں تجھے　　گیو و گودرز و بیژن و رہام

گیو و گودرز و بیژن اور رہام جیسے پہلتن پہلوان تیرے زور بازو کو مانتے ہیں اور اُسکے قائل ہیں۔

مرحبا موشگافی ناوک　　آفریں آبداری صمصام

تیرے ناوک کی موشگافی کا کیا کہنا اور تیری تیغ کی آبداری کی کیا بات ہے۔

تیر کو تیرے تیر غیر ہدف　　تیغ کو تیری تیغ خصم

تیرا تیر غیر کے تیر کو بیندھ کر گذر جاتا ہے اور تیری تلوار دشمن کی تلوار کو کاٹ دیتی ہے یہ لف و نشر مرتب بھی ہے۔

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند — برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیل گران جسد کی صدا — تیرے رخش سبک عنان کا خرام

تیرے تناور اور بڑے ہاتھی کی آواز نے رعد کا دم بند کر رکھا ہے اور تیرے گھوڑے کی چال برق کو آہستہ چلنے کا الزام دے رہی ہے۔ لف و نشر مرتب ہے اور اس انداز بیان کی تعریف غیر ممکن ہے۔

فن صورت گری میں تیرا گرز — گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اسکے مضروب کے سر و تن سے — کیوں نمایاں ہو صورت ادغام

اگر تیرا گرز گراں فن تصویر کشی میں قدرت نہیں رکھتا تو کیا وجہ ہے کہ اُسکے مضروب کے سر و جسم سے صورت ادغام ظاہر ہونے لگتی ہے۔ دونوں شعر وست و گریبان ہیں۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہائے لیالی و ایام

جب ازل میں دن رات کے صفحہ مرتب ہوئے جب دن رات پیدا کئے گئے یعنی جب دنیا پیدا ہوئی۔

اور ان اوراق میں بہ کلک قضا — مجملاً مندرج ہوئے احکام

اور ان صفحوں میں بہ طریق مجمل کلک قضا نے احکام لکھے۔

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش — لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

معشوقوں کے لیئے یہ حکم لکھا گیا کہ یہ عاشقوں کا خون کیا کرینگے۔ اور عاشقوں کی

تقدیر میں یہ رقم ہوا کہ انکی زندگی نصیب دشمناں ہوگی۔

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں　　گنبدِ تیز گرد نیلی فام

آسماں کو یہ حکم ہوا کہ اسکو سب گنبد تیز گرد نیلی فام کہیں گے۔

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں　　خال کو دانہ اور زلف کو دام

یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ خال کو دانہ اور زلف کو دام لکھیں گے۔

آتش و آب و باد و خاک نے لی　　وضعِ سوز و نم و رم و آرام

آگ کو جلنے اور پانی کو نمی اور خاک کو آرام اور ہوا کو رم کی خاصتیں عطا ہوئیں۔

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز　　ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

آفتاب کو خسروِ روز اور ماہ تاباں کو شحنۂ شام کا خطاب دیا گیا۔

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی　　دی بدستور صورتِ ارقام

حسبِ دستور تیرے فرمانِ سلطنت کے لئے بھی حکم لکھا گیا۔

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم　　اس رقم کو دیا طرازِ دوام

کاتب قضا نے بموجب حکم کاتب تقدیر اقسامِ ازل اس پر ہمیشگی کا طغرا بنا دیا۔
کہ یہ دائمی رہیگی۔

ہے ازل سے روانیِ آغاز　　ہو ابد تک رسائیِ انجام

یہ ازل سے جاری ہے اور خدا کرے کہ ابد تک اسکے انجام کی رسائی ہو۔

مصنف کا یہ قصیدہ زبان تمہید تشبیب وغیرہ کے لحاظ سے ایسا ہے کہ انکے معاصرین میں کسی کے یہاں شاید نہ نکلے گا۔ اردو شاعری کے لئے مایہ ناز اور خلعت فخر مصنف ہے۔

صبحدم دروازۂ خاور کھلا مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

صبح کے وقت مشرق کا دروازہ کھلا یعنی صبح ہوئی - اور جہاں سے سورج نکلتا ہے وہ منظر صاف ہوگیا -

خسروِ انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

رات کو موتیوں کا خزانہ کھلا ہوا تھا یعنی ستارے نکل رہے تھے اون کو سلطان خاور یعنی آفتاب نے خرچ کر ڈالا - یعنی ستارے چھپ گئے -

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

صبح کو یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ وہ مہ و اختر جو رات کو آسمان پر معلوم ہوتے تھے دراصل کچھ نہ تھے اک سیمیائی نمود تھی سیمیا ایک فن ہے جس سے کچھ چیزیں جنکا وجود کچھ نہو نظر آنے لگیں - اور وہ شکلیں عجیب و غریب ہوں -

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

یہ ستارے اصل میں تو کچھ ہیں اور کچھ کے کچھ دکھائی دیتے ہیں - گویا یہ بازیگر ہیں جو کھلا دھوکہ دیتے ہیں یعنی یہ بہت نورانی معلوم ہوتے ہیں مگر اصل میں ایسے نہیں ہیں -

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

یعنی رات سطحِ آسمان پر ان کی چمک دمک ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے موتیوں کا زیور کھلا پڑا ہوتا ہے اور اسکی چمک دمک آدمی کو حیران اور بصارت کو ماند کر دیتی ہے -

صبح آیا جانبِ مشرق نظر اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا

صبح کو ایک معشوق آتشیں رخسار سر کھلا ہوا مشرق کی جانب دکھائی دیا -

تھی نظر بندی کیا جب رد سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

مگر نہیں وہ ایک دہوکہ ہوا اور ہمنے سمجھ لیا کہ یہ کوئی معشوق نہیں ہے یہاں جادو کا کارخانہ ہے لہذا کچھ اسمائے رد سحر پڑھے تو وہ صورت بدلی اور معلوم ہوا کہ یہ شراب سرخ کا بھرا ہوا پیالہ ہے۔

لاکے ساقی نے صبوحی کے لئے — رکھدیا ہے ایک جام زر کھلا

صبوحی وہ شراب جو دفع خمار کے لیئے صبح کو پیتے ہیں یعنی ساقی نے صبوحی کے لئے ایک جام زر شراب سے بھرکر رکھدیا ہے گویا یہ تیسرا دہوکہ ہوا پہلے معشوق آتشین رخسار دوسری بار ساغر پُر از بادہ سرخ تیسری بار ساغر زر۔

بزم سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

یعنی جب صبح ہوئی تو بزم سلطانی آراستہ ہوئی اور دربار شاہی کا دروازہ کھل گیا۔

تاج زریں مہر تاباں سے سوا — خسرو آفاق کے منھ پر کھلا

شاہ جمجاہ کے سر پہ تاج نے ایسی زینت دی کہ آفتاب عالمتاب بھی ایسا نہیں معلوم ہوتا

شاہ روشندل بہادر شہ کہ ہے — راز ہستی اس پہ سرتاسر کھلا

اور وہ بادشاہ کون ہے شاہ روشندل بہادر شاہ جسکے ضمیر روشن پر اسرار جہاں کھلے ہوئے ہیں۔

وہ کہ جسکی صورت تکوین میں — مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جسکے پیدا ہونے کے سبب سے نو آسمانوں اور ساتوں سیاروں کے پیدا ہونے کا مطلب ظاہر ہوگیا یعنی یہ سب اسی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔
اسمیں بھی فارسی ترکیب میں اعلان نون ہے مصنف کے عندیہ میں یہ جائز ہے

اور غالباً زمانۂ غالب تک اس سے بہت کم لوگ پرہیز کرتے تھے اسی لئے مصنف نے بھی کئی جگہ بے پروائی کے ساتھ لکھا ہے چونکہ نظم صاحب نے جابجا لکھا ہے کہ ناجائز ہے لہذا ہم اپنے قول کی تائید میں کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں اتفاق سے پہلے شعر میں دو باتیں جن دو تو نیز نظم صاحب کے اعتراض ہیں ایک اعلان نون۔

دوسرے تیسر جنکی نسبت مولانا نے لکھا ہے کہ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

جرأت — کیا لڑکپن کا ہی عالم اس بت نادان کا / بھولی بھولی صورت اور تیسرہ بالا کان کا

دبیر — صاحب دین محب شہ دلگیر ہے یہ / روح حیدر کی قسم عاشق شبیر ہے یہ

انشا — لالہ مراد شمن ہی اجی اسپہ نہ کیجیے / کرد یجئے کسی مرد مسلماں پہ چھٹی

انشا — انشا کو معافی ہوئی ہی باغ جناں کی / حاضر ہی یہ لیجیئے شہ مردان کی چھٹی

ظفر — نہیں عشق عزیزوں سے سرخرو ہر گز / ہوئے ہیں ایسے لہو زیر آسمان سفید

ظفر — روز گھر غیروں کے رہنا تجھے یہاں طریق / یہ بھی کوئی ہی بھلا ای بت نادان طریق

وفا — کاہن تمام تابع فرمان ہو گئے / دفتر منجموں کے پریشان ہو گئے

قلندر — ذوق سے نوشی گلشن ہی سنجانوں کسکو / کف تمکین میں نرگس کے طلائی ہی ایاغ

وہ کہ جسکے ناخن تاویل سے — عقدۂ احکام پیغمبر کھلا

احکام گویا عقدے ہیں اور ادن کی تاویل ناخن ہیں۔ گویا انھوں نے احکام رسول کی تفسیریں کی ہیں۔

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اُسکے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

دارا باوجودیکہ بڑا بادشاہ تھا۔ مگر اُسکے سپاہیوں کی فہرست میں پہلے دارا ہی کا نام لکھا ہوا ہے۔

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہی چہرۂ قیصر کھلا

اُسکے روشناسوں کی فہرست میں قیصر کا نام بھی ہے۔ نظم صاحب لکھتے ہیں کہ دونوں شعروں میں دارا و قیصر کی تخصیص بیجا ہے۔ معلوم نہیں اسکی بیت

کیا قباحت ہے اگر ایک نکرہ اور ایک معرفہ لکھا تو کیا گناہ مراد مبالغہ جاہ و حشم سے ہے سو وہ ہر حال میں موجود ہے۔

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب تو کہے بتخانۂ آذر کھلا

بادشاہ کے گھوڑے میں یہ خوبی ہے کہ جب وہ تھان سے کھلا اور سرگرمِ خرام ہوا تو اُس کے نقشِ پا سے ایسی ایسی دلفریب صورتیں بنیں گویا بت خانہ آذر کھل گیا۔

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

بادشاہ کے تربیت کے فیض سے مجھے سورج چاند محور وغیرہ کا حال معلوم ہو گیا۔ اور ان کے حقائق تک میں پہونچ سکا محور ایک لکیر ہے کہ قطبین کے کرہ کے درمیان میں ہے۔

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک میری حدِ وسع سے باہر کھلا

دل میں لاکھ عقدے تھے اور ہر ایک اُنمیں سے ایسا تھا کہ میرے کھولے کھل نہ سکتا تھا مگر اوسکے فیض سے ہر ایک کھل گیا۔

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید کسنے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

میرا دل ایک قفل بے کلید تھا۔ مگر اب وہ کھل گیا نہیں معلوم کسنے کھولا۔ اور یہ کب کھلا اور کیونکر کھلا۔

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

اگر حضورِ پرنور نے مجھ سے بے تکلفی کا برتاؤ کیا تو میں باغِ معنی کی بہار اور شاعری کا لطف دکھادوں گا۔

ہو جہاں گرم غزل خوانی نفس   لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

جس وقت میں غزل پڑھنی شروع کروں گا تو لوگوں کو گمان ہوگا کہ کہیں عنبر کا ڈبہ کھلا ہے
نفس سانس کو کہتے ہیں یہاں یہی مراد ہے یعنی اُس نفس غزل خواں سے خوشبوئیں نکلیں گی۔

(غزل)

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا   کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہائے گوشۂ قفس میں اس طرح سے پر کھلا ہوا بیٹھا رہوں کاش پر کھلے تھے تو قفس کا دروازہ
بھی کھلا ہوتا ورنہ اس حالت میں یہ کھلے ہوئے پر اور ستم کرتے ہیں۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے   یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

اس شعر سے دو معنی نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ مصنف کہتا ہے۔ یار کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر
جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یوں تو گویا ہر ایک آدمی جا سکتا ہے نہیں لطف تو جب ہے کہ دوسروں کے
بند رہے اگر کھلے تو صرف ہمارے واسطے کھلے۔

دوسرے یہ کہ ہمکو اتنی تاب کہاں ہے کہ ہم دروازہ پر دستک دیں تب دروازہ کھلے
یوں وہاں کون جائے ہم تو اس صورت سے جا سکتے ہیں کہ دروازہ کھلا ہوا پائیں۔

ہمکو ہی اس رازداری پر گھمنڈ   دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

ہم بھی کیا سادہ لوح ہیں اتنی سی رازداری پر ہمکو ناز ہے کہ دشمن پر دوست کا راز
کھلا ہوا ہے یعنی یہ ہم کسی سے نہیں کہتے اور اس سے خوش ہیں۔

واقعی دلبر بھلا لگتا تھا داغ   زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

داغ دلبر واقعی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب داغ نہیں ہے اب زخم ہے اور یہ اس سے
بھی بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بہت خوب شعر کہا۔ ہے حسن ردیف قابل دید ہے۔

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان   کب کمر سے غمزہ خنجر کھلا

یعنی اوسکی ابرو کمان ہی نہیں ہے بلکہ کماندار اور غمزہ خنجر ہی نہیں خنجر گداز ہے اور کبھی ان دونوں نے اپنے کام سے غفلت نہیں کی۔

مفت کا کسکو بُرا ہے بدرقہ　　رہبری میں پردۂ رہبر کھلا

یعنی رہبر کی ناواقفی کا حال ہم پر کھل گیا اور ہم سمجھ گئے کہ یہ ہماری منزل تک ہمکو نہیں پہونچا سکتا مگر مفت کا ساتھی کیا بُرا ہے۔

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک　　آگ بھڑکی مینھ اگر دم بھر کھلا

بارانِ اشک کچھ نہ کچھ دلمیں ٹھنڈک پیدا ضرور کرتا ہے مگر اسکو کیا کرے کہ دم بھر مینھ تھمتا ہے تو سوزِ دل سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ　　رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

کیا حسرت کا نقشہ کھینچا ہے کہ جسکی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ یعنی ہزاروں آرزوں لاکھوں تمناؤں کے بعد خط آیا مگر ساتھ ساتھ پیغامِ مرگ بھی آگیا اور خط پڑھنے بھی نہ پائے کہ مرگئے اور خط چھاتی پر کھلا رہ گیا۔

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی　　ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

دیکھنا غالب سے کوئی الجھ نہ بیٹھنا وہ ظاہر میں تو کافر ہے مگر دراصل ولی ہے۔ اور یہ دونوں صفات اوسمیں موجود ہیں پوشیدہ اور ظاہر میں خاص لطف ہے۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال　　پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

یعنی غزل لکھنے کے بعد مدح کا خیال آیا اور اشعار تاباں مثل مہ و خورشید میرے قلم سے نکلے۔

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد　　بادباں بھی اُٹھتے ہی لنگر کھلا

ادہر قلم اٹھایا اودہر طبیعت نے اوسکی مدد کی بسبب بادباں اٹھتے ہی لنگر کھولدیا چونکہ کشتی میں بھی روانی ہوتی ہے اور طبیعت میں بھی روانی پائی جاتی ہے لہذا یہ الفاظ جمع کر دیئے گئے

مدح سے ممدوح کے دیکھے شکوہ یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

جیسے عرض بغیر جوہر کے نہیں پایا جاتا ایسے ہی بغیر ممدوح مدح نہیں پائی جاتی کہتا ہے کہ عرض جوہر سے زینت پذیر ہوتا ہے لیکن مدح نے ممدوح کے شکوہ کو بڑھا دیا گویا عرض جوہر سے بڑھ گیا۔

مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا بادشہ کا رایت لشکر کھلا

بادشاہ کا یہ رعب داب ہے کہ اسکے رایت لشکر کو دیکھ کر سورج کانپ اٹھا اور آسمان چکر کھا گیا۔

بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علوئے پایۂ منبر کھلا

یعنے منبر کے رتبہ کا یہ سبب ہے کہ خطیب بادشاہ کا خطبہ پڑھنے کی حالت میں اوسپر کھڑا ہو کر بادشاہ کا نام لیتا ہے۔

سکّہ شہ کا ہوا ہے روشناس اب عیار آبروئے زر کھلا

جو زر یہ بادشاہ کا سکہ ہے یہ اوسکی آبرو کا سبب ہے لفظ عیار ایک نگینہ ہے اور روشناس ایک موتی قدرداں جوہری سمجھ سکتے ہیں۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب مآل سعی اسکندر کھلا

سکندر نے جو آئینہ کی ایجاد میں زحمت اٹھائی تھی اوسکا نتیجہ اب معلوم ہوا ہے کہ اوس آئینہ کو بادشاہ دیکھتے ہیں۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغرل و سنجر کھلا

طغرل اور سنجر نے فریب سے بادشاہت کی تھی ورنہ در اصل وارث تخت و تاج میرا

ممدوح ہے یہ نہیں سمجھے اب سب کو انکا فریب معلوم ہوگیا۔

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے　　　دفتر مدح جہاں داور کھلا

مجھسے اوسکی مدح کیا ہوسکتی ہے۔ دفتر مدح جہاں داور خالی ایک نام ہے کھلا اس میں محض کے معنے میں استعمال کیا گیا ہے جو اگرچہ بعض جگہ بولتے ہیں مگر کچھ غیر مانوس سا ہے

فکر اچھی پر ستایش نا تمام　　　عجز اعجاز سخن گستر کھلا

فکر مدح گستری میں اگرچہ سخنور نے اعجاز سے کام لیا۔ مگر اوسکی مدح بے پایان ہے پھر بھی ناتمام رہی۔

جانتا ہوں ہے خط لوح ازل　　　تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

مجھے یہ معلوم ہے کہ اے خاقان نام آور تمھیں تحریر لوح ازل کا حال سر بسر معلوم ہے لہذا مجھے عرض حال کی ضرورت نہیں ہے۔

تم کرو صاحبقرانی جب تلک　　　ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

آپ تا قیامت صاحب قران رہیں صاحبقران بادشاہ عظیم الشان فاتح جلیل سے مراد ہے۔ اور اصطلاح اہل نجوم میں اوسکو صاحبقراں کہتے ہیں کہ جسکی سال ولادت میں زحل اور مشتری کا قران عظمےٰ ہوا ہو واضح ہو کہ ایسا قران مدتوں میں واقع ہوتا ہے اور جسکی ولادت کے وقت زہرہ اور مشتری کا قران ہوتا ہے وہ صاحبقراں بادشاہ ہوتا ہے۔

در صفت انبہ

ہاں دل دردمند زمزمہ ساز　　　کیوں نہ کھولے در خزانہ راز

ہاں دل دردمند زمزمہ ساز تو خزانہ راز کا دروازہ کیوں نہیں کھولتا۔ نظم صاحب نے لکھا ہے کہ تو حذف کر دیا ہے مگر یہ بڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ اس طرح

زیادہ بولتے ہیں کہ یہ کام کیوں نہ کرے اور تو کے ساتھ کم۔

خامہ کا صفحہ پہ رواں ہونا شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا

خامہ جو صفحہ پر چلتا ہے اور اس سے الفاظ لکھے جاتے ہیں وہ گویا شاخ گل ہے جس سے پھول جھڑتے ہیں۔

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

اول تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا لکھوں۔ کچھ خرد افزا نکتے لکھ۔

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

کچھ ایسے مضامین لکھ جن میں آموں کا بیان ہو اور اس بیان شیریں کے اثر سے خامہ سے بھی شیریں مضامین نکلنے لگیں۔

آم کا کون مردِ میداں ہے ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

مگر آم کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ ورنہ ہمیں "گو" ہمیں "چوگاں" جو چاہے آئے مقابلہ کرے ثمر کو گو۔ اور شاخ کو چوگاں سے تشبیہ دی ہے۔

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں آئے یہ گوئے اور یہ چوگاں

تاک اپنے دل میں ارماں کیوں رکھے آئے اور مقابلہ کرے تاک بمعنے انگور کی بیل۔

آم کے آگے پیش جائے خاک پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

مگر تاک کیا آم کا مقابلہ کر سکتا ہے اور کیا اس کا بس چل سکتا ہے۔ اسی سے جل کر اسکے دل میں پھپھولے پڑ گئے ہیں انگور کی تشبیہ پھپھولوں سے تشبیہ تام اور بے مثل ہے ممکن ہے کہ اردو شاعری میں اسکا جواب نہ نکلے۔

نہ چلا جب کسی طرح مقدور　　بادۂ ناب بن گیا انگور

جب اور کسی طرح اس کا بس نہ چلا تو اسنے اپنے جلے پھپھولے اسطرح پھوڑے کہ شراب بن گیا۔

یہ بھی ناچارجی کا کھونا ہے　　شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مگر یہ مقابلہ بھی کوئی مقابلہ ہے یہ تو مجبوری درجہ اپنی جان کھو دینا۔ اور شرم سے پانی ہو جانا ہے سبحان اللہ سبحان اللہ کے سوا ان کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

مجھسے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے　　آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نظم صاحب نے گنّے کو آم سے مقابلہ کرنا۔ ایک ذلیل مضمون لکھا ہے۔ اور صرف اسکی وجہ اور باعث اگلے شعر کے مضمون کو لکھا ہے مگر اسکا سبب یہ نہیں ہے بلکہ اسکی وجہ وجیہ یہ ہے کہ عوام اور دوسرے ملک کے لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستاں میں دو میوے یا دو چیزیں ایسی پیدا ہوتی ہیں جو نئی ہیں اور دوسری جگہ نہیں ہوتیں۔ ایک آم۔ دوسرے گنا۔ گنّے کے ذکر کی یہی وجہ مصنف کے ذہن میں تھی جیساکہ سیاق کلام سے بھی ظاہر ہے کہ کہتا ہے تم کیا جانو گنّے اور آم کا کیا مقابلہ مجھسے سنو۔

نہ گل اسمیں نہ شاخ و برگ و بار　　جب خزاں آئے تب ہو اسکی بہار

گنّے میں نہ پھول نہ پتے نہ ہری ہری شاخیں نہ پھل۔ اور اسیطرح یہ کہ دنیا بھر میں خزاں ہوتی ہے اور اسکی بہار۔ موسم سرما میں گنّے کی بہار ہوتی ہے اور وہ خزاں کا زمانہ ہے۔

اور دوڑائیے قیاس کہاں　　جان شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

اور اسکی تعریف کے لئے کیا کہا جائے بس یہ سمجھ لیجیے کہ جان اگرچہ شیریں ہے مگر اسمیں بھی یہ مٹھاس نہیں ہے۔

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی   کوہکن باوجود غمگینی

اگر جان شیریں میں یہ مٹھاس ہوتی تو کوہ کن باوجود اسکے کہ غم میں تھا اور حالت غمگینی میں جان دینا آسان ہے۔

جان دینے میں اسکو یکتا جان   پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ کوہکن جان دینے سے جی چراتا تھا۔ نہیں جان دینے میں تو وہ یکتا اور بے مثل تھا۔ مگر پھر بھی اس شیرینی کے لالچ سے اس آسانی سے جان نہ دے سکتا۔ (جان دینے میں اسکو یکتا جان) یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر   کہ دواخانۂ ازل میں مگر

مجھے اس ثمر کی نسبت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ازل کے دواخانہ میں۔ یہ ایک شربت بنایا گیا ہے۔

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام   شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

اور اس شربت کو آتش گل کی آنچ دی گئی ہے اور قوام میں جو تار بندھا ہے اس کا نام ریشہ رکھا گیا ہے۔

یا یہ ہوگا کہ فرط رافت سے   باغبانوں نے باغ جنت سے

انگبیں کے بحکم رب الناس   بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا یہ ہوگا کہ بحکم خدائے عزوجل باغبانان جنت نے جنت سے یہ شہد کے گلاس بھر کر دنیا میں بھیجے ہیں اور ان پر مہر لگا دی ہے جو ڈنٹھل سے مراد ہے۔

یا لگا کر خضر نے شاخ نبات   مدتوں تک دیا ہے آب حیات

یا یہ بھی نہ ہو یوں ہو کہ خضر نے شاخ لگائی ہو اور مدتوں اس کو آب حیات دیا ہو۔

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل　　ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

جب اسقدر محنت کی گئی تب کہیں یہ درخت پھل لایا ہے ورنہ بھلا ہمارا یہ منھ تھا کہ ہم یہ درخت لگاتے۔ اور پھل کھاتے۔ نخل عام درختوں کو کہتے ہیں۔

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس　　رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

خسرو پرویز کے پاس ایک ترنج زر تھا رنگ میں وہ زرد تو ضرور تھا مگر اس میں بو باس نہ تھی۔

آم کو دیکھتا اگر اک بار　　پھینک دیتا طلائے دست افشار

اگر خسرو آم کو دیکھ لیتا تو اس ترنج کو پھینک دیتا۔ طلائے دست افشار خالص سونے کو کہتے ہیں اور چونکہ وہ ترنج ہاتھ سے دبانے سے دب جاتا تھا اسی واسطے اسکو طلائے دست افشار کہا گیا ہے۔

رونق کارگاہ برگ و نوا　　نازش دودمان آب و ہوا

کارگاہ برگ و نوا سے مراد درخت ہے۔ یعنی درختوں کی رونق۔ اور خاندان آب و ہوا کے لئے مایہ ناز آب و ہوا سے فصل بہار بھی مراد ہو سکتی ہے۔ یا (دودمان آب و ہوا) باغ۔

رہرو راہ خلد کا توشہ　　طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

چونکہ ایک جگہ آم کو شہد جنت کہہ چکے ہیں اسواسطے رہرو راہ خلد کا توشہ کہا گیا۔ ایک حدیث ہے کہ جس پیٹ میں کلونجی اور شہد جا پہنچے اوسمیں آگ دوزخ کی نہ پہونچے گی۔ اسی لئے نزع کی حالت میں شہد چٹاتے ہیں۔ اور اس کا شربت وغیرہ دیتے ہیں۔ آم کے درخت کو طوبیٰ اور سدرہ کہا ہے۔

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم   نازپروردۂ بہار ہے آم

درخت آم کا صاحبِ برگ و بار ہے اور آم بہار کا نازپروردہ ہے۔

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو   نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

اور خاصکر اوس آم کا کیا کہنا جو ہر جگہ دستیاب نہ ہو اور بادشاہی باغ کا ہو۔

وہ کہ ہے والئِ ولایتِ عہد   عدل سے اُسکے ہے حمایتِ عہد

اور بادشاہ بھی کون بادشاہ جو بادشاہ ولایت عہد و بیان ہے اور جو زمانہ کا حامی ہے

فخرِ دین عزِ شان و جاہ و جلال   زینتِ طینت و جمال و کمال

دین کے لئے باعث فخر و شان کے لئے عزت و جاہ و جلال علو پایہ کا نشان طینت کے لئے زینت اور کمال کے لئے خوبصورتی اور جمال ہیں۔

کارفرمائے دین و دولت و بخت   چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

دین دولت و بخت کا حکمران تاج اور مسند اور تخت کے لئے زینت بخشنے والا ہے۔

سایہ اوسکا ہما کا سایہ ہے   خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اوسکا سایہ سایۂ ہما ہے گویا ہر شخص اُسکے زمانہ میں بادشاہ وقت ہے اوسکی مہربانی خدا کی مہربانی ہے کیونکہ وہ ظل اللہ ہے۔

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور   جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اسے نور اور سایہ کے فیض پہنچانے والے یعنی بخشنے والے جب تک کہ دنیا میں سایہ اور نور کا وجود ہے۔

اس خداوند بندہ پرور کو وارث گنج و تخت و افسر کو

اس وقت تک اس آقائے بندہ پرور و غلام نواز وارث تخت و تاج کو۔

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو اور غالب پہ مہرباں رکھیو

پہلے مصرعہ میں جو الفاظ ہیں وہ سب ہم معنی ہیں۔ مگر ذرا ذرا سے تصرف سے لطف پیدا ہو گیا ہے لے خدا اسکو خوش رکھنا اور مجھ پر مہرباں رکھنا۔

قطعہ

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر اے جہاندار کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

اے وہ بادشاہ کہ تیرا دیکھنا گویا تیرے علو مرتبت کے آسماں کے دیکھنے کے برابر ہے۔ اور تیرا شبیہ و نظیر پیدا نہیں ہوا۔ اے جہاندار تیرا شیوہ کرم گستری ہے۔ اور تو اس میں بے شبہ و عدیل ہے۔

پاؤں سے تیرے ملے فرق ارادت اورنگ فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل

تیرے پاؤں سے تخت اپنے سر کو ملتا ہے اور تیرے سر سے تاج کسب سعادت کرتا ہے چونکہ تخت پاؤں کے نیچے ہوتا ہے اسلیے پہلے مصرعہ میں فرق ملنا کہا گیا۔

تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

تیرے انداز سخن سے زلف الہام میں شانہ ہوتا ہے یعنی الہام کی باتیں کھل جاتی ہیں۔ تیرے قلم کی جنبش گویا جبرئیل کے پر کی جنبش ہے جس سے الہامی باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قرب کلیم تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذل خلیل

تیرے قرب خداوندی کے دیکھنے سے گویا دنیا نے وہ رابطہ جو کلیم اللہ کو خداوند کریم سے تھا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تیری مہمان نوازی نے دنیا میں مائدہ خلیل کی حالت پیدا کر دی۔

بہ سخن اوج دہ مرتبہ معنی و لفظ   بکرم داغ نہ ناصیہ قلزم و نیل

سخنوری میں تیری یہ کیفیت ہے کہ معنی اور لفظ کا تو نے مرتبہ بلند کر دیا۔ اور کرم میں تیری یہ حالت ہے کہ دریائے نیل اور قلزم کے ماتھے پر بخل کا داغ لگا دیا۔ یا ان کو غلام بنا لیا یعنی ان کا کرم تیرے مقابلے میں ہیچ ہے۔

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر   تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے باہر جانا   زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

اس لئے کہ تیرے وقت میں عیش و طرب کی زیادتی اور رنج و الم کی کمی ہو۔ ماہ نے برج ثور کو باہر جانا اور زہرہ نے حوت سے پھر جانا چھوڑ دیا اور وہیں قیام کر لیا۔ اور جب یہ دونوں ستارے ان برجوں میں آتے ہیں عیش و طرب کی زیادتی رہتی ہے

تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہین   تیری بخشش مرے انجاح مقاصد کی کفیل

تیری دانشوری میری غلطیوں کی اصلاح اور تیری بخشش میری ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہے تقابل الفاظ سے جو لطف پیدا ہوا ہے وہ قابل داد ہی نہیں ہے بلکہ اظہار کرتا ہے کہ مصنف کو الفاظ پر کس قدر زبردست قدرت حاصل ہے۔

تیرا اقبال ترحم مرے جینے کی نوید   تیرا انداز تغافل مرے مرنے کی دلیل

تیرا رحم کرنا میرے واسطے نوید زندگی اور تیری غفلت میرے مر جانے کی دلیل ہے غفلت سے ناشنیدہ حال سے [illegible] مراد ہے۔

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں   چرخ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

میرے مقدر نے چاہا تھا کہ مجھکو امن نہ دے اور آسماں نے میری ذلت کا قصد کر لیا تھا

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ   پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

یعنی آسماں نے میرے ساتھ وہ دشمنی کرنی شروع کی ہے کہ میرے کسی کام میں گرہ لگا دی ہے پہلے میرے ناخن تدبیر کو بے کار کر دیا ہے کہ میں اوسکو کھول نہ سکوں۔

تپشِ دم نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم   کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

میرے دل کی تڑپ بغیر خوف کے باقی نہیں رہی ہے۔ میرے دل میں حرکت بغیر خوف عظیم کے ہوتی ہی نہیں اور میرا دم لینا بغیر امداد جرِ ثقیل مشکل ہے۔

انظر صاحب نے اسکے معنی یہ لکھے ہیں کہ دل کی تپش خوف عظیم سے خالی نہیں اور سانس کا لینا میرے لیے جرِ ثقیل سے کم نہیں۔

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی   غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

جیسے لقا کی ڈاڑھی میں موتی پرو دیے گئے تھے ایسے ہی مرا سینہ معانی کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے اور دنیا کے غموں سے میرا سینہ عمرو عیار کی زنبیل بن گیا ہے۔

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر   کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میری فکر سے اشارات کثیر مترشح ہوتے ہیں اگرچہ میرے قلم نے عبارت کم لکھی ہے اور گویا یہی میری عادت ہے۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح   میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

یعنی ایسا مبہم یا مختصر کلام کہتا ہوں کہ توضیح اس پر قربان ہوتی ہے میری مجمل بات سے تفصیل ٹپکتی ہے۔

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف — جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

اگر میری حالت اچھی ہوتی تو ابھی جس کام کے لئے تکلیف دی ہے تکلیف نہ دیتا اگر میں پریشان نہوتا تو جلدی نہ کرتا۔

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر — کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

اے قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی اور ذرہ پروری میں یہ دیر اور عقدہ کشائی میں اتنی ڈھیل چاہیے۔ عقدہ کشائی میں ڈھیل نہایت ہی اچھا ٹکڑا ہے جو تعریف سے بالا ہے۔

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

اب وہ زمانہ گیا کہ بغیر جانے بوجھے غیروں کی وفاداری کا حال آپ بیان کیا کرتے تھے اور ہم سنکر چپ ہو جاتے تھے۔

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ — قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

اب جب غیروں سے بگڑ گئی ہے تو آپ نے ہم سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ مگر یہ شرمندگی فضول ہے ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم یہ کبھی تو نہ کہیں گے کہ کیوں ہم نہ کہتے تھے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اے ہمنشیں کلکتہ کا تو نے کیا ذکر کیا میرے سینہ میں اک تیر مار دیا اور مجھے وہ باتیں یاد آ گئیں۔

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

وہ وہاں کے نزہت بھرے لہلہاتے ہوئے سبزے اور وہ وہاں کے خود آرا معشوق کہ بس ہائے ہائے۔

صبر آزما وہ انکی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ انکا اشارا کہ ہائے ہائے

ہائے ہائے وہ انکی صبر آزما نگاہیں کہ بس چشم بد دور اور وہ ان کے طاقت ربا اشارے

وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

وہ وہاں کے تازے اور شیریں میوے اور وہ وہاں کی شرابیں ۔ یہ سب سماں اسوقت آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

کلکتے میں اگرچہ مرزا کا ایک ترکیب فارسی کی وجہ سے وہاں کے لوگوں سے جھگڑا بھی ہو گیا تھا جسکی بدولت مرزا نے مثنوی باد مخالف لکھکر ان لوگوں سے دوستانہ معافی مانگی ہے اور ان لوگوں نے اس مثنوی کا بھی نام سنکر مذاق اڑایا تھا مگر ان سب صدموں پر بھی شاید انہیں کلکتے سے ایک غیر معمولی محبت ہو گئی تھی فارسی میں بھی کہتے ہیں ؎

خوشا روز و شب کلکتہ و عیش متقابلش
گور تر مہر و مگنا ان بہادر باہ تا بالش

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیے

مرزا نے اس قطعہ کی نسبت اردوئے معلیٰ میں لکھا ہے کہ مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھکر مجھ سے کہا کہ اسکی تشبیہات نظم کیجیے ۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھکر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لی۔

مطلب یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ پر رکھی ہوئی ہے لہذا جسقدر اس ڈلی کو اچھا کہیں صحیح ہے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

قلم حیراں ہے کہ اسے کیا لکھے اور زبان سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہے۔

مہر بازوئے عزیزاں گرامی لکھیے
حرز بازوئے شگرفاں خود آرا کہیے

اپنے عزیزوں کے خط کی مہر لکھدیں تو بیجا نہیں یا معشوقوں کے بازو کا تعویذ کہدیں۔

مسی آلودہ سر انگشت حسیناں لکھیے   داغ طرف جگر عاشق شیدا کہیے

معشوقوں کی مسی بھری پور لکھیے یا عاشق کے جگر کا داغ کہیے۔

خاتم دست سلیماں کے مشابہ لکھیے   سر پستان پری زاد سے مانا کہیے

خاتم دست سلیماں کا مشابہ ٹھہرائیے یا سر پستان پری زاد کہیے۔

اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے   خال مشکین رخ دلکش لیلا کہیے

یا قیس کا اختر سوختہ کہیے۔ یا رخ دلکش لیلا کا خال کہیے۔

حجر الاسود دیوار حرم کیجیے فرض   نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہیے

حجر الاسود وہ پتھر جسے کعبہ میں بوسہ دیتے ہیں لکھیے یا نافۂ بیابان ختن کہیے۔

وضع میں اس کو اگر سمجھیے قاف تریاق   رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے

اگر اس کو ہیئت کذائی ق تریاق کہیے تو رنگ میں مسیحا کا سبزۂ نوخیز کہدیجیے سمجھیے کی میم ساکن اچھی نہیں ہے۔

صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز   میکدہ میں اسے خشت خم صہبا کہیے

اگر میکدہ میں خشت خم صہبا ہے، تو عبادت خانہ میں مہر نماز ہے۔ یہ عابدوں کی سجدہ گاہ اور مستوں کا سنگ بالش۔ غرض دونوں جگہ برابر رتبہ ہے۔

کیوں اسے قفل در گنج محبت لکھیے   کیوں اسے نقطۂ پرکار تمنا کہیے

جسے دروازہ خزانہ محبت کا قفل کیوں کہیں اسے نقطۂ پرکار تمنا کیوں مانیں

کیوں اسے گوہر نایاب تصور کیجئے ۔۔۔ کیوں اسے مردمک دیدۂ عنقا کہئے

یہ کیا ضرورت ہی کہ اسے گوہر نایاب فرض کریں یا اسے مردمک دیدۂ عنقا کہیں -

کیوں اسے تکمۂ پیراہن لیلیٰ لکھئے ۔۔۔ کیوں اسے نقش پئے ناقۂ سلما کہئے

اسے پیراہن لیلا کا تکمہ کیوں لکھیں اور سلما - جو ایک عرب کی معشوقہ تھی اوسکے ناقہ کا نقش قدم کیوں ٹھہرائیں -

بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجئے فرض ۔۔۔ اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

یہ سب کچھ نہ ٹھہرایئے بس بہترین تشبیہ یہ ہے کہ آپ کے کف دست کو دل اور اس چکنی ڈلی کو سویدائے دل کہیں -

نہ پوچھ اسکی حقیقت حضور والا نے ۔۔۔ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر ۔۔۔ جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

حضور نے جو مجھے بیسن کی روغنی روٹی بھیجی ہے اسکے عزّ و افتخار کو نہ پوچھ اگر بجائے گیہوں کھانے کے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی کھاتے تو بہشت سے باہر نہ نکالے جاتے -
نہایت ہی خوب قطعہ کہا ہے -

منظور ہے گزارش احوال واقعی ۔۔۔ اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

مرزا جواں بخت جنکی ولیعہدی کے لئے بادشاہ خود کوشاں تھے ہیں موقعہ پر غالب مرحوم نے سہرا لکھکر نذر گزرانا جس کا مقطع یہ تھا -

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ۔۔۔ دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

مقطع نے بادشاہ کو شک میں ڈالدیا - سمجھے کہ غالب نے ذوق پر چوٹ کی ہے - شیخ ابراہیم ذوق کو سہرا دکھا کر دوسرا سہرا لکھوایا گیا - اور اس کے مقطع میں خصوصیت سے

مرزا کی طرف اشارا کیا ہے۔

جسکو دعوے ہو سخن کا یہ سنادو اسکو　　دیکھ اسطرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مشہور ہوا تو مقطع پر غالب کی بھی نظر پڑی اور یہ قطعہ بطریق معذرت کہکر بھیجا۔ کہ جو واقعہ ہے میں اسکا اظہار کرنا چاہتا ہوں اس سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ اپنا حسن طبیعت اور سخنوری کے جوہر دکھانے مقصود ہوں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

میرے باپ دادا ہمیشہ سے اہل سیف ہوئے ہیں مجھے شاعری سے کوئی عزت نہیں ملگئی ہے یا میں اسکو ذریعہ عزت بنانا نہیں چاہتا۔

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل　　ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

میں آزادہ رو ہوں اور آزادوں کو کبھی کسی سے عداوت نہیں ہوتی۔

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں　　مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

یہ بزرگی اور یہ عزت میرے لئے کیا کم ہے کہ ظفر کا غلام ہوں جاہ و منصب و ثروت نہیں ہے تو بلا سے نہو مجھے پروا نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسروں کو یہ سب باتیں حاصل تھیں

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

بادشاہ کے استاد سے مجھے لڑائی کا خیال ہو۔ بھلا غلام بادشاہ ہو کر میری مجال ہو سکتی ہے۔

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر　　سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

آپ کا دل خود ایک جام جہاں نما ہے آپ دیکھ لیجئے کہ کسی گواہ یا قسم کی ضرورت نہیں ہے جیسا میں ہوں آپ کو معلوم ہے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

کہاں میں اور کہاں اردو کی شاعری میری تو اس سے محض اتنی غرض ہے کہ حضور کی خوشی کرتا رہوں ورنہ میں تو ایک فارسی گو شاعر ہوں۔

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثال امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

محض حضور کے حکم سے یہ سہرا لکھ کر تعمیل فرمائش کی گئی ہے۔

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

مقطع میں محض ایک شاعرانہ تعلّی اور دعوے ہی ہیں مقطع سے قطع محبت میری غرض نہیں ہے۔

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

اگر میں نے کسی پر چوٹ کی ہو تو خدا میرا دین دنیا میں منھ کالا کرے اور میں کیوں ایسا کرتا کوئی میں سودائی ہوں مجھے جنون ہے وحشت ہے۔ کیا ہے۔

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

میری قسمت بری ہی مگر میری طبیعت کسی سے بری نہیں ہے اور اسکا شکر ہے کہ مجھے کسی سے اسکی شکایت نہیں ہے مصنف نے جن الفاظ سے معذرت کی ہے اونکی تعریف نہیں ہو سکتی تمام الفاظ سے خودداری کا پہلو نکلتا ہے شعر سے ظاہر ہے کہ کہنے والا بدرجہ مجبوری یہ سب کچھ کہہ رہا ہے ورنہ وہ دوسروں سے خود کو اچھا نہیں تو کم نہیں سمجھتا۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

غالب میں اپنے قول میں سچا ہوں خدا میرا گواہ ہے اور یہ بات میں سچ کہتا ہوں کیونکہ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہی نہیں ہے۔

یا یہ کہ میں سچ کہتا ہوں کیوں کہ مجھے جھوٹ کی عادت نہیں۔

خوش ہوا اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا

اے نصیب تجھے خوش ہونا چاہیے کہ آج تیرے سر سہرا ہے کیونکہ تو شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ رہا ہے اگرچہ مصنف نے (سر سہرا) محاورہ استعمال کیا ہے مگر یہ کمی رہی کہ کس چیز کا سر سہرا ہے۔ ذوق مرحوم نے اس محاورہ کو پورا پورا نظم کیا پھر بھی ایجاد کا غالب کے سر سہرا ہے کیونکہ ایک موجد اور مقلد میں جو فرق ہے اسے سب جانتے ہیں۔ ذوق۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن وسعادت کا ترے سر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

اس چاند سے مکھڑے پر یہ سہرا کیا اچھا معلوم ہوتا ہے گویا حسن دل افروز کے لئے سہرے نے زیور کا کام دیا اور سونے میں سہاگہ ہو گیا۔ زیور کا قافیہ غالب کا حصہ ہے ذوق مرحوم نے سہرے میں زیور کا قافیہ نہیں کہا مگر اسی مضمون کے کئی شعر کہے ہیں اور خوب کہے ہیں۔

وہ کہے صل علے یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ اختر سہرا
سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پہ سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

یعنی اے طرف کلاہ یہ تیرے لئے زیبا ہے کہ تو سر پر چڑھے مگر ڈر یہ ہے کہ سہرا تیری جگہ نہ لے لے یہ قافیہ بھی ذوق نے نہیں کہا۔

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

دوسرا مصرعہ دلیل ہے پہلے دعوے کی ذوق نے بھی یہی مضمون اس طرح لکھا ہے

ع آج وہ دن ہے کہ لائے در انجم سے فلک
کشتی زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا

یہ شعر غالب کے شعر سے یقیناً بڑھا ہوا ہے۔

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

دولہا کے رخ پر جو گرمی کی وجہ سے پسینہ ٹپک رہا ہے تو اُسکے قطرے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ موتی ہیں اس صورت میں سہرا ابر گہر بار بن گیا ہے ذوق مرحوم لکھتے ہیں -

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

یہ ایک بے ادبی تھی کہ قبا سے آگے بڑھ جائے سہرا اسواسطے قبا کی برابر آکر رہ گیا آگے نہ بڑھا غالب نے یہ قافیہ بہت کہا ہے + ذوق کے یہاں یہ قافیہ نہیں -

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

موتیوں کو اس بات پر اترانا نہ چاہیے کہ بس جو کچھ ہیں ہمیں ہیں نہیں بلکہ پھولوں کے سہرے کی بھی ضرورت ہے ذوق مرحوم

۵ بھرتی خوشبو سے ہوا اترائی ہوئی باد بہار اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

پھول خوشی کی وجہ سے پھولے نہیں سماتے پھر کوئی انکا سہرا کسطرح گوندھے ذوق

دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی گائیں مرغان نواسنج نہ کیونکر سہرا

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

ادھر رخ روشن چمک رہا ہے اور ادھر گوہر غلطاں پھر بھلا سہرے میں فروغ ماہ و اختر کیوں نہ پیدا ہو -

۶ وہ کہے صل علی یہ کہے سبحان اللہ دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار لائے گا تاب گرانباری گوہر سہرا

یہ ریشم کا تار نہیں ہے کہ گرانباری گوہر کی تاب ہی نہ لا سکے یہ رگ ابر بہار ہے جو اسکو سنبھال سکتا ہے ذوق کے یہاں تار کے دو شعر ہیں -

کثرت تار نظر سے ہیں تماشائیوں کے   دم نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

اور ایک وہ تار بارش والا شعر جو گذر چکا -

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں   دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

ہم غالب کے طرفدار نہیں ہیں سخن فہم ہیں دیکھیں الخ یعنی یہ سہرا لاجواب ہے -

ہ جسکو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اسکو   دیکھ اسطرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا   واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

اسمیں شاید ذوق مرحوم کا سہرا پورا نہیں لکھا جا سکا -

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے   تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

یعنی مجھے آپ سے جو اتنی عقیدت ہے وہ کیوں ہے اور ایسی آپ میں کیا بات ہے -

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے   رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے

یعنی تو ایسا ہے کہ اگر رونق بخشنی چاہے تو ماہ و مہر کی بزم کی تیری ذات سے رونق ہے -

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں   غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

اور برعکس اسکے میں ایسا ہوں کہ اگر خود پہ غور کروں تو مجھے خود سے خود نفرت ہو جاتی ہے یا ہو جائے اپنی اوقات سے نفرت ہونا فصیح ہے - اور میری اوقات سے مجھے نفرت ہونا غلط نہیں ہے -

خستگی کا ہو بھلا جسکے سبب سے سر دست   نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

چونکہ میں خستہ ہوں اور تو کریم ہے لہذا خدا خستگی کا بھلا کرے کہ مجھے اور تجھے

کیا نسبت ہے مگر تیرے دست کرم سے تو ضرور میرا تعلق ہے ۔

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں — یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

خدا کرے توسن دولت کی باگ ہمیشہ تیرے ہاتھ میں رہے ۔ بس رات دن یہ دعا مانگتا ہوں ۔
اگرچہ ہاتھ کا بغیرہ "ہے" کی بھی قافیہ بات وغیرہ سے کیا گیا ہے مگر اچھا نہیں ہے ۔

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا — گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

تو سکندر ہے اور میرا تجھ سے ملنے میں فخر ہے اگرچہ خضر کی ملاقات سے بھی مجھ کو شرف ہے
خضر سلطان بہادر شاہ مغفور کے فرزند کا نام ہے جو غالب سے حسن عقیدت رکھتے تھے ایک جگہ کہہ چکے ہیں ۔

ع خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

یہاں ایہام ہے ۔

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار — غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

تاکہ اس پر کوئی مکاری اور ریاکاری کا الزام نہ لگا سکے اسی لیے غالب نے خرابات نشینی اختیار کر لی

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو — رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

ممکن ہے کہ محرم کی عظمت و حرمت کی وجہ سے آخر ماہ صفر تک جناب مصنف شغل بادہ نوشی سے اجتناب کرتے ہوں ۔ اور اسی وجہ سے کہا ہو کہ چار شنبہ کو صفر کا مہینہ ختم ہو جائے گا چلو باغ میں شراب کی ناند بھر کر رکھ دیں ۔

جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست — سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

جو کوئی آئے وہ پئے اور مست ہو کر گلگشت کرتا پھرے ۔

غالب کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ — بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

غالب یہ کیا خرافات لکھ رہا ہے مجھے اب سوائے بادشاہ کی تعریف کے کوئی بات اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر و مہر و ماہ ماند

بادشاہ کے یہاں سونے کے چھلے بٹتے ہیں جنکے آگے چاند سورج وغیرہ ماند ہیں۔

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

یہ خیال کر لیجئے کہ یہ چھلے نہیں ہیں بلکہ چاند اور سورج درمیاں سے خالی کر دئے ہیں اور تقسیم ہو رہے ہیں سمجھئے ایک جگہ اور بھی بہ سکون میم لکھا ہے۔ یہ اگرچہ بفتح میم محاورۂ عوام میں داخل ہے مگر بسکون بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اور مصنف کا لکھ دینا ہی سند ہے اسکے علاوہ اس مصدر کے بہت سے صیغے بسکون میم ہیں۔

اے شاہ جہانگیر جہان بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

اے بادشاہ جہانگیر۔ اور کریم منتظم تجھے غیب سے سو طرح کی بشارت ہیں۔ مراد ہے امداد سے

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی باشارت

جو عقدۂ دشوار کسی طرح نہ کھلے تو اسکو اپنے اشارے سے کھول دیتا ہے۔

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

یعنی بغیر آب حیواں سے کلی کیے ہوئے خضر سوئے ادب سمجھکر تیرا نام نہیں لیتا۔

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزارت

آصف بن برخیا کو فخر تھا کہ میں سلیماں کا وزیر ہوں یعنی وزارت سلیماں باعث فخر تھی مگر یہاں جو تیرا وزیر ہے وہ فخر سلیماں ہے۔ یہ بھی پہلو نکلتا ہے کہ اگر سلیمان تیری وزارت کریں تو ان کے لئے یہ باعث فخر ثابت ہو۔

ہے نقش مریدی ترا فرمان الٰہی　　ہے داغ غلامی ترا توقیع امارت

تجھسے ارادت رکھنا گویا فرمانبرداریٔ خدائے عز و جل ہے۔ کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اُسکے رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے حاکم ہو اُسکی فرمانبرداری کرو۔ تیرا داغ غلامی امارت کا فرمان ہے۔ گویا جو تیرا غلام ہے وہ امیر الامرا ہے۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلان　　تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی　　باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت

اگر تو پانی سے طاقت سیلاں اور آگ سے حرارت دفع کر دے تو پانی میں روانی اور آگ میں گرمی کا نام بھی باقی نہ رہے۔ دیکھئے سیلان کا نون اگر اعلان نہ کریں تو بُرا معلوم ہوتا ہے۔

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل　　ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

اگرچہ میں مدح گستری اور شاعری میں کامل ہوں۔

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر　　قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت

اگرچہ میرا کچھ ستائش کا ارادہ تھا مگر عبارت تیری ستائش میں لکھی نہیں جاتی لہذا مدح کو دعا ہی پر ختم کرتا ہوں۔

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں　　نظارگیٔ صنعت حق اہل بصارت

آج نوروز کا دن ہے اور اسکی چہل دیکھنے سے خدا کی قدرت نظر آتی ہے اور دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں۔

تجھکو شرف مہر جہانتاب مبارک　　غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

تجھکو شرف آفتاب (یعنی آفتاب کا برج حمل میں جانا) جس کا اثر خوشی و خرمی ہے مبارک ہو

اور غالب کو تیری خدمت میں حاضری مبارک ہو دوسرے شرف مہر جہانتاب سے یہ بھی معنی لیئے جاسکتے ہیں کہ مثل آفتاب شرف مبارک ہو۔

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو　　　اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانیکو کچھ نہو　　　روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اگر کسی شخص کو افطار کی دست قدرت ہو تو اُسکے لئے یہ ضرور ہے کہ وہ روزہ رکھے مگر جس کسی کے پاس روزہ کھول سکے کچھ کھانے کے لئے نہو ایسا آدمی اگر روزہ نہ کھائے تو ناچار اور کیا کرے۔

بالکل اسی مضمون کی رباعی فارسی میں آتشکدہ آذر میں میں نے دیکھی تھی نہ جانے کسکی تھی صرف ایک مصرع یاد رہگیا ہے + اے روزہ برو ورنہ ترا خواہم خورد

اے شہنشاہ آسماں اورنگ　　　اے جہاندار آفتاب آثار

اے وہ بادشاہ کہ تیرا تخت مثل آسمان کے ہے اور تیری حکومت تمام عالم پر مثل آفتاب کے ہے اس شعر میں صنعت براعت الاستہلال مصنف نے مدنظر رکھی ہے۔ براعت الاستہلال اُسکو کہتے ہیں کہ جو کچھ کتاب یا قصیدہ وغیرہ میں مضمون لکھنا ہو وہ پہلے ہی مصرع یا فقرہ میں ادا کردیا جائے چونکہ اسمیں موسم سرما کی شکایت ہے لہذا پہلے ہی سے آفتاب لایا گیا ہے۔

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں　　　تھا میں اک دردمند سینہ فگار

میں ایک غریب گمنام گوشہ نشین اور دردمند غم والم ایام سے دل فگار تھا۔

تمنے مجھکو جو آبرو بخشی　　　ہوئی میری وہ گرمی بازار

اپنے ازراہ ذرہ نوازی مجھکو جو آبرو بخشی تو مجھے وہ فیض حاصل ہوا میری وہ گرمی بازاری ہوگئی۔

کہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز روشناسِ ثوابت و سیّار
کہ مجھ سے ذرۂ ناچیز کو ہر کوئی پہچاننے اور جاننے لگا ۔

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
اگرچہ بے ہنری کی شرم ہے میں اپنی نظر میں آپ اتنا ذلیل ہوں ۔

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
کہ اگر خود کو خاکی نہاد کہوں تو خاک کو بھی عار و ننگ آئے ۔

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں بادشہ کا غلام کار گزار
مگر پھر بھی میں اپنے دل میں اس بات پر خوش و مطمئن کہ حضور کا ایک کارگزار غلام ہوں ۔
اور یہ میرے منصب ہیں ۔

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
میں غلام خانہ زاد ہوں حضور سے ارادت رکھتا ہوں حضور کا مداح ہوں ۔ ہمیشہ
عرائض نویسی میرے متعلق رہی ۔

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
اسکے بعد میں نوکر بھی ہو گیا اور حضور سے چار نسبتیں ہو گئیں ۔

پیر و مرشد اگرچہ مجھکو نہیں ذوق آرائش سر و دستار
پیر و مرشد اگرچہ مجھے یہ شوق نہیں ہے کہ میں اپنے سر کو دستار سے آرائش
دوں مگر ۔

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر   تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

مگر پھر بھی موسم سرما کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے بچنے کی کوئی تدبیر تو چاہیئے۔

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش   جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

مجھے لباس کی ضرورت کیوں نہ پڑے اگرچہ میرا جسم نحیف ہے مگر پھر بھی جسم تو ہے۔

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال   کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار

میں نے اس سال میں کچھ نہیں بنایا۔ یعنی لباس سرمائی۔

رات کو آگ اور دن کو دھوپ   بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

رات کو آگ تاپ کر اور دن کو دھوپ کھا کر گذارہ کرتا ہوں ایسے لیل و نہار بھاڑ میں جائیں

آگ تاپے کہاں تلک انسان   دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

بھلا آگ تاپ کر اور دھوپ کھا کر کب تک گذر ہو سکتی ہے اور آدمی کب تک ایسا کر سکتا ہے

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی   وقنا ربنا عذاب النار

دھوپ کی تیزی اور آگ کی گرمی سے بس خدا بچائے۔ اس آیت نے حسن کلام اتنا بڑھا دیا ہے کہ جواب نہیں ہے۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے   اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

یہ نہیں ہے کہ حضور سے میری تنخواہ مقرر نہیں ہے نہیں ہے تو سہی مگر اُس کے ملنے کا عجب طریقہ ہے۔

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک   خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

ایک مردہ کی چھ ماہی ہے کہ دنیا کا اسی پر دار و مدار ہے۔ یعنی چھ ماہ میں ہوتی ہے۔

مجھکو دیکھو کہ ہوں بقید حیات ‏ اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

مجھکو دیکھئے تو زندہ ہوں اور چھ ماہی سال میں دو دفعہ ہوتی ہے۔ یعنی میں زندہ اور حالت اوروں کی سی ہے۔

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینہ قرض ‏ اور رہتی ہے سود کی تکرار

چونکہ اسیوجہ سے ہر مہینہ قرض لیتا ہوں اور سود در سود بڑھتا رہتا ہے۔

میری تنخواہ میں تہائی کا ‏ ہو گیا ہے شریک ساہوکار

اسی سبب سے میری تہائی تنخواہ کا مالک ساہوکار ہو جاتا ہے یعنی تہائی تنخواہ سود میں چلی جاتی ہے۔

آج مجھ سا نہیں زمانہ میں ‏ شاعر نغز گوئے خوش گفتار

آج مجھ سا شاعر معنی آفریں اور جدت پسند دنیا میں نہیں ہے۔

رزم کی داستان اگر سنئے ‏ ہے زباں میری تیغ جوہر دار

اگر لڑائی کی داستان مجھ سے سنئے تو میری زبان تیغ جوہر دار کا کام کرتی ہے اور

بزم کا التزام گر کیجئے ‏ ہے قلم میری ابر گوہر بار

اور اگر بزم کی داستان مجھ سے لکھوائیے تو میرا قلم ابر گوہر بار بنکر انجمن آرائی کرتا ہے قلم کو مصنف تذکیر و تانیث دونوں طرح جائز سمجھتے تھے۔ مگر اکثر کا مذہب تذکیر لکھتا ہے۔

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ‏ قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

اس حالت پر اگر مجھے دادِ سخن نہ دیجائے تو ظلم ہے اور مجھکو عزیز نہ رکھا جائے تو ستم ہے

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

اگر آپ غلام ہوکر ننگا پھروں اور آپکا نوکر ہوکر قرض کھاؤں تو افسوس ہے یہ آپکے لیئے بھی کسر شان کا باعث ہے۔

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

اس ششماہی تنخواہ ملنے نے جینے سے بیزار کر دیا ہے لہذا میری تنخواہ ماہ بماہ ملنے کا حکم کیجیئے کہ مجھے اپنی زندگی دشوار نہو جائے۔

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

مجھے شاعری سے کچھ مطلب نہیں یعنی شاعرانہ تصنع کو چھوڑ کر اس دعا پر اپنی عرض کو ختم کرتا ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یعنی آپ کی عمر اقبال و دولت ابد تک قائم رہے۔

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

میں تیرہ بخت ہوں جو شخص فتح و ظفر کی تمنا کرے اوسکو میرا نام نہ لینا چاہیئے۔

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

کیونکہ میں وہ بد نصیب کم بخت ہوں کہ مجھے کبھی کسی پر غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ میرا جو کوئی شریک ہوا وہ شریک غالب رہا۔ یعنی جب میرا شریک ہوا تو وہ شریک غالب ہوا اور شریک غالب وہ ہے کہ جسکا حصہ زیادہ ہو۔

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی — مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد — تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

یعنی مسہل لینا تو سہل تھا مگر یہ بڑی دشواری ہے اتنے روز میں کیونکر حاضر نہوں گا۔ کیونکہ تین روز منضج کے تین مسہل کے تین تبریدوں کے اور تین دن مسہل سے بعد کے یہ سب بارہ روز ہیں۔ بارہ روز کی رخصت طلب کی ہے۔

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر — کہ جسکے دیکھے سے سبکا ہوا ہے جی محظوظ

انجمن شادی میرزا کیا مبارک ہے کہ جسکے دیکھنے سے سب کو ایک لطف آیا ہے۔

ہوئی ہے ایسی ہی فرخندہ سال میں غالب — نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی محظوظ

ایسے ہی مبارک سال میں یہ شادی ہوئی ہے لہذا مادہ سال عیسوی محظوظ نکلا ہے جس سے سنہ ۱۸۵۴ء نکلتے ہیں۔

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزم طرب میں رقص ناہید

جب مرزا جعفر کی شادی ہوئی تو بزم میں رقاصۂ فلک یعنی زہرہ کا ناچ ہوا یہ مبالغہ ہے۔

کہا غالب سے تاریخ اسکی کیا ہے — تو بولا انشراح جشن جمشید

غالب سے اسکی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی تو انشراح جشن جمشید اسکی تاریخ نکالی سنہ ۱۲۷۰ھ نکلتے ہیں۔

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

اگرچہ یہ سب ایک ہی بادشاہ کے نوکر ہیں مگر آپس میں ایک دوسرے کو

رہتی ہے میرا دل سخت رنجیدہ ہوگیا ہے اور گویا یہ اس سے گلہ مند ہے مگر پھر بھی ہم اُسکے
جانتے ہیں زیادہ منے کچھ کہہ نہیں سکتے ۔ گویا اُسکے سامنے منھ بند ہوگیا ہے ۔

کانوراتے ہیں جی کے پسند ہوگیا ہی غالب ۔ دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالب

کیا مند کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں ۔ سونا سوگند ہوگیا ہے غالب

غالب دکھ میرے دلکو پسند ہوگیا ہے اور یہ اتنا گرفتہ ہوگیا ہے کہ گویا بند ہوگیا ہے یعنی
عاجز ہوگیا ہے ۔ رات کو نیند نہیں آتی گویا نیند بھی ہوگئی ہے ۔

رباعی کا دوسرا مصرعہ اکثر نسخوں میں رُک رُک کر بند ہوگیا الخ پایا جاتا ہے اور بہ
صورت میں دو رکن بڑھتے ہیں مگر غالب کی نسبت غیر موزوں کہنے کی جرأت نہیں ہوتی ۔
اور ہم اسکو سہو کاتب سمجھکر مصرع کو صحیح لکھنے کی جرأت کر گئے ہیں ۔

مشکل ہے زبس کلام میرا ایدل ۔ سُن سُن کے اُسے سخنوران کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۔ گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

چونکہ میرا کلام دقیق اور مشکل ہے اسی واسطے سخن وران کامل مجھے سہل لکھنے کی
فرمائش کرتے ہیں مگر میں اُنسے کیا کہوں چونکہ مصرع کے کئی معنے ہیں ایک یہ ہے کہ اگر میں
مشکل شعر کہتا ہوں تو تو وہ مشکل ہے ہی اور اگر آساں بھی کہتا ہوں تو وہ بھی
مشکل ہے ۔

دوسرے یہ کہ اپنا طریقہ بدل دوں تو مشکل نہ لکھوں تو مشکل ۔ یا اُن لوگوں کو اسکا کوئی جواب
دوں تو مصیبت نہ دوں تو مصیبت غرض ۔

ع دردگو نہ رنج و عذاب است جان مجنوں را ۔ بلائے فرقت لیلے و صحبت لیلے ۔

بھیجی ہے جو مجھکو شاہ جمجاہ نے دال ۔ ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ۔ ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

مجھکو جو بادشاہ نے یہ دال بھیجی ہے یہ عنایات شاہنشاہی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ دال بیشک ایسے
دال بلاشبہ دین و دانش داد دولت کی دال ہے اور یہ چاروں چیزیں اچھی ہیں۔ اور بھی معنی ہو
لطیف اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی بادشاہ نے ان سب سے کام لیکر مجھکو یہ بھیجی ہے۔ ان ہو
مولانا نظم چوتھے مصرعہ کو بے معنی کہتے ہیں سبحان اللہ۔

ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم آثار جلالی و جمالی باہم

ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم ہے اب کے شب قدر و دوالی باہم

ہمارے بادشاہ میں صفات جلال یعنی غضب و جمال یعنی رحم دونوں جمع ہیں۔ اس سے
عالی اور سفل کیوں نہ خوش ہوں کہ دوالی اور شب قدر دونوں ملی جلی ہیں۔ واضح ہو کہ چونکہ
مصنف نے جلالی اور جمالی کا ذکر پہلے کیا ہے اسیواسطے دوالی اور شب قدر اور سفل و اعلیٰ کا
ہیں کیونکہ شب قدر میں وظائف علوی۔ اور دوالی میں سفلی منتر جنتر پڑھے جاتے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ ہمارا بادشاہ ہر فرقہ کے لئے اچھا ہے۔

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے تا شاہ شیوع دانش و داد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گانٹھ ہے صفر کہ افزایش اعداد کرے

خدا بادشاہ کو قائم اور اسکی بقا سے خلق کو آباد رکھے کہ اگر وہ ہونگے تو دانش و داد کرینگے
یہ سالگرہ کے موقع پر جو رشتہ عمر میں گرہ دیگئی ہے گرہ نہیں ہے بلکہ صفر ہے کہ اعداد کو زیادہ
کرتا ہے جیسے ایک کو ۱۰ دس کو سو اور سو کو ہزار۔

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا

ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

یعنی رشتہ عمر میں لاکھ تار ہوں بلکہ اس سے کچھ زیادہ اور پھر اتنے ہی برس گنے جائیں

زیادہ کی نہیں۔

نور[illegible] ہیں یہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہو سلام — اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

بادشاہوں کے سامنے رخسار و نیز ہاتھ لیجا کر کان تک لیجاتے اور دوسرے شخص کو اصطلاح
[illegible] سلام کرتے ہیں۔ گویا اس سے سلام کرنا مقصود نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کیونکہ
کسی واقعہ سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں تو کانوں نیز ہاتھ رکھتے ہیں۔

رباعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال — ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آ پہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم — اے عمر گذشتہ اک قدم استقبال

یعنی بچپن کا زمانہ گزرنے کے بعد جوانی آئی اور اب مرنے کے دن قریب آ گئے۔ جوانی پر
[illegible] سبزہ آغازی وغیرہ کیوجہ سے اسے سواد اقلیم عدم کہا گیا۔ یعنی اس صورت میں سواد
[illegible] عدم میں آ گئے اے عمر گذشتہ تو عدم میں ہے اب تو ایک قدم ہمارے استقبال کیلئے چلی آ۔

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا — کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک — ہر قطرۂ اشک دیدۂ پر نم تھا

رات کو مجھے اوسکی زلف اور اسکے رخ عرق فشاں کا غم تھا اور اس حالت کو بیان نہیں
کر سکتا کیونکہ عجیب میری کیفیت تھی۔ ہزار آنکھ سے اسی خیال میں صبح تک روتا رہا۔ اور
زلف و رخ کے خیال کیوجہ سے سیاہی اور سپیدی ملکر میرا ہر قطرۂ اشک چشم پر نم
بن گیا تھا خوب رباعی کہی ہے۔

آتشبازی ہے جیسے شغل اطفال ہے سوز جگر کا بھی اسیطور سے حال

تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

جیسے آتشبازی کا تماشہ ہوتا ہے ایسے ہی سوز دل کا حال ہے موجد عشق عجب آدمی تھا۔ ان کمسن معشوقوں کے لیے کیا کھیل نکال گیا ہے یعنی یہ لوگ اس کو آتشبازی کا کھیل سمجھے

دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی بیتابی رشک و حسرت دید سہی

ہم اور فسردن اے تجلی افسوس تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

پہلے ہم جان و دل رکھتے تھے اسوقت درد بیتابی رشک حسرت دید سبھی کو برداشت مگر اب ہم چونکہ ہمارے پاس جان و دل نہیں ہیں فسردہ ہو گئے ہیں۔ اے تجلی حسن تو ہماری اس فسردگی کو دیکھتی ہے۔ ہم مکرر آپ کی سوز و گداز کی تمنا کرتے ہیں اگر تو تکرار کو نہیں کرتی تو پھر ہم میں جان و دل پیدا کر اور نئے سرے سے ہمیں پھونک دے جان درد یعنی جس جان کی تمہید درد سے ہوئی تھی۔ اس ترکیب نے رباعی کو مشکل بنا دیا ہے

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے

یعنی ہر بار صورت باد ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

تمام خلق حسد قماش ہے یعنی آمادۂ حسد ہے اور لڑنے کے لیے تیار ہے اور وحشت کدہ کی اس لڑائی کے تلاش ہی گویا پتنگ ہیں جب ملتے ہیں تو لڑنے ہی کے لئے ملتے ہیں

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

رس میں ہر صدی کے بعد گرہ دنیا فرض کیا جائے اور ایسی گرہیں ہزار گرہیں ہوں بلکہ اور
تنے بجائے زیادہ ۔ گویا بادشاہ خواجہ خضر کی عمر کو پہونچیں ۔

ہوتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں   عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں

ہات کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا   کیونکر مانوں کہ اسمیں تلوار نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے مردم آزاری چھوڑ دی اور وہ عشاق پر رحم کرنے لگا مگر
ظلم سے اُسنے ہاتھ روکا ہے اُسمیں تلوار ہونا ضروری ہے کیونکہ ظلم کر رہا تھا تو اسمیں
رہی ہوگی اور گو روک لیا ہے مگر اسمیں تلوار کا ہونا لازم ہے ۔ مطلب یہ کہ اسکی ستم شعاری کی تصویر اب بھی نظر میں ہے ۔

اگرچہ بنے سلام کرنے والے   کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے

تے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ   وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

ہم اگرچہ میعاد داروں کی طرح سلام کرتے ہیں مگر جن لوگوں کے ہاتھ میں کام کرنا ہے
ہی جو کام کر سکتے ہیں وہ دیر کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ خدا سے دعا کرو اور خدا سے التجا کرو
اللہ اللہ وہ گویا خدائی کرتے ہیں ۔ کیونکہ صبح و شام کرنا خدا کا کام ہے ۔ اور وہ بھی ٹالتے
ل میں صبح و شام کرتے ہیں ۔ گویا یہ کہتے ہیں کہ خدا سے تو اون کا کچھ اور ہی مقصد ہے

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں   آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن   خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

کھانے اور سونے اور آرام کے اسباب مجھے نہیں ملتے ورنہ روزہ کو فرض میں بھی سمجھتا ہوں
اگر یہ سامان ملیں تو پھر عمل بھی کروں ۔

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے   بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے

ان کو دیویں گے ہم دعائیں سو بار   فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بادشاہ نے جو تسبیح کے بیج خاصہ میں مجھکو بھیجے ہیں ان کی حقیقت کو کوئی کیا جانے
فیروزہ کی تسبیح کے دانے ہیں کہ جسے ہم پڑھ ہیں اور بادشاہ جم جاہ کو دعائیں دیں۔

دبیر الملک نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں غالب

منصور فرقۂ علی اللہیاں منم
آوازۂ انا اسد اللہ برافگنم

سنہ ۱۷۹۶ء دنیا کے یادگار سنین میں سے ہے جسمیں کاشانۂ ادب اردو میں ایک شمع
روشن ہوئی جسکے بجھ جانے پر بھی آج زمانہ میں ویسی ہی روشنی پھیلی ہوئی ہے جیسے
حیات تک تھی یعنی یہی وہ سن تھا جسمیں فخر اساتذہ متقدمین و متاخرین مرزا اسد اللہ خاں
مرحوم نے عرصۂ ہستی میں قدم رکھا۔
مرزا مرحوم کا سلسلہ نسب افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے شاہ عالم کے عہد میں
مرحوم کے دادا نے اپنے وطن مالوفہ کو ہمیشہ کے لیئے خیرباد کہکر دار السلطنت دہلی کو اپنے
قدوم میمنت لزوم سے عزت بخشی اور عرصہ تک مسند عزت و اقبال پر جلوہ گر رہے
تھے وہ کروٹ بدلی کہ دلی دلی نہ رہی چند ہی روز میں نہ عزت دینے والے رہے نہ پانے
مرزا مرحوم کے پدر بزرگوار عبد اللہ خاں نے بھی وطن عزیز کو چھوڑ کر نواب آصف الدولہ
بہادر شاہ اودھ کے دربار میں لکھنؤ پہونچے مگر زمانہ بر سر جنگ تھا یہاں بھی قدم
نواب نظام علیخان بہادر حیدر آبادی کی ملازمت کی۔ مگر وہی آسمان سر پر تھا یہاں
ذرہ ذرہ بھی دشمنی پر آمادہ ہو گیا آخر راجہ بختاور سنگھ والی الور کے یہاں پہونچے اور
الور ہی میں پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔
مرزا غالب اب ایک یتیم بچہ کی طرح اپنے چچا نصر اللہ بیگ صوبہ دار اکبر آباد کے
سایہ پدر حق پاتے رہے زمانہ کی دو رنگی سے پھر ایک رنگ دکھایا مرزا کے سر سے
چچا کا سایۂ عاطفت اٹھ گیا اسپر بھی اگرچہ ورا ثتا مرزا کو سب کچھ ملا مگر انکی تقدیر